شمارہ نمبر 119

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

* * *

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 119، جنوری تا مارچ 2019

نگران : **سید جنید اخلاق**
مدیر منتظم : **ڈاکٹر راشد حمید**

مدیر : **اختر رضا سلیمی**

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم
ڈاکٹر اقبال آفاقی
محمد حمید شاہد
ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلّے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ -/100 روپے (اندرون ملک)　　40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ 4 شماروں کے لیے -/400 روپے (اندرون ملک)　160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے۔

طباعت:	علی یاسر	051-9269712
سرکولیشن:	میر نواز سولنگی	051-9269708
تزئین و آرائش:	سجاد احمد / عابد محمود	

مطبع:　NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
رابطہ: 051-9269714
Email: ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

یہ غار اور مدینہ کی سمت جلتا چراغ (عقیدت)

مسعود صدیقی	میں یوں تڑپتا ہوں ہر لحہ حاضری کے لیے	9
ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	لطفِ عمیم ہو گیا، رحمتِ عام کے سبب	10

تُو نے افسانے لکھے میں نے غزل خوانی کی (غزلیں)

ظفر اقبال	اب کیا چھپائیں، آپ سے کیا گیا ہے جھوٹ موٹ	11
صابر ظفر	آگے چل سکتا تو لگ سکتے تھے پھیرے آگے	12
انجم خلیق	میں تنہا جب یہاں بھیجا گیا تھا	13
مجتبیٰ حیدر شیرازی	کہانی مرکزی کردار سے اُکتا گئی ہے	14
محبوب ظفر	ایسا نہ ہوا کہ میرا اثاثہ بگاڑ دے	15
محمد آصف مرزا	یوں تصور سے ترے سلسلہ جُنبانی کی	16
مبین مرزا	چراغِ جاں ہواؤں میں جلانا چاہتے ہیں	17
ہارون الرشید	صدا گلی میں لگاتے ہوئے گذر گیا ہے	18
ارشد چہال	میں نے ایک چراغ جلا کر رکھا تھا	19
فرحت عباس، ڈاکٹر	عمرِ رواں کی ساری کہانی ہوئی تمام	20
راحت سرحدی	تمام عمر یہ آنکھیں لہو لہو کر کے	21
رحمان حفیظ	ہوتا نہیں اس کرب کی ساعت کا بیاں بھی	22
شاہد ذکی	سیلاب سچ ہے اور در و دیوار خواب ہیں	23
اسد رحمان	ہمت نہ تھی کہ دستِ ستم گار کھینچتا	24
ارشد اقبال	کیا کہوں تم سے کہ کیا موجود ہے	25
عماد اظہر	یہاں کے بعد وہاں بھی قیام ہونا تھا	26
علی یاسر	ثبوتِ عشق، جمالِ یقیں محبت ہے	27
ناصر نسیم، کرنل	ایک ہی موسم مری آنکھوں میں تھا	28
منیر فیاض	غرض کچھ اور نہیں تیرے خاک داں سے مجھے	29

طالب حسین	الہام صورت پا کے کاذانوں تک آ گیا	30
اسد بیگ	تُو نے کتنا مرا خیال کیا	31
نعمان فاروق	کیا سوچ کے خوشبو نے ہے دامن کو چھڑایا	32
الطاف حسین شاکر	ہے زمیں مجھ سے خفا اور آسماں میرے خلاف	33
عزیز نبیل	کوئی فریاد مجھے توڑ کے سن سے نکلی	34
محمد اجمل سروش	خوابوں میں ڈھلی حقیقتوں کا	35
سائل نظامی	پُرانے لفظ برت کر نئے بناؤں گا	36
ارسلان ساحل	تیری بخشی ہوئی الفت کو میں یوں بانٹتا ہوں	37
عون رضا	پیام دشت کے پروردگار لائے ہیں	38

دیکھو تو مرے لفظ کی تہ میں مرا غم ہے (نظمیں)

حلیم قریشی	یہ دن	39
محمود احمد قاضی	دل کا ترازو	40
عزیز اعجاز	کسی دور افتادہ قصبے کا ریلوے سٹیشن	41
نجیبہ عارف، ڈاکٹر	ایک دن	43
اقتدار جاوید	سرخ مینار پر نصب	44
فرخ یار	کاریز	46
محسن شکیل	بوریت	49
ادل سومرو، ڈاکٹر	کتابوں کا میلہ	50
ادریس بابر	عشرہ	51
ناہید قمر	خدایا ترے اس جہانِ بلا میں	52
سلطان کھاروی	ماہیے	53
عمران ازفر	آج وہاں پر کوئی نہیں ہے!	54
اظہر عباس	کیریکٹر	55
ذاکر رحمان	خودکشی	56
شاہین	دردِ شب تنہیاں	57
تسنیم کوثر	مہرِ خاموشی	58

کوئی کہانی بھی مرنے نہ دوں گا جیتے جی (افسانے)

محمود احمد قاضی	کُندن	59

سعید ملک معلوم کا دکھ 65
عاطف علیم ایک ناگزیر بلاوے کی روداد 68
افضل مرآد دُزدیدہ 85
فرخ ندیم ایک فٹ کا فاصلہ 90
محمد عباس سفر کا ستارہ 98
منیر احمد فردوس ہارے ہوئے میچ کی جیت 116
احمد حسن رانجھا، ڈاکٹر خودکشی 121
عطاءالرحمٰن خاکی سنہرا پرندہ 126
محمد حنیف بیگ لکیر 130
سید کامی شاہ عشا 134
وقار احمد ملک سکیسر کی بتیاں 142
صوفیہ راحیل کیکر کے دو پیڑ 148
اعظم سید گونج 150

کہانی مرکزی کردار سے اُکتا گئی ہے (ناول/ڈراما/سفرنامہ)

فرخندہ شمیم زہر اور تریاق 153
رفاقت حیات گُل محمد گُل فوڑا 158

خاکہ/یادداشتیں

خواجہ رضی حیدر عدم وجود کی تلاش 169
ادل سومرو، ڈاکٹر آپ کی ٹرین کسی وقت بھی آ سکتی ہے 172
محمد عارف ضیاءالعلوم 180

جاگیرِ فن سنبھال کے رکھی تو ہے ظفر (عالمی زبانوں سے تراجم)

ارون کمار جین/تنویر غلام حسین پتھریلی حقیقت 185
رائے بریڈبری/حمزہ حسن شیخ دنیا کی آخری رات 192
کیٹ شوپن/سعدیہ فیض پچھتاوا 198
سامیہ اتوت/محمد محمود رکاوٹوں کے درمیان 202
ایملی ڈکنسن/ساجد ورک غیر اہم 205
امرتا پریتم/اختر رضا سلیمی ایک خلا 206

لگتا ہے کوئی بات عجب کرنی ہے اُس نے (پاکستانی زبانوں کا ادب)

(مضامین)

اللہ داد بوھیو، ڈاکٹر محمد رفیق مغیری ادب اور نفسیات (سندھی) 207
غلام سرور رانا گوجری مرثیہ: ایک جائزہ (گوجری) 214
ذوالفقار علی دانش، ڈاکٹر تصوف اور ادب کا باہمی تعلق (اردو) 222
انصار احمد شیخ، ڈاکٹر فورٹ ولیم کالج کی علمی و ادبی خدمات (اردو) 236
احمد سلیم سلیمی جدید شنا شاعری، گائیکی اور شنا کی مفلسی (شنا) 242

نکال دیتی ہے ہر شام داستاں سے مجھے (پاکستانی زبانوں سے تراجم)

(افسانے)

منیر احمد بادینی/واحد بخش بزدار، ڈاکٹر عجیب ترین سوال (بلوچی) 249
زاہدہ رئیس راجی/وحید عامر Hunm...... (بلوچی) 254
فاروق سرور/فاروق سرور مجرم (پشتو) 257
نصیر احمد/اعظم ملک آہ۔۔۔میرے معافی (پنجابی) 267
ملک مہر علی/قمر زمان ڈھیریاں (پنجابی) 271
شیراز طاہر/شیراز طاہر فالج زدہ لفظوں کی کہانی (پوٹھوہاری) 273
حفیظ گیلانی/مین الٰہی میمن ابہ (سرائیکی) 276
انور ابڑو/نگر چنا ضمیر فروخت کے لیے حاضر ہے! (سندھی) 278
قمر شہباز/جہانگیر عباسی کب تک کالی رات (سندھی) 282
غلام حسن بٹ/غلام حسن بٹ سپرِ خدا (کشمیری) 289

(شاعری)

وحید زہیر/عبدالمطلب وہ کیا جانیں! (براہوئی) 291
منیر مومن/رضوان فاخر نظم (بلوچی) 292
اسد ملک/محمد مشتاق آثم الماری میں۔۔۔۔ (پنجابی) 293
اسد اشلوک/محمد عتیق احمد سفید کوا۔۔۔۔ (سرائیکی) 294
شیخ ایاز/انور ندیم علوی کیوں دل کو چھوتا کرتا ہے۔۔۔۔ (سندھی) 295
امتیاز الحق امتیاز/امتیاز الحق امتیاز وارننگ (ہندکو) 296

☆ ☆ ☆ ☆

اداریہ

ادبیات کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔

ادبیات کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ایسا ادب پیش کرے جو پاکستانی قوم اور معاشرے کی اجتماعی سوچ کا آئینہ دار ہو۔

موجودہ شمارے میں جہاں ہم نے مختلف اصنافِ سخن کے ممتاز لکھنے والوں سے خصوصی نگارشات حاصل کی ہیں وہاں ہم نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی بھی نمائندگی ہو۔ چنانچہ آپ کو زیرِ نظر شمارے میں نہ صرف اصناف کا تنوع نظر آئے گا بلکہ تخلیق کاروں میں بھی کئی ایسے نام نظر آئیں گے جو آپ کے لیے نئے ہوں گے۔

حسبِ روایت موجودہ شمارے میں بھی جہاں حمد، نعت، غزلیں، افسانے، ناول کے ابواب، مضامین اور دیگر اردو اصناف شامل ہیں: وہاں دیگر پاکستانی زبانوں: براہوی، بلوچی، پشتو، پوٹھوہاری، پنجابی، سرائیکی، سندھی، کشمیری، شنا، گوجری اور ہندکو کے ممتاز لکھنے والوں کی نگارشات کے ترجمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں بین الاقوامی زبانوں سے تراجم بھی اس شمارے کا حصہ ہیں۔

امید ہے حسب سابق آپ کو یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی رائے انتظار رہے گا۔

سید جنید اخلاق
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

مسعود صدیقی

میں یوں تڑپتا ہوں ہر لمحہ حاضری کے لیے
کہ زندگی ہو مری جیسے آپؐ ہی کے لیے
یہ سوچ کر کہ ہوں نعلین میرے سر کو عطا
غلام بن کے میں حاضر ہوں نوکری کے لیے
ثنائے خواجہؐ تھی درکار میرے کاسے کو
میں کوئے شعر میں پہنچا گداگری کے لیے
خُدا کے بعد محمدؐ وہ لفظ ہے جس کو
ہے بے حساب لکھا میں نے خُوشخطی کے لیے
اسی سے زندگی پائی ہے زندگانی نے
کہ انتظار کیا چودھویں صدی کے لیے
میں نعت لکھتا ہوں آقاؐ کی اور سب الفاظ
دعائیں کرتے ہیں میری سلامتی کے لیے
ہُوا جو ایک اشارے سے چاند دو پارہ
جُدا تو ایک کرشمہ تھا چاندنی کے لیے
ہے دل کے غار میں بستی حضورؐ کی خوشبو
جو کام آتی ہے سانسوں کی تازگی کے لیے
درِ حضورؐ پہ چودہ طبق ہوئے روشن
کرم ہُوا ہے یہ مسعودؔ آگہی کے لیے

☆☆☆☆

لطفِ عمیم ہو گیا، رحمتِ عام کے سبب
بزمِ جہاں ہے نور نور، ماہِ تمام کے سبب

شرک کی سانس اُکھڑ گئی، کفر کا دم نکل گیا
تیرے پیام کے طفیل، تیرے نظام کے سبب

تُجھ سے ہوا جو منتسب، اُس کا نصیب جاگ اُٹھا
خاکِ عرب ہے سر بلند، تیرے قیام کے سبب

خلق کو راستہ ملا، تیرے عمل کے حسن سے
رازِ حیات منکشف، تیرے کلام کے سبب

ہونٹوں پہ دل کشی رہے، دل کی کلی کھلی رہے
گاہے درود کے سبب، گاہے سلام کے سبب

بے کس و بے مقام بھی، اُن کے طفیل باشرف
صنفِ لطیف معتبر، فخرِ انام کے سبب

کُچھ بھی نہیں ہے زادِ حشر، خالی ہے کاسۂ عمل
پھر بھی یقیں نجات کا، ہاں! ترے نام کے سبب

☆☆☆☆

ظفراقبال

اب کیا چھپائیں، آپ سے کیا کیا ہے جھوٹ مُوٹ
بس دیکھتے ہی جائیں، تماشا ہے جھوٹ مُوٹ
ہے حالِ دل مِلا جُلا، اب کیا بتایئے
کتنا ہے اس میں اصل تو کتنا ہے جھوٹ مُوٹ
حاصل وصول کچھ بھی نہیں ہے جو آج تک
یہ رابطہ ہمارا تمھارا ہے جھوٹ مُوٹ
سارے ہی اپنی اپنی اداکاریوں میں ہیں
صدمہ ہے جھوٹ مُوٹ، دلاسا ہے جھوٹ مُوٹ
غالبؔ کی طرح جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
یعنی یقین کیجیے، سچا ہے جھوٹ مُوٹ
کچھ ہم کو پیش کرنے کا موقع تو دیجیے
سچ اپنا بھُول جائیں گے، ایسا ہے جھوٹ مُوٹ
اپنا تو واسطہ ہے اُسی سے پڑا ہُوا
عُقبیٰ تو آپ جانیے، دُنیا ہے جھوٹ مُوٹ
جاری ہیں سارے کام اُسی طرح سے تو پھر
بخشش کہاں سے ہوگی کہ توبہ ہے جھوٹ مُوٹ
یہ کاروبارِ سلطنتِ خواب ہے ظفرؔ
فرضی ہے بادشاہ، رعایا ہے جھوٹ مُوٹ

☆☆☆☆

آگے چل سکتا تو لگ سکتے تھے پھیرے آگے
سر اُٹھاتی نہیں مٹی مِری، تیرے آگے

پیچھے رہ جائیں گے وہ، آگے نکل جاؤں گا مَیں
آنے والے جو شب و روز ہیں میرے آگے

ان خرابوں میں کسی یاد کو رو لوں تو چلوں
منتظر ہیں مِری خلوت کے، بسیرے آگے

اُن کی فطرت میں بھٹکنا ہی لکھا ہے شاید
لوگ رکھتے ہیں جو خود اپنے اندھیرے آگے

پھر بھی آگے کوئی گلزار لیے چلتا ہوں
رات دن وحشی ہوا پھول بکھیرے آگے

جانے والوں نے بسا رکھی ہے دنیا اپنی
دیکھو لہراتے ہیں خوش رنگ پھریرے آگے

مَیں اُدھر جا نہیں پاتا ہوں مگر دیکھتا ہوں
مچھلیاں آگے، ندی آگے، مچھیرے آگے

تجھے جانا ہے کدھر، فیصلہ کر لے یہ ظفرؔ
شب پسِ شب ہے، سویروں سے سویرے آگے

انجم خلیق

میں تنہا جب یہاں بھیجا گیا تھا
تجھی کو ڈھونڈتا پایا گیا تھا
بچ جاتا جو مڑ کر دیکھ لیتا
صدا سُن کر ہی میں پتھرا گیا تھا
چلو ہم بھی کسی کام آگئے ہیں
نہ ہوتے ہم، تو یہ صحرا گیا تھا
ہٹانا پڑ گیا اپنا ستارہ
یہ میرے راستے میں آ گیا تھا
مرے پیچھے تھا سورج، سامنے تم
تو، سورج کی طرف سایہ گیا تھا
ملائک کا وہ خدشہ کیا غلط ہے!
ازل میں جس کو جھٹلایا گیا تھا
اب اس کے بعد کا دریا سے پوچھو
کنارے تک تو یہ رستہ گیا تھا
وہاں بھی جان کے لالے پڑے ہیں
جہاں میں جان دے کر آ گیا تھا
وہ بستی آئینہ خانہ تھی انجم
میں اب سمجھا، کہاں بھیجا گیا تھا

☆☆☆☆

مجتبیٰ حیدر شیرازی

کہانی مرکزی کردار سے اُکتا گئی ہے
غرورِ جبہ و دستار سے اُکتا گئی ہے

محبت لامکاں حیرت نوردی ہے مسلسل
یہ بنجارن در و دیوار سے اُکتا گئی ہے

طلب امکان کی رہداریوں میں گھومتی ہے
بھلا کیسے کہے سرکار سے اُکتا گئی ہے

تجسس کی بلا خیزی قلم سے پوچھتی ہے
عبارت کیا تری رفتار سے اُکتا گئی ہے

کوئی حیرت کشائی کا بہانہ بندہ پرور
طبیعت ہے کہ اب اسرار سے اُکتا گئی ہے

سو اب عرضِ تمنا سے کنارہ کر لیا ہے
سخن فرمائی اس تکرار سے اُکتا گئی ہے

☆☆☆☆

محبوب ظفر

ایسا نہ ہوا کہ میرا اثاثہ بگاڑ دے
نقش و نگارِ شہر کو دریا بگاڑ دے

کس کام کے ہیں گھر کے ہوادان و بام و در
معمار گر مکان کا نقشہ بگاڑ دے

آوارگیِ عشق کا مارا ہوا ہوں میں
جیسے کسی رئیس کو پیسہ بگاڑ دے

چہروں پہ مفلسی کے نقوش اس طرح ہیں ثبت
سیلاب جیسے گاؤں کا نقشہ بگاڑ دے

جاگیرِ فن سنبھال کے رکھی تو ہے ظفرؔ
ممکن ہے کل اسے مرا بیٹا بگاڑ دے

☆☆☆☆

محمد آصف مرزا

یوں تصور سے ترے سلسلہ جُنبانی کی
زخم کو یاد رکھا، درد کی مہمانی کی

اپنے ہاتھوں سے کیا اپنے ہی گھر کو مسمار
داد تو دے کوئی اس بے سروسامانی کی

بہہ رہا ہے کوئی دریا مرے اندر شاید
یا کہیں دُور سے آتی ہے صدا پانی کی

جی میں آتا ہے کہ اقرارِ محبت کر لوں
یہی تدبیر نظر آتی ہے آسانی کی

زندہ رہنے کا ہمیں کچھ تو بھرم رکھنا تھا
تُو نے افسانے لکھے، میں نے غزل خوانی کی

یوں بھی گزرے کئی بے نام زمانے مجھ پر
دن کو بسرام کیا رات کو دربانی کی

کس طرح شکر بجا لاؤں ترا ربِ جمیل
حُسن کی خود کو، مجھے عشق کی ارزانی کی

مبین مرزا

چراغِ جاں ہواؤں میں جلانا چاہتے ہیں
ہم اے عمرِ رواں اپنا زمانہ چاہتے ہیں

یہی بستی موافق جو نہیں آتی کسی کو
یہیں اپنا ہنر ہم آزمانا چاہتے ہیں

نئی یہ رونقیں ہیں سب بہت دل کش ، مگر ہم
وہی چہرے وہی نقشہ پرانا چاہتے ہیں

وہ جس کے سامنے پہلے چھلک اُٹھتی تھیں آنکھیں
اُسی کے رُو بہ رُو اب مسکرانا چاہتے ہیں

گزر سکتے ہیں باقی عمر کے دن در بہ در بھی
مگر اے زندگی — اب ہم ٹھکانا چاہتے ہیں

یہ شہرِ جاں اک آسیبی اثر میں سو رہا ہے
اسے ہم اسمِ اعظم سے جگانا چاہتے ہیں

ہمیں پہچان لیں اہلِ قبیلہ اس لیے اب
کرشمہ ، معجزہ کوئی دکھانا چاہتے ہیں

☆☆☆☆

ہارون الرشید

صدا گلی میں لگاتے ہوئے گذر گیا ہے
فقیر سب کو رلاتے ہوئے گذر گیا ہے

سفر میں ساتھ ترے وقت جو گذارنا تھا
وہ سارا خاک اڑاتے ہوئے گذر گیا ہے

نہ جانے کون سخی آگیا تھا بستی میں
دیے گھروں میں جلاتے ہوئے گذر گیا ہے

عدو ملا تھا اچانک ہی آج رستے میں
وہ ہنس کے پھول تھماتے ہوئے گذر گیا ہے

ہوئی ہے شام مگر بھیڑ میں کھڑا ہوں ابھی
وہ کب کا ہاتھ ہلاتے ہوئے گذر گیا ہے

وہ دور کیا تھا کسی کو بتا نہیں سکتا
یہاں جو رنج اٹھاتے ہوئے گذر گیا ہے

میں اس کے سحر سے اب تک نکل نہیں پایا
جو ایک قصہ سناتے ہوئے گذر گیا ہے

☆☆☆☆

ارشد چہال

میں نے ایک چراغ جلاکر رکھا تھا
پروانہ جب رستہ بھولنے والا تھا

وادی کی ہر بستی جھیل میں ڈوبی تھی
بہتے ہوئے دریا کو کس نے روکا تھا

ایک عجیب گھٹن تھی میری سانسوں میں
پنجرے میں چڑیا کو جب سے رکھا تھا

دھیرے دھیرے اس کی صورت یاد آئی
ٹکڑوں سے تصویر کو جیسے جوڑا تھا

کھلی کتاب تو سوکھا سا اک پھول گرا
جیسے کوئی قیدی جیل سے چھوٹا تھا

شہروں میں یہ کیسا پانی پیتے ہیں
میرے گاؤں کا پانی کتنا میٹھا تھا

اپنے بھرم کی خاطر ارشدؔ ہم نے تو
خالی برتن کو بھی ڈھانپ کے رکھا تھا

☆☆☆☆

ڈاکٹرفرحت عباس

عمرِ رواں کی ساری کہانی ہوئی تمام
ہم پر گراں تھی جو وہ گرانی ہوئی تمام

کیا زلزلہ سا خواب میں آیا تھا ایک رات
دریائے زندگی کی روانی ہوئی تمام

لائی اجل غیاب سے خاکستری غذا
فاقہ زدوں کے دکھ کی کہانی ہوئی تمام

اشجار کیا جلے کہ پرندے بھی جل گئے
کچھ اس طرح سے نقل مکانی ہوئی تمام

حسرت کوئی حیات کی پوری نہ ہو سکی
ہم کیا کہیں کہ کیسے جوانی ہوئی تمام

☆☆☆☆

راحت سرحدی

تمام عمر یہ آنکھیں لہو لہو کر کے
کرن سے لایا ہوں سائے کو میں رفو کر کے

تو خود کو ایسی کوئی آسمانی شے نہ بنا
کہ تجھ سے بات بھی کرنی پڑے وضو کر کے

وہ غم تو صبح کو خورشید کی طرح نکلا
میں رات خوش تھا جسے غرق در سُبو کر کے

سنی سنائی پہ لشکر کشی سے بہتر تھا
تُو دیکھ لیتا اگر مجھ سے گفتگو کر کے

نہیں ہوں میں بھی کوئی کچی گولیاں کھیلا
جو کرنا چاہے مرا دیکھ لے عدو کر کے

نہ پُوچھ ڈھونے پڑے ہیں جو مجھ کو اندھیرے
کسی کے چاند سے چہرے کی آرزو کر کے

اس آسمان میں رستہ بھی ہے کوئی راحتؔ
کبھی یہ دیکھنا کوشش ضرور تُو کر کے

☆☆☆☆

ہوتا نہیں اس کرب کی ساعت کا بیاں بھی
ہونے پہ جو ہو جائے، نہ ہونے کا گماں بھی
دیتی ہی نہیں چین مجھے پارہ سرِشتی
ٹھہرا نظر آؤں تو میں ہوتا ہوں رواں بھی
دنیا ہو کہ فردوس، کوئی فرق نہیں ہے
ہونے کا یہ آزار، یہاں بھی ہے، وہاں بھی
دیکھو تو مرے لفظ کی تہہ میں مرا غم ہے
یہ قصۂ درویش عیاں بھی ہے، نہاں بھی
اُٹھ اُٹھ کے نہ یوں دیکھے کوئی موجِ پریشاں
باقی نہیں اب ڈوبنے والوں کا نشاں بھی
کردار نبھاتا ہوں میں کردار سے بڑھ کر
تحریر کنندہ بھی ہوں، پیغام رساں بھی
رہتی ہیں نگاہیں بھی مری مائلِ وسعت
کچھ پھیلتا جاتا ہے جہانِ گذراں بھی
تھمتے ہی نہیں اب کسی منزل پہ مرے پاؤں
آزار سے ہیں میرے لیے تاب و تواں بھی
کیفیتِ جاں چار مزاجوں کی ہے آمیخت
گرما بھی، بہاراں بھی، زمستاں بھی، خزاں بھی

سیلاب سچ ہے اور در و دیوار خواب ہیں
آنسو کے آگے ثابت و سیّار خواب ہیں
ہر مرنے والی آنکھ سے آواز آتی ہے
دو چار خواب ہیں ابھی دو چار خواب ہیں
جو عُمر جی رہا ہُوں مَیں اس عمر میں مجھے
تعبیر سے زیادہ مدّدگار خواب ہیں
یہ ٹھیک ہے کہ خواب خدا دیکھتا نہیں
لیکن خدا کے آئینہ بردار خواب ہیں
ہونی کو دیکھتا ہوں میں ہونے سے پیشتر
مجھ کو تو یوں بھی باعثِ آزار خواب ہیں
خوابوں کے ساتھ سمت بدلتا ہے آدمی
اس کشتیِ سفال کے پتوار خواب ہیں
ویران خاک داں مری ویران آنکھ ہے
مسمار بستیاں مرے مسمار خواب ہیں
وہ جسم ہے کہ کوئی طلسماتی اسم ہے
وہ خدّوخال ہیں کہ پُراسرار خواب ہیں
رونے سے رُل نہ جائیں زمانے پہ کھل نہ جائیں
یعنی ہمارے ضبط کا معیار خواب ہیں
شاہد نئے چراغ پُرانے مزار پر
سوئے ہُوئے وجُود کے بیدار خواب ہیں

☆☆☆☆

اسدرحمان

ہمت نہ تھی کہ دستِ ستم گار کھینچتا
سو چل پڑا تھا خود کو میں ناچار کھینچتا

کہنا پڑا کہ مجھ کو یہ منصب نہیں قبول
اب کیا کسی کے سر سے میں دستار کھینچتا

کچھ ادھ ادھورے دائرے سے ہم رکاب ہیں
میں چل رہا ہوں بیچ میں پرکار کھینچتا

اک مرحلے پہ رُک گیا تھا ہاتھ جنگ میں
اب خود پہ کس طرح سے میں تلوار کھینچتا

حق تو یہ تھا کہ جس کو بنایا ہے جانشیں
گھوڑے سے باندھ کر اُسے سردار کھینچتا

خانہ بدوش ہوں سو اک آواز پر تری
میں چل پڑوں گا ساتھ میں گھر بار کھینچتا

اب سانس رُک رہی ہے تو حیرت نہیں اسدؔ
آخر میں کتنی دیر یہ آزار کھینچتا

☆☆☆☆

ارشد اقبال

کیا کہوں تم سے کہ کیا موجود ہے
جس طرف دیکھوں ضیا موجود ہے
دوسرا اپنی جگہ کچھ بھی نہیں
ایک میں ہی دوسرا موجود ہے
ایک تو وہ ہے یہاں اور ایک میں
درمیاں اک تیسرا موجود ہے
سادگی سے ہم سمجھتے ہیں یہاں
جو مجسم ہو گیا، موجود ہے
اور ہی کچھ ہے یہاں موجودگی
جو بھی ہے موجود ناموجود ہے
وہ بھی ہے، جو ہے ورائے ہست و بود
یعنی وہ بھی ہے جو لاموجود ہے
میں بھٹکتا ہوں میان ہست و بود
ایک وہ ہے جو سدا موجود ہے
دوریوں میں ہے کوئی قربت نہاں
قربتوں میں فاصلہ موجود ہے
ہم سمجھتے ہیں خلا جس کو یہاں
اس کے اندر بھی خلا موجود ہے
آنکھ سے تو دیکھنا ممکن نہیں
''کیا نہیں موجود کیا موجود ہے''☆
آنکھ بھر کے دیکھیے پھر ہو نہ ہو
جو ابھی اچھا بھلا موجود ہے

☆ثروت حسین

یہاں کے بعد وہاں بھی قیام ہونا تھا
خدا کے ساتھ ہمارا کلام ہونا تھا

یہ غار اور مدینہ کی سمت جلتا چراغ
اک انتظار میں یہ اہتمام ہونا تھا

اور اس خرابے کی افسردگی بتاتی تھی
کہ اس خرابے نے اک دن تمام ہونا تھا

وہ بادشاہ تھا جو شخص مجھ سے پہلے تھا
میں آخری ہوں کہ جس نے غلام ہونا تھا

میں درمیان میں حائل ہوا وگرنہ یہاں
کسی فرشتہ نے عالی مقام ہونا تھا

☆☆☆☆

علی یاسر

ثبوتِ عشق، جمالِ یقیں محبت ہے
مری سرشت میں دھوکہ نہیں، محبت ہے

گلِ خلوص مہکتا ہے میری صورت میں
مرا مزاج، مری سرزمیں، محبت ہے

سب اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں یہاں
مرے خیال میں سب سے حسیں محبت ہے

میں اُس کے دل میں اتر کر تلاش کر بھی چکا
میں جانتا تھا یہیں پر کہیں محبت ہے

میں ظالموں کا طرف دار ہو نہیں سکتا
میں دیندار ہوں اور میرا دیں محبت ہے

نفس نفس ہے نمائندۂ نصابِ نفیس
سو کار ہائے جہاں، بہتریں محبت ہے

بکھیرتے ہیں گلاب و مہک، لب و گیسو
نظامِ عارض و چشم و جبیں محبت ہے

اُسے غرور یونہی تو نہیں علی یاسر
وہ میرا خواب، مری اولیں محبت ہے

کرنل باصرؔ نسیم

ایک ہی موسم مری آنکھوں میں تھا
زندگی بھر کا سفر خوابوں میں تھا
جب جلا دامن تو اندازہ ہوا
رات بھر میرا ہی گھر شعلوں میں تھا
اونچے پیڑوں کی جڑیں کمزور تھیں
یا بلا کا زور طوفانوں میں تھا
بے لباسی کی ہوا ایسی چلی
شوقِ عریانی گھنے پیڑوں میں تھا
کرب کا موسم مری تقدیر کیوں
اے خدا میں بھی ترے بندوں میں تھا
ہر دریچہ بند ہونٹوں کی طرح
کیسا سنّاٹا مرے شہروں میں تھا
جسم کی دیوار تو محفوظ تھی
میں پسِ دیوار کچھ خطروں میں تھا
زلزلوں سے کُھل گیا صیّاد پر
کل جو شورِ آگہی پنجروں میں تھا
باصرؔ اس کی آنکھ بھی نم تھی یہاں
جس کا رہنا سہنا ہی پھولوں میں تھا

☆☆☆☆

منیر فیاض

غرض کچھ اور نہیں تیرے خاک داں سے مجھے
کشید کرنا ہے اک خواب رائگاں سے مجھے

مَیں ایک چاند کے ہالے میں رقص کرتا تھا
بُلا رہے تھے ستارے یہاں وہاں سے مجھے

مٹا گئی ہے اداسی کی اولیں بارش
کہیں کہیں سے تجھے اور کہاں کہاں سے مجھے

مَیں رات بھر کی کہانی کا اجنبی کردار
نکال دیتی ہے ہر شام داستاں سے مجھے

تمام رنجِ معیشت کا ماجرا نہیں مَیں
سنا ہے تُو نے مرے دوست درمیاں سے مجھے

مری نظر میں نئی منزلیں بھی تھیں فیاض
گریز کرنا ہی تھا راہِ رفتگاں سے مجھے

☆☆☆☆

طالب حسین

الہام صوت پا کے اذانوں تک آ گیا
جتنا بھی دل کا شور تھا کانوں تک آ گیا

اُس پار جس قدر بھی غبارِ وجود تھا
پہلی نظر میں آئینہ خانوں تک آ گیا

ہر دستیاب زخم رہینِ ہنر کیا
پھر میں کتاب بن کے دکانوں تک آ گیا

مانا کہ میرے ہاتھ پہ دستک ادھار تھی
لیکن یہ کیا کہ خالی مکانوں تک آ گیا

کیا جانے جوئے خوں نکل آئے کہ جوئے شیر
تیشے میں آگ تھی سو چٹانوں تک آ گیا

کم قامتی کا دُکھ مجھے لایا صلیب تک
اترا صلیب سے تو زمانوں تک آ گیا

نا دیدنی طواف کی تائید کس سے لیں
پیرِ حرم کا خوف جوانوں تک آ گیا

ہوتی ہے بازگشت بھی کس اہتمام سے
چہرہ بجھا تو نام زبانوں تک آ گیا

اسد بیگ

تُو نے کتنا مرا خیال کیا
میرے زخموں کا اندمال کیا

میں تہی دست تھا مگر تُو نے
غم کی دولت سے مالا مال کیا

مسکرا کے دکھا دیا اُس نے
جب کبھی میں نے عرضِ حال کیا

کچھ تھکن دی ہے زندگی نے مجھے
تیری یادوں نے کچھ نڈھال کیا

ترے ملنے سے یہ ہُوا محسوس
اک سمندر سے اتصال کیا

جب سے دیکھا ہے سامنے تجھ کو
دل نے جینا مرا محال کیا

کیا اسدؔ زیرِ لب تبسم نے
تجھ سے پھر آج اک سوال کیا

☆☆☆☆

نعمان فاروق

کیا سوچ کے خوشبو نے ہے دامن کو چھڑایا
ہر پھول کے چہرے پہ اداسی کا ہے سایہ

کیا دیکھ کے اشجار کی آنکھوں سے لڑی دھوپ
کیا سوچ کے سورج نے پرندوں کو جگایا

لگتا ہے کوئی بات عجب کرنی ہے اس نے
دریا نے مجھے پیاس کی چوکھٹ پہ بلایا

گو جلوۂ جاناں کو فقط دُور سے دیکھا
ہاں دیس کی مٹی کو تو آنکھوں سے لگایا

نعمان کے مرقد پہ ملائک کا ہے ماتم
اور اس پہ خداوند کو ہنستے ہوئے پایا

☆☆☆☆

الطاف حسین شاکر

ہے زمیں مجھ سے خفا اور آسماں میرے خلاف
ہوگئے ہیں آج میرے راز داں میرے خلاف

بات حق کی میں یہاں کیسے کروں کیوں کر کروں
لے کے نکلے ہیں سبھی، تیغ و سناں میرے خلاف

عزم جب بھی پُھول راہوں پر سجانے کا کیا
زرد رستوں پر نظر آئی خزاں میرے خلاف

ہے عجب سے موڑ پر، پھر زندگی کا یہ سفر
منزلیں ریگِ رواں ہیں، سب نشاں میرے خلاف

کس طرح دوں میں بتاؤ، بے گناہی کا ثبوت
ہے مِرا منصف مخالف، ترجماں میرے خلاف

☆☆☆☆

عزیز نبیل

کوئی فریاد مجھے توڑ کے سن سے نکلی
یوں لگا جیسے مری روح بدن سے نکلی

عادتاً میں کسی احساس کے پیچھے لپکا
دفعتاً ایک غزل دشتِ سخن سے نکلی

ایک سائے کے تعاقب میں کوئی پرچھائیں
پیاس اوڑھے ہوئے صحرائے بدن سے نکلی

کس کا چہرہ تھا جو صدیوں کے بھنور سے ابھرا
کیسی وحشت تھی جو برسوں کی تھکن سے نکلی

رنگ کس کا تھا جو دستک سے نمودار ہوا
کس کی خوشبو تھی جو کمرے کی گھٹن سے نکلی

کچھ تو تھا ایسا کہ بنیاد سے ہجرت کر لی
خاک یوں ہی تو نہیں اپنے وطن سے نکلی

راکھ جمنے لگی جب رات کی آنکھوں میں نبیلؔ
نیند آہستہ سے بستر کی شکن سے نکلی

☆☆☆☆

محمد اجمل سروش

خوابوں میں ڈھلی حقیقتوں کا
آنکھوں میں لہو ہے خواہشوں کا
منزل کے قریب آ کے اکثر
ہوتا ہے ظہور حادثوں کا
محور سے مَیں دُور جا رہا ہوں
عالم ہے اُداس منظروں کا
راس آ ہی گیا مجھے تساہل
حل ڈھونڈ لیا ہے مشکلوں کا
روشن ہے سوادِ شب کا منظر
جلتا ہے چراغ رتجگوں کا
مشکیزۂ چشم بھر رہا ہوں
دینا ہے خراج قہقہوں کا
یک لخت بدل گئے مناظر
نقش نہ رہا وہ راستوں کا
مٹی میں مِلا جلالِ شاہی
اُڑتا ہے غبار مقبروں کا
بے ربط ہوا ہے نظمِ آہنگ
سہمے ہوئے دل کی دھڑکنوں کا

☆☆☆☆

سائل نظامی

پُرانے لفظ برت کر نئے بناؤں گا
جو بَن پڑا تو ہرے راستے بناؤں گا

میں اپنے سچ پہ تو قائم رہوں گا کم از کم
نبھا سکوں جو، وہی قاعدے بناؤں گا

کوئی کہانی بھی مرنے نہ دُوں گا جیتے جی
سو اپنے ہاتھ سے کچے گھڑے بناؤں گا

مَیں اپنے گھر کے بُجھے بام و دَر پہ پنسل سے
تری منڈیر کے جلتے دِیے بناؤں گا

تُو وار کر کے مری پشت پر، بڑا بنا ہے
مَیں اپنا نام ترے سامنے بناؤں گا

نہیں تھکے گا کبھی میری پاؤں کا چکر
مَیں کاغذوں پہ بہت دائرے بناؤں گا

یہ سارا منظرِ ہست ابتدا سے لکھا اگر
کئی خدا ہیں جو بالشتیے بناؤں گا

انا کے بُت ہیں، دُعا کے مجسمے بھی ہیں
مَیں پہلے توڑوں گا اور دوسرے بناؤں گا

ارسلان ساحل

تیری بخشی ہوئی الفت کو میں یوں بانٹتا ہوں
گویا اس دورِ اذیت میں سکوں بانٹتا ہوں

میں ہوں فرہاد نہ صحراؤں سے آیا ہوا قیس
ہاں مگر اہلِ تمنا میں جنوں بانٹتا ہوں

تو نے مانگا ہے تو دیتا ہوں محبت کا خراج
کس طرح تجھ کو میں انکار کروں؟ بانٹتا ہوں

وہ یزیدی ہیں جو پانی بھی نہ دیں پیاسوں کو
میں حسینی ہوں کہ صدقے میں بھی خوں بانٹتا ہوں

اذنِ رب سے ہی کوئی معجزہ ہوتا ہے مگر
لوگ کہتے ہیں کہ میں ان میں فسوں بانٹتا ہوں

ٹوٹ جاتا ہے اسی وقت اندھیرے کا طلسم
اپنے حصے کے چراغوں کو میں جوں بانٹتا ہوں

جب کہا میں نے کہ غم بانٹ لیا کر میرے
سخت لہجے میں مجھے کہنے لگا ''ہوں'' بانٹتا ہوں

☆☆☆☆

عون رضا

پیام دشت کے پروردگار لائے ہیں
سنو اسیرِ خزاں ہم بہار لائے ہیں

کہو تو زحمتِ سفر اور مختصر کر لیں
جو قافلے میں بدن کا غبار لائے ہیں

ہر ایک دل میں در آئی فراز کی خواہش
یہ خواب جب سے مجھے سوئے دار لائے ہیں

خدا ہے مدِّمقابل سو احتجاجاً لوگ
گھروں سے اب تری تصویر اتار لائے ہیں

جہاں نظر میں ترا غم بھی معتبر نہ رہا
مجھے وہاں بھی جنوں کے حصار لائے ہیں

اسے کہو نہ کرے مسترد خیالِ وصال
کہ ہم قضا سے یہ لمحے ادھار لائے ہیں

☆☆☆☆

حلیم قریشی

یہ دن

بڑے گمنام سے دن ہیں
نہ سورج کے نکلنے پر
کوئی جادو بکھرتا ہے
نہ اس روشن ستارے کے
اُترنے پر
کوئی تصویر بنتی ہے
درختوں پر
وہی پتے نمایاں ہیں
جنھیں پچھلی خزاں نے
پال رکھا تھا
شگوفوں پر
اُنہی رنگوں کا سایہ ہے
گزشتہ موسموں نے
جو کمایا ہے
پہاڑوں کی فلک آسا
چٹانوں سے
زمیں کی زرد مٹی تک
کسی برفاب موسم کی
حکومت ہے
پرندے پر سمیٹے
بے اماں شاخوں پر
بیٹھے ہیں
میں اپنے گھر کے آنگن میں
بہت مصروف
اور بے زار بیٹھا ہوں
بڑے ناکام سے دن ہیں
نہ سورج کے نکلنے پر
کوئی جادو بکھرتا ہے
نہ اس روشن ستارے کے
اُترنے پر
کوئی تصویر بنتی ہے

☆☆☆☆

محمود احمد قاضی

دل کا ترازو

جب میں کشتی میں بیٹھ کر
دریا پار کر رہا ہوتا ہوں
دلکی چال والے گھوڑے کی
سواری کر رہا ہوتا ہوں
بَن میں پھول رہی سرسوں کا
نظارہ کر رہا ہوتا ہوں
اپنی من چاہی مزے دار کتاب
پڑھ رہا ہوتا ہوں
اپنے بچوں اور ‘‘بلونگوں’’ کے ساتھ
کھیل رہا ہوتا ہوں
تو اس وقت میں
اس دنیا کے بھید بھاؤ
حساب کتاب
لین دین
جمع تفریق
نفع نقصان
سب کو
تج چکا ہوتا ہوں
تب میری خواہش ہوتی ہے
کوئی مجھے اپنے
مروّجہ ترازو میں نہ تولے
اگر تولے
تو اپنے دل کے ترازو میں تولے

☆☆☆☆

عزیز اعجاز

کسی دُور افتادہ قصبے کا ریلوے سٹیشن

مرا دل چاہتا ہے
جب ذرا موسم سہانا ہو
تو اک دن
دُور افتادہ کسی قصبے میں
اینٹوں سے بنے
برسوں پرانے
ریل کے ویران اسٹیشن پہ
برگد کے گھنے سائے تلے
اک بینچ پر بیٹھا
نہایت سست رفتاری سے
ڈھلتی ساعتوں کی تال پر
اُٹھکھیلیاں کرتی ہوئی
چنچل ہوا کا رقص دیکھوں اور
ماضی کے جھروکوں سے ذرا جھانکوں
میں تا حدِ نظر جاتی ہوئی پٹری پہ
آنے والی گاڑی کے مسافر کی
پذیرائی کو
اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کردوں
اسی عالم میں وہ گاڑی
نظر کے سامنے آ کر ٹھہر جائے
میں فرطِ شوق سے آگے بڑھوں
اور والہانہ
بھیڑ کے اندر تمھیں ڈھونڈوں
اچانک تم دکھائی دو
میں حیرت اور استعجاب سے
گُم سُم کھڑا رہ جاؤں
تم اپنی ادائے خاص سے
آہستہ آہستہ مری جانب بڑھو
اُس دم
تمھارا ریشمیں آنچل، کھلی زلفیں
فضا میں ایسے لہرائیں
ہوا کے دوش پر جیسے
کوئی آوارہ بدلی جھوم جاتی ہے
تمھارے عارض و رُخسار کو
گستاخ زلفوں کی لٹیں
جھک جھک کے بوسہ دیں

میں بُت بن کر
یہ دل آویز منظر دیکھتا رہ جاؤں
تم اپنے سراپا حشر ساماں
حُسن سے غافل
کچھ ایسے بے نیازانہ
مرے نزدیک سے ہو کر گزر جاؤ
کہ جیسے مجھ کو
پہچانا نہ ہو تم نے
مگر یک بارگی مڑ کر مجھے دیکھو
ابھی جیسے مجھے تم نے ہو پہچانا
اُسی تیزی سے تم آگے بڑھو
جس طرح دو بچھڑے ہوئے ساتھی
گلے ملنے کو اپنے ہاتھ پھیلائیں
مگر پھر تم
ہجومِ خلق کے ڈر سے
ٹھٹھک جاؤ ----
تمھارے دونوں ہاتھوں کو
میں بڑھ کر تھام لُوں
پھر ہم
ہجومِ خلق کو یکسر نظر انداز کر کے
پیار سے اک دوسرے کا ہاتھ تھامے
ریل کے ویران اسٹیشن کو
پیچھے چھوڑ آئیں
اور کسی انجان منزل کی طرف
چل دیں ----

☆☆☆☆

ڈاکٹر نجیبہ عارف

محبت مر بھی سکتی ہے

محبت مرنے لگتی ہے
تو سب سے پہلے دل کی منڈیروں سے
خوشی کے پرندے اُڑ جاتے ہیں
اور کانوں میں سناٹا چنگھاڑنے لگتا ہے
آنکھ کے کھیت سوکھ جاتے ہیں
اور اس میں چھوٹے چھوٹے تنکے چبھنے لگتے ہیں
دکھ کے دسترخوان سے
لذت کا ذائقہ اُٹھ جاتا ہے
نیند کا بستر بانجھ ہو جاتا ہے
دانتوں تلے ریت کچکچاتی ہے
ہونٹوں پر زہرخند کے سوا کچھ نہیں ٹھہرتا
آرزو کی دنیا
راکھ میں ڈوبے ہوئے شہر کے مانند
اپنے اندر ہی دفن ہو جاتی ہے
لیکن محبت کے مر جانے کے بعد بھی
آدمی زندہ رہ سکتا ہے

☆☆☆☆

اقتدار جاوید

سرخ مینار پر نصب

زمانے میں ہے اک گھڑی
آخری کھونٹ میں
سرخ مینار پر نصب
کوئی بھی اس سمت جاتا نہیں ہے
کئی راز ہیں اُس جگہ کے
مگر کوئی رازوں سے پردہ اٹھاتا نہیں ہے
زمانے کی آنکھوں سے اوجھل گھڑی
دائمی وقت پر اک گھڑی

جڑا ہوں
میں اُسی دائمی وقت سے
جو زمانے سے اوجھل کھڑے
سرخ مینار والی گھڑی پر کھڑا ہے
مگر کون جانے
گھڑی کون سے وقت پر
منجمد ہو گئی تھی
وہ کیسی پراسرار طاقت تھی
جو وقت آگے بڑھاتی تھی

اور
سوئیوں کی پراسرار ٹِک ٹِک
زمانوں میں رستے بناتی تھی
ماضی کو ماضی بھرے غار میں ڈالتی تھی
اجالوں میں لاتی تھی دن
چپ درختوں کے تاریک سائے میں
گُم صُم گھڑی
کچھ بتاتی نہیں ہے
وہ کیسی نگاہوں کو بھرتی ہوئی
صبحِ خنداں تھی
کیسی سیہ رات تھی
کس پہاڑی کے پیچھے
افق لال کرتی ہوئی شام اتری تھی
جب وہ گھڑی رک گئی تھی
کوئی تو بتائے
کوئی تو زمانے کے بوجھل، سیہ رنگ
پردے اٹھائے
ہوا کوئی آئے، اڑائے
مجھے لے کے جائے
درختوں کے پیچھے کھڑے
سرخ مینار کے پاس
کہنہ گھڑی سے مسلائے مراوقت

میں خود ہوں جو بچھڑا ہوا وقت سے
جا کے خود کو گھڑی سے ملاؤں
گھڑی بھر گھڑی کو میں دیکھوں
میں لے میں اترتے ہوئے
خود کو طاقت بھری سوئیوں سے ملاؤں
میں خود چل پڑوں
میں گھڑی کو چلاؤں !!!

☆☆☆☆

فرخ یار

کاریز

شاخِ زیتون پھولوں سے بھرتی نہیں!

اور میں اپنے والد
ابد کے چمکتے ہوئے چاند
سعد اللہ خاں سے ملاقات کو جتنا بے چین ہوں
اس سے آگے بہت دُور کی منزلوں پر
وہ باسٹھ برس کے شب و روز
سر پہ اٹھائے ہوئے
اپنے والد سے ملنے کی جلدی میں تھے

ایک تہوار پر
خودکلامی کے مابین
رشتوں کے پت جھڑ کو جاروب کرتے ہوئے
وہ بدلتی ہوئی زندگی کھینچتے کھینچتے
خال و خد کی لرزتی ہوئی بے قراری میں/خدشات کی دوڑتی بھاگتی
مال گاڑی سے ٹکرا گئے
مال گاڑی کے چاروں طرف
خون تھا خواب تھے

خون کی سرخیاں آسماں ہو گئیں
خواب امید کی لَو بڑھاتے رہے
اور وہ موسموں کے رواں پانیوں میں کھڑے مسکراتے رہے

اِن رواں پانیوں
زندگانی کے اثبات میں
میرے دادا کی آواز شامل رہی
ہَیا ہُو ہَیا ہُو
میرے دادا ملک لال خاں سرخ رُو
نیل گُوں وسعتوں میں دھڑکتی ہوئی صبح کے راز داں
مورنی کے پروں، دھڑکنوں سے نکلتی کہانی کے راوی
مگر جن کے لہجے میں لکنت کے آثار تھے

لال خاں سرخ رُو
جب تلک سانس کی مینڈھ اور تان قائم رہی
اپنے والد کی گت چھت سے
دو کوس کے فاصلے پر رہے
ایک تکرار میں اپنی دیوار پر
شاخ در شاخ پھولوں کو رنگین کرتے ہوئے
دوسری خانہ آبادی کی ساتویں رات تھی
جب انھیں ذوق آوارگی کے دروں

سانس کی ٹوٹتی پھوٹتی دھار میں
موت نے آلیا

موت سیلِ رواں
موت باغِ عدن
موت امید کا آخری آئنہ
موت نہروں کے پانی سے دھوئے گئے بال و پر کا فسوں
ایک ہنگامۂ ناروا عین بازار میں
کوئی نافے کی خوشبو ملاقات کے درمیاں
جس کی شدت میں آنکھوں کے حلقے
ستاروں کی جھل مل سے بھرتے چلے جاتے ہیں

موت تاریک گلیوں میں بجتا ہوا ساز
خوابوں کے اندر لرزتی ہوئی بے کلی
موت صبحِ ولایت کی پہلی خبر
وہ خبر جس کو مَیں تہہ بہ تہہ کھولتا جا رہا ہوں
مگر کچھ نہیں مل رہا
کچھ الگ مجھ سے ایسا نہیں ہو سکا جو سزاوار ہو
جس کو دہرانے کی آرزو میں رہوں

(طویل نظم کا کچھ حصہ)

☆☆☆☆

محسن شکیل

بوریت

خواب کے دستخط کیے تکیے
رات کے پاس ایک بستر پر
رکھ دیے اوڑھ کر تری چادر
آج کی شب مَیں پھر نہیں سویا!
صبح، چڑیوں کی گفتگو سے ہوئی
دوپہر کام کر کے تھک سی گئی
شام کافی کی تلخ چسکی میں
بوریت فلم سے منائی گئی
نظم نے حوصلہ بدن کو دیا
اور امید اک کہانی نے
چین پھر بھی کہیں نہ مل پایا!

☆☆☆☆

ڈاکٹر ادل سومرو

کتابوں کا میلہ

ہر اتوار کو صدر میں
پرانی کتابوں کا میلہ لگتا ہے
شاعر لوگ
ان کتابوں کو دیکھ کر
بہت خوش ہوتے ہیں
لیکن گھر والے اُن سے
خوش نہیں رہتے
کیوں کہ وہ کیک کے بجائے
کتابیں گھر لے جاتے ہیں
گھر میں جگہ نہ ہونے کے باوجود
وہ کتابیں خریدتے ہیں
ایک دن ان کی کتابیں بھی
فٹ پاتھ پر آجائیں گی
اور آنے والے شاعر لوگ
ان کو خریدیں گے
اور یہ سلسلہ
یوں ہی چلتا رہے گا
کباڑی کا چولہا جلتا رہے گا

ادریس بابر

عشرہ

موئن جو داڑو

میٹھے پانی شکست کھا چکے ہیں
بحرِ الہامِ شور کی آواز
دل سے اٹھتی ہے سر سے آتی ہے
دور اماوس میں تھر سے آتی ہے
آخری ایک مور کی آواز
جھڑتے پر یہ سوال اٹھا چکے ہیں
کس لیے اتنے دن رہا ہوں میں
بے دلی / بے رخی ہے زوروں پر
منحرف سانس گن رہا ہوں میں
انگلیوں سے بچھڑتی پوروں پر

☆☆☆☆

ناہید قمر

خدایا ترے اس جہانِ بلا میں

خدایا ترے اس جہانِ بلا میں
کہیں ایک منظر ہے
آدھا ادھورا
کوئی رنگ جس پہ ٹھہرتا نہیں ہے
نہ آنسو سا ہمدم
نہ شب سا مہیب
کوئی گھر ہے
بجھتے چراغوں کی حد پر
دعاؤں کی ضد
اور دلاسوں کی زد پر
اجل کے کناروں پہ خوابِ غریب
ہے پُرنور محفل کہیں ایک
جس میں
بلاوے سے محروم ہے حاضری کے
کوئی روح افسردہ
آتش نصیب
کہیں کچھ فنا کے مسافر پرندے
گزرتے ہیں حیرت کی سب وادیوں سے
محبت بعدم
جستجو، بے نیازی
یقیں سے گریزاں
گماں کے رقیب
کہیں اک کھلونے سا دِل ہے کسی کا
زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے گر کر
بکھرتا ہے
جڑتا ہے
پھر ٹوٹتا ہے
خدایا ترے اس جہانِ بلا میں
نہ جس کی دوا ہے
نہ جس کا طبیب

☆☆☆☆

سلطان کھاروی

ماہیے

چنگیر میں روٹی ہے
داتا بہت بڑا
میری خواہش چھوٹی ہے

☆

حسرت ہے سینے میں
کاش ہمارا بھی
گھر ہوتا مدینے میں

☆

برسات کی راتیں ہیں
چوپال اور پنگھٹ پر
تیری ہی باتیں ہیں

☆

اک بہتا جھرنا ہے
جینا تیرے لیے
تری آس میں مرنا ہے

☆

ساون کے جھولے ہیں
یاد کروں اُن کو
جو مجھ کو بھولے ہیں

☆

اب چاند بُلاتا ہے
آؤ تم بھی تو
گھر سورج جاتا ہے

☆

☆☆☆☆

عمران ازفر

آج وہاں پر کوئی نہیں ہے!

سُونا کمرہ چیخ رہا ہے
شیلف پہ رکھے رنگ برنگے
پھول اداسی اوڑھ چکے ہیں
جس دھرتی پر ہم تم جنموں ساتھ رہے تھے
خوب جیے تھے
روئے ہنسے تھے
اُس دھرتی پر خاموشی کا راج ہوا ہے
شہر سے ہجرت کر لی لیکن
تیرا پہلو کب چھوٹا ہے؟
درد سے رشتہ کب ٹُوٹا ہے؟
آج بھی آخر
مُسکاتی نیندوں میں تجھ کو ہنستا گاتا
دیکھ لیا ہے
پَل بھی صدیوں پر پھیلا ہے
خوشبو خوشبو تیرا پیکر
لال گلابی تیرے کاندھے
مہکی مہکی تیری زُلفیں، گھور گھنیری
بہکی بہکی میری سانسیں

جلتی آنکھیں، رستے پاؤں
تُو اک خواب چنبیلی جس سے
سات سُروں سی آتش بھڑکے
اوس بدن پر خوشبو پھیلے
دھیرے دھیرے، رقصاں رقصاں، سُبک خراماں

میری سانسیں!
چلتے چلتے، جلتے جلتے، برس بتائے
خواب گنوائے
آگ لگائی، کو دجلائی
سارنگی پر رین خراماں
خُنک ستارے، تنہا سارے
رات بھی مَن میں گڑی ہوئی ہے
پتھر ٹھہرا ہے کتبے پر
پھول اداسی اوڑھ چکے ہیں
خالی بستر چیخ رہا ہے
آنکھ لہو سے بھری ہوئی ہے
آج وہاں پر کوئی نہیں ہے

اظہر عباس

کریکٹر

مجھے اپنے کریکٹر میں
ادا کاری نبھانی تھی
کسی مرتے ہوئے نا کام عاشق کی
ہدایت کار نے مجھ سے کہا تھا
یوں نبھانا اس کریکٹر کو
کہ اس میں جان پڑ جائے
جو دیکھے یاد رکھے عمر بھر اس کو
کریکٹر لے تو بیٹھا تھا
مگر!
مجھ کو ادا کاری نہیں آتی تھی کیا کرتا!
ادھر یوں بھی مجھے ہر حال میں اپنے کریکٹر کو
نبھانا تھا
زمانے کو بتانا تھا
کسی نا کام عاشق کی ادا کاری کوئی آساں نہیں ہوتی
کہ جب میں خود بھی اک نا کام عاشق تھا
سو میں نے اس کریکٹر میں
کچھ ایسے جان ڈالی
جان ہی دے دی

ذاکر رحمان

خودکشی

میں قصہ گو
کہانی سوچنے والا
کہانی کھوجنے والا
میں کرداروں کو کرداروں سے مروا کر
تماشا دیکھنے والا
کہانی جوڑنے کے اس نشے میں
سارے کرداروں کا قتلِ عام کر بیٹھا
کہانی تو سفر میں تھی
کہانی ختم کرنا اب مرے بس میں نہیں باقی
میں کرداروں کا قتلِ عام کر کے سوچتا ہوں
اب کہانی کو بچانے میں
مجھے کردار بننا ہے
اور اپنا خون کرنا ہے

☆☆☆☆

شاہین (کینیڈا)

دردِ شب نشیناں

خوشش بادا نسیم صبح گاہی   کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد

(حافظ)

رات کی خوشبو سے بوجھل
کھردری، کچی ہوا کے ہاتھ تھامے
دور سے ناگاہ اک آواز آئی
تم کہاں ہو؟

اور ہم
اپنی گزرگاہِ انا کی قید میں
خفتہ تمازت سے گریزاں
رات کی ٹھنڈک بھری
کم خوابیوں سے
پارہ پارہ
کٹ کے
ہستی سے خجل ہوتے رہے

☆☆☆☆

تسنیم کوثر

مہرِ خاموشی

ہمیں چُپ رہ کے جینے کا سلیقہ آ گیا ہے اب
کوئی لمحہ خوشی کا ہو کہ دکھ اترے رگِ جاں میں
کوئی تنہا ہمیں کر دے کہ باندھے عہد و پیماں میں
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا
یہ سب ماضی کے قصے ہیں
کہ ہم چڑیا کے مر جانے پہ پہروں جی جلاتے تھے
کبھی جذبوں کے آنگن میں نئے سپنے سجاتے تھے
کبھی اک نرم سرگوشی ہمیں خوابیدہ کرتی تھی
کبھی چھوٹی سی کوئی بات بھی رنجیدہ کرتی تھی
یہ سب باتیں پرانی ہیں
اب ایسا کچھ نہیں ہوتا
حوادث نے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگا دی ہے
خوشی کی بات کا غم کا اثر ہم پر نہیں ہوتا
نظر سے گُل کِھلا تا کارگر ہم پر نہیں ہوتا
شگوفے کھل اٹھیں یا پھر خزاں میں ہم اکیلے ہوں
شفق آنگن میں اترے یا بدن خواہش کے میلے ہوں
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا
حوادث نے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگا دی ہے

محمود احمد قاضی

کُندن

گلی جو خاصی فراخ ہے اچانک کسی بوتل کی گردن کی طرح تنگ ہونے لگتی ہے۔ تنگی کے باوجود گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک گھر کی کھڑکی کھلتی ہے اور بند ہو جاتی ہے۔ بوتل کی گردن کھل کر پھیل جاتی ہے۔ سامنے سے گدھا سوار آتا ہے۔ اس کے چوغے کے پلو زمین کے ساتھ گھسٹ رہے ہیں۔ اس کے بڑے سے سر پر رکھی لمبوتری ٹوپی دائیں بائیں جھول رہی ہے۔ ہم دونوں میں سلام کا تبادلہ ہوتا ہے۔ میں نے اس سے اپنے مطلوبہ شخص کا پتہ پوچھا۔ اس نے اپنے سر کو گھماتے ہوئے اپنی کھرکھراتی آواز میں کہا بائیں طرف، ساتواں گھر۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے چل پڑا۔ یہاں پر جگہ ایک دائرے کی شکل اختیار کر گئی۔ ادھر ایک شخص ہاتھ میں لاٹھی لیے کھڑا ہوا، مگر قدرے جھکا ہوا ایک گدھے کو گول گول گھمائے جاتا ہے۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے لیکن مسلسل اسے تکتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہوں۔ ساتواں گھر دوسرے گھروں سے تھوڑا مختلف ہے۔ یہ پورے کا پورا لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ اوپر والے کمرے کو جس کے آگے ایک برآمدہ بنا ہے شہتیروں کی طرز کی کھڑکی کے کئی ستونوں کی مدد سے سہارا دیا گیا ہے۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ نیچے ستونوں کے درمیان خلاء ہے۔ وہاں جلانے والی لکڑی کے گٹھے اور الا بلا دوسرا سامان بکھرا پڑا ہے۔ گھر کے آس پاس خاموشی طاری ہے۔ میں کچھ دیر تک نیچے رکتا ہوں۔ پھر ایک قدرتی جھجک کے ساتھ سیڑھی پر پاؤں دھرتا ہوں۔ سیڑھی میرے وزن تلے دب کر بھاری سانس لیتی ہے۔ میں اسے عبور کر کے اوپر آتا ہوں۔ کمرے کا دروازہ کھلا پاتا ہوں۔ میں رک جاتا ہوں۔ میں آواز دیتا ہوں، کوئی ہے؟ میری آواز کسی درخت کی ٹہنی سے ٹوٹے خشک پتے کی طرح ہولے سے میرے چہرے تک واپس آتی ہے۔ کچھ دیر تک میں خود کو اندر جانے سے روکے رکھتا ہوں۔ پھر اندر چلا جاتا ہوں۔ مجھے ایک کونے میں لوہے کے سپرنگوں والی چارپائی دکھائی دیتی ہے۔ اس پر ایک معمولی سا بستر بچھا ہے۔ پائینتی پر ایک تہہ کیا ہوا کھیس پڑا ہے۔ سر کی طرف ایک سرہانے کے اوپر موٹا سا تکیہ پڑا ہے۔ دوسری جانب اینٹوں پر ایک لوہے کا ٹرنک رکھا ہے۔ قریب ہی چینی کی تین پیالیاں اور ایک مگ پڑا ہے جو پلاسٹک کا بنا ہے۔ اس کی ڈنڈی کا نچلا حصہ ٹوٹا ہوا ہے۔ ایک دیوار کے ساتھ توا، پرات اور سٹیل کی بالٹی رکھی ہے۔ چند لوہے کے ڈبے بھی ہیں۔ شاید مصالحہ جات کے لیے ہیں۔

تھوڑے فاصلے پر ایک بڑا سا اسٹوو نما چولہا رکھا ہے۔ مٹی کے تیل کا کین بھی ساتھ ہی دھرا ہے۔ وہیں پر کھلے منہ والا ایک کڑاہی نما برتن بھی ہے۔ جس کی رنگت اندر اور باہر سے پوری طرح سیاہ ہے۔ اس کے اطراف میں پیتل کے دو ہینڈل لگے ہیں۔ وہاں پر چند ایک مڑی تڑی چیزوں کا مفہوم میں جان جاتا ہوں یہ کڑچھا سا ہے جس کی ہتھی کے سرے پر لکڑی کا بنا گولا سا ہے۔ مجھے اس کا مصرف بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کڑچھے کے ساتھ ایک بڑے سائز کی چھلنی اور لوہے کی سلاخ بھی موجود ہے۔ میں دیگر ساری اشیاء کو گہرے انہماک سے تکتا ہوں اور کمرے کے عین بیچ میں کھڑے ہو کر ایک لمبی سانس لیتا ہوں۔ کمرے میں ایک اسرار ہے مگر یہ مبہوت کر دینے والا نہیں۔ پریشان کرنے والا نہیں۔ وہاں ایک طرح کی مانوسیت کی فضا ہے۔ مجھے ادھر اجنبیت محسوس نہیں ہوتی لیکن وہاں مستقلاً ٹھہرنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ میں باہر آ جاتا ہوں۔ سیڑھیاں طے کر کے نیچے آتا ہوں۔ اب میری نظر ایک طرف موجود گدھے کی سوکھی لید پر پڑتی ہے۔ ایک ناگوار بو میری ناک سے ٹکراتی ہے۔ میں وہاں سے کھسک لیتا ہوں۔

میں وقت گزارنے کے لیے آگے بڑھ جاتا ہوں۔ گلی کے آخر میں میں ایک کوٹھڑی نما کمرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ آگے کچا صحن ہے۔ کوٹھڑی دھوئیں سے کالی ہو رہی ہے۔ وہاں ایک شخص دوزانو ہو کر بیٹھا ہے۔ اس کا گول سر منڈھا ہوا ہے اس کی بھنوئیں بھی استرے کی زد میں آئی ہوئی ہیں۔ وہ کلین شیو ہے۔ اس کی آنکھوں کی جگہ دو انگارے دھرے ہیں۔ وہ آگے پیچھے جھول رہا ہے۔ اس کے منہ سے بے ہنگم سی آوازیں نکل رہی ہیں۔ سامنے جو چٹائی بچھی ہے اس پر تین سبز رنگ مخروطی ٹوپیوں اور نارنجی چوغوں والے مرد، پتلی عباؤں والی دو عورتیں جن کے بالوں کی مینڈھیاں ان کی کنپٹیوں پر جھول رہی ہیں، بیٹھی ہیں۔ لمبے سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس ایک نوعمر لڑکا بھی وہاں بیٹھا ہے جو بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ رہا ہے وہ مسلسل اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو میچ مچا رہا ہے جیسے اس کی آنکھوں میں بے پناہ جلن ہو رہی ہو۔ سب نے اپنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ کالے لباس والا درویش متواتر کچھ نہ کچھ بولے جا رہا ہے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے ناراضی ہے۔ میں اندر جانے کو ہوا۔ پھر رک گیا۔ تبھی اس نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے مجھے اپنی طرف آنے کو کہا۔

میں اندر چلا گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ان لوگوں کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ سارے لوگ ایک ایک کر کے اٹھ گئے۔ جانے سے پہلے ہر ایک نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیے۔ کیسے آنا ہوا؟ لوگوں کے منتشر ہونے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس کے لہجے میں تختی ہے۔ ہلکا سا طیش ہے۔

کھوج، تلاش، جستجو! لیکن لا حاصلی کے پیچھے سرگرداں رہنا کوئی دانشمندی اور بھل مانسی نہیں۔ بے کار پھرتے ہو۔ لوبھ، لالچ، طلائی کشش۔ کیا سدا بھٹکتے ہی رہو گے۔ لوٹ جاؤ، تم ایک سراب کے پیچھے چل رہے ہو۔ حالاں کہ تمھارا اس دنیا میں آنے کا مقصد کچھ اور ہے، یہ میری تنبیہ ہے۔ برے وقت سے پہلے ہی مڑ جاؤ۔ جو آپ گمراہ ہے وہ تمھیں کیا دے سکتا ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ وہ خود فریبی کا شکار ہے۔ وہ کب کا اپنی منزل کھو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں تم مانو گے نہیں۔ آدمی سدا کا ضدی ہے۔ اپنی ہٹ عام طور پر نہیں چھوڑتا۔ پیچھے نہیں ہٹتا۔ اسی لیے وہ خسارے میں ہے۔ ایسا اس کے لیے کہہ دیا گیا ہے۔

میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیے بغیر اٹھ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے اس کی بڑبڑاہٹ سنی۔ ناستک۔

میں تھوڑا سا گھوم پھر کر پھر ادھر آتا ہوں۔ میں سیڑھیاں چڑھتا ہوں اور برآمدے میں آ کر رکتا ہوں۔ وہاں ہوا ہولے ہولے جھولا جھول رہی ہے۔ فضا میں ایک نرماہٹ ہے۔ گداز ہے۔ مجھے لگتا ہے اس جگہ کا ایک رومانس ہے۔ شام کا دھندلکا پھیلنے سے تھوڑا پہلے میں اسے آتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اس کا گدھا جس پر وہ سوار ہے مجھے کافی اونچے قد کا لگتا ہے۔ گدھے کی جلد نیم سیاہ اور نیم بھوری ہے۔ اس کے کان لمبے اور نتھنے چوڑے ہیں۔ یہ خاصا فربہ جانور ہے۔ وہ گدھے کو ایک ستون کے ساتھ باندھتا ہے تب اس کی نظر مجھ پر پڑتی ہے۔ اس کی آنکھیں جو قدرے نیلی ہیں ہر قسم کے تاثر سے خالی ہیں۔ میرے نزدیک ایسے لوگ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کی شخصیت کے سحر سے نکالنے کی کوشش میں لگ جاتا ہوں۔ یہ بندہ اپنی شکل وشباہت اور وضع قطع کے لحاظ سے مختلف دکھتا ہے۔ اس نے کالے رنگ کی جین کی پتلون اور زرد شرٹ پہن رکھی ہے جو کالر کے بغیر ہے۔ اس کے پاؤں میں جاگرز ہیں۔ اس نے جب گدھے پر سے بڑا سا تھیلا اتارا تو میں نے دیکھا اس کے دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں بڑے سے نیلم کے پتھر والی انگوٹھی ہے۔ اس کا قد لمبا ہے۔ وہ لہراتا ہوا سا چل رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وقت کا تجربہ اور حزن ایک ساتھ موجود ہے۔ اس کی آنکھوں کا رنگ بدلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ بیک وقت، نیلا، کالا، بھورا اور قرمزی ہے۔ وہ آہستہ سے چل کر اوپر سیڑھیوں پر تیزی سے قدم رکھتا ہوا آتا ہے۔ وہ میرے پاس سے گزر جاتا ہے۔ میں اس کے پیچھے اندر آتا ہوں۔ وہ اپنا جھولا ایک طرف رکھ کر اوپر اٹھتا ہے۔ اس کے بڑے سے سر پر سنہرے بالوں کا چھتا ہے۔ اس کے ہونٹ پتلے ہیں۔ اس کی مونچھیں نہیں ہیں۔ اس کی چھوٹی سی داڑھی اسے اچھی لگتی ہے۔ میں بغیر کسی تمہید کے سوال کرتا ہوں۔

آپ جب گھر پر نہیں ہوتے تو دروازہ بند کر کے نہیں جاتے؟

نہیں !

وہ کیوں جناب؟

وہ اس لیے کہ ایک تو یہ گھر ہے ہی نہیں ۔ بس ایک فرسودہ سا کمرہ ہے ۔ ویسے یہاں کی واحد چرائی جانے والی یعنی قیمتی چیز میں خود ہی ہوں، اس لیے جب گھر پہ ہوتا ہوں تو دروازہ بند رکھتا ہوں ۔ باہر جاتا ہوں تو دروازہ کھول دیتا ہوں ۔

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا ۔ ایسا جملہ تو اپنے بارے میں شاید ایک شاعر اور دانشور نے کہا ہے ۔ میں نے سوچا ۔ خیالات کیسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کرتے رہتے ہیں ۔

میں مسکرایا اور اسے اپنا تعارف کرایا ۔ اس نے مجھے درمیان میں ہی ٹوک دیا ۔ مجھے تمھارے اس لمبے چوڑے تعارف کی ضرورت نہیں ۔ میں جانتا ہوں تم کو اور تمھاری غرض کو ۔ یہاں تو ادھر کے رہنے والے بھی مجھ سے ملنے نہیں آتے ۔ کنی کترا کر نکل جاتے ہیں ۔

میں گم صم کھڑا رہا ۔ وہ پتیلی اٹھا کر باہر نکل گیا ۔ جب آیا تو لگا اس میں پانی ہے ۔ اس نے اسٹوو کو روشن کیا ۔ پتیلی اس پر رکھ دی ۔ پانی گرم ہو کر کھولنے لگا تو اس نے قریب پڑے ڈبے سے چائے کی پتی نکال کر اس میں ڈالی ۔ پھر اس نے اپنے جھولے کو ٹٹولا اور اس میں سے ڈبے کا دودھ نکالا ۔ وہ بھی تھوڑی مقدار میں اس میں ڈالا ۔ بعد میں مناسب مقدار میں اس نے چینی بھی ڈال دی ۔ چائے تیار کرنے کے بعد اس نے ٹرنک کے اوپر سے دو چینی کے کپ اٹھائے ۔ اس نے میرے لیے اور اپنے لیے چائے ان میں ڈالی ۔ میں نے پہلا گھونٹ لیا ۔ چائے مزے دار نکلی ۔ میں مگن ہو کر پینے لگا ۔ وہ بدستور میری طرف دیکھنے میں لگ گیا ۔

اب اپنا مدعا جلدی سے بیان کرو ۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں ۔

میری جستجو ابھی ادھوری ہے ۔ ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے ۔

یہی تو مسئلہ ہے برادر ۔ یہی تو بات ہے ۔ یہی آنچ مجھے بھی چاہیے ۔ ضروری اور بر وقت آگ، ایک صحیح جنبش، ایک مناسب مقدار، معیار اور لازمی آمیزہ ۔

یہ کیسے ہو؟

اسی کا تو پتہ کرنا ہے ۔

یہ پتہ کیسے لگے؟

مسلسل لگے رہنے سے، تگ و دو کرنے سے، اکتائے بغیر، جھنجلائے بغیر، صبر اور استقامت کے ساتھ سر جھکائے رکھنے سے ۔

اور اگر یہ نصیب میں نہ ہو، دستیاب نہ ہو تو پھر۔

تو پھر بھی لگے رہو اگر تمھیں ایسا کرنا ہے تو ۔۔۔۔

لیکن حاصل کرنے سے پہلے کی لاحاصلی، یہ کیا ہے؟

یہ کسی بھی سفر میں پیش آنے والی وہ صعوبتیں ہیں جو منزل مل جانے پر راحت میں بدل جاتی ہیں۔

کیا یہ سارا کچھ آپ یہیں کرتے ہیں؟

ہاں اسی اسٹوو پر۔ میں اسی میں اپنا سارا سرمایہ جھونکتا ہوں۔ معقول پنشن لیتا ہوں۔ سو مجھے روپے پیسے کی تنگی نہیں ہے۔ گھر گرہستی بھی نہیں اس لیے اور بھی زیادہ سہولت سے یہ سارا کچھ کر گزرتا ہوں۔

آپ کے بال بچے، بیوی، میرا مطلب ہے فیملی؟

کبھی تھی، پھر نہیں رہی۔ میرے اسی شوق کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پہلے بیوی نے ساتھ چھوڑا۔ پھر بچے بھی گئے۔ اس کمرے سے ملحق جو خالی جگہ ہے یہاں کبھی میرا بڑا سا گھر ہوا کرتا تھا۔ جب وہ لوگ نہیں رہے تو میں نے وہ والا گھر خود ہی مسمار کر دیا اور یہاں اس کمرے میں سمٹ آیا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ چاہیے بھی نہیں۔

لوگ بھی مذاق اور تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں وہ سمجھتے ہیں ہم لوبھی ہیں، سنکی ہیں۔

نہیں۔ یہ غلط ہے۔ یہ سارا کچھ تو کچھ اچھا، کچھ بہتر پانے کا وسیلہ ہے۔ ہم ساری عمر کانٹوں پر چلتے ہیں۔ ہم آگ کے بستر پر سوتے ہیں۔ ہمارا مسکن ایک عذاب گاہ ہے۔ کیا ایک سادھو، سنت، فقیر، درویش بھی کچھ پانے کے لیے خود کو کھو نہیں دیتا۔ یہ سارے لوگ فنا سے پہلے فنا کی پناہ میں ہوتے ہیں۔ لیکن وہ تو خدا کی تلاش میں نکلے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔

بھئی ہم دنیا دار کمینے ہیں، پہلے اسے، اس دنیا کو تو پالیں۔ پھر ادھر بھی توجہ دے لیں گے۔ ویسے بھی جو چیز جس کے پاس نہیں ہوتی وہ اسی کے پیچھے بھاگتا ہے۔

تو کیا میں لگا رہوں۔

ہاں اگر تم میں دم ہے تو یہی کرتے رہو۔

مجھے کچھ بتایے۔ بہتر، اچھا، گُر، زاویہ، مہارت، یکسوئی، بصیرت، گہرائی، گیرائی، بہتر نقطۂ نظر۔

اور سب کچھ مانگنا کبھی سکون نہ مانگنا کیوں کہ سکون موت ہے۔ کٹالی، سفوف، برادہ، آمیزہ، کرچھا، آگ۔ یہ سب تمھارے امتحان کے رخ ہیں۔ اکتاؤ نہیں۔ بس لگے رہو۔

پھر بھی کچھ اور بتایے۔ نیا، تازہ، اچھوتا۔

خود میرے پاس ہی کچھ نہیں تو میں تمھیں کیا دوں۔ بہتر ہے جیسے آئے تھے ویسے ہی لوٹ جاؤ۔ بس

ہمیشہ اپنی لگن کو ساتھ رکھو۔ لوگوں کے طعنوں تشنیع اور گالیوں کی پرواہ کیے بغیر۔ کسی بھی چیز کا حصول آسان نہیں ہوتا اور یہ کوئی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ چیز جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں مل بھی جائے۔ لا حاصلی بجائے خود کسی حصول کا ایک پھل ہی ہے۔ چاہے کڑوا ہی سہی۔ جو میٹھے، شیریں خربوزے کھاتے ہیں انھیں کڑوا تما کھانے کے لیے بھی تو خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ آخر اس کو بھی تو کسی کے حصے میں آنا ہے۔ میں نے کان کنی کے مضمون میں ایم ایس سی کر رکھی ہے اور کر کیا رہا ہوں۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا، میں جاتا ہوں۔

تھوڑا رک کر میں نے کہا۔ اچھا ہوا میں اس درویش کی باتوں میں نہیں آیا۔

وہ ایک فراڈ ہے۔ نکما، ہڈ حرام۔ دوسروں کی روٹی کا محتاج۔ وہ تو ہمارے رحم کا مستحق ہے۔

آج اس نے ملاقات کے اختتام پر میرے لیے ایک لفظ استعمال کیا۔ اپنی طرف سے شاید اس نے مجھے گالی دی۔ وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ ہر ذی ہوش اور سوچنے والے کے متعلق اس کے وچار ایسے ہی ہیں۔ لیکن ہمیں تو آگے بڑھتے رہنا ہے۔ جو روکے، ٹوکے، اس کی پروا مت کرو۔ جو اعتراض کرے، اس سے درگزر کرو۔ کام کرتے رہو، عشق کرتے رہو۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔

☆ ☆ ☆ ☆

سعید ملک

معلوم کا دکھ

وہ مسلسل سوچ جا رہی تھی۔۔۔۔ خود تو لامکاں سے مکاں کی طرف اور ہمیں نامعلوم سے معلوم کی جانب کیوں دھکیل دیا۔۔۔؟

ہر روز اس کی چارپائی برآمدے کے ایک ایسے کونے میں رکھ دی جاتی، جہاں سے وہ سارا دن سورج طلوع ہونے سے غروب ہونے تک کا منظر بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ ابھی عید قرباں کے آنے میں تین دن باقی تھے کہ دو صحت مند بکرے خرید کر گھر میں لا کر باندھ دیے گئے۔ بکروں کی آمد سے پورے گھر میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ صحن میں داخل ہونے والا ہر شخص سب سے پہلے بکروں کو دیکھ کر مبارک باد کی صدائیں بلند کرنے لگتا۔ ان کی جسامت، ناز و ادا کی تعریفیں کرتے کرتے ان کی قیمت بھی پوچھنے لگتا اور پھر خریدنے والے کی معاملہ فہمی پر داد دینے لگتا۔۔۔۔

وہ تکیہ سر کے نیچے رکھے سب کے قہقہے اور ہنسی مذاق کی باتیں سن کر آنکھوں سے بے اختیار بہنے والے آنسوؤں کو چپکے چپکے ہتھیلی سے پونچھتی جاتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب اس کے بڑے بھائی نے صحن میں لگی بیری کے درخت سے ہری بھری شاخوں کو تیز کلہاڑی کے وار سے کاٹنا شروع کیا تو اسے ایسا لگا، گویا کلہاڑی کا وار بیری کو نہیں اس کے وجود کو چیرتا جا رہا ہو۔ چھوٹے بچے بیری کی پتوں والی شاخوں کو بکروں کے آگے کرتے تو وہ للچائی نظروں سے گلے میں بندھی رسی کو تڑانے کی کوشش کرنے لگتے۔ بچے بکروں کی اس اچانک حرکت سے، ڈر کے مارے پیچھے ہو جاتے مگر بکرے عین اس وقت اپنی اگلی دونوں ٹانگوں کو بھی اٹھا کر سرسبز شاخوں کو کھانے کے لیے لپکنے لگتے۔ اس منظر کو دیکھ کے بچے زور زور سے تالیاں بجانے لگتے۔ بکرے جب شاخ سے پتے منہ میں لے کر چبانے لگتے تو بچوں کی نظریں، بکروں کی تھوتھنی اور جبڑوں کی حرکات پہ مرکوز ہو جاتیں۔ وہ پتے چبانے کے بعد جب مزید پتوں کی ضد کرنے کے لیے منمنانے لگتے تو بچے ستائش بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگتے۔

''فقط تین دن زندگی کی مہلت'' وہ زیر لب خود کلامی کرنے لگی تھی۔ بکروں کو اگلے تین دن بعد، تیز دھار چھریوں سے ان کی بوٹی بوٹی کر دی جائے گی مگر بکرے اپنی موت کے اتنے قریب ہو کر بھی اس کے خوف

سے بے نیاز، بے فکر اور سر سبز پتوں کو کھا کر کتنے خوش اور مطمئن!!

اس نے پچھلے سال ہی یونیورسٹی میں سکالرشپ لے کر ایم۔ اے فلاسفی میں خوشی خوشی داخلہ لیا تھا۔ وہ کائنات کی تخلیق، فطرت کے اصول، نشوونما، تغیر و تبدل، حیات و موت کے اسرار و رموز، اس کی حقیقت، ماہیت، تصورِ ابدیت اور فنا پذیری جیسے موضوعات میں گہری دلچسپی رکھتی تھی۔ یونیورسٹی میں بمشکل چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اسے جسم میں درد، کمزوری، نقاہت کا احساس ہونے لگا۔ معمولی دوا دارو سے کچھ افاقہ نہ ہوا تو ڈاکٹر کے کہنے پر کچھ مخصوص ٹیسٹ کروائے گئے اور پھر ایک شام جب وہ کلینک میں ڈاکٹر کے سامنے رکھے گول سٹول پر بیٹھی ہوئی تھی تو ڈاکٹر کے چہرے پہ خلافِ معمول سنجیدگی کے اثرات دیکھ کر متفکر ہو کر اپنی نظریں ڈاکٹر کی جھکتی پلکوں پر گاڑ دی تھیں۔ اسے ایسا لگا جیسے کچھ آوازیں کمرے کے در و دیوار سے ٹکرانے کے بعد اس کے کانوں میں نیزے کی طرح پیوست ہو رہی ہوں۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ صرف اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ لفظوں کے بھاری بھرکم پتھر اس کے دماغ پر برس رہے ہوں۔

نسرین صاحبہ! مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے خون میں کچھ ایسے اجزا پائے گئے ہیں جن کے لیے ہمیں مخصوص ادویات استعمال کرانی پڑیں گی مگر ادویات سے زیادہ اہم آپ کا حوصلہ، صبر، ہمت، امید اور تعاون درکار ہو گا۔ ان شااللہ ہم مل کر اس بیماری پر قابو پا لیں گے۔ ڈاکٹر کا بال پوائنٹ کاغذ پر مسلسل چبھتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی ہتھیلیوں میں ٹھنڈے پسینے محسوس ہونے لگے۔ آنکھیں گویا خلا میں گھور رہی ہوں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کمرے میں دھیرے دھیرے اندھیرا پھیلنے لگا ہو۔ پورا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ گول سٹول سے گرتے گرتے بمشکل بچی۔ اس کے پاؤں کھڑا ہونے کی سکت کھو چکے تھے۔

وہ دن اور آج کا دن، ہسپتال کی کینسر والے مریضوں کی وارڈ کے بیڈ سے لے کر گاؤں کی اس چارپائی پر کرب کے عالم میں زندگی سے ناامید و مایوس ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی کائنات سکڑ کر چارپائی تک محدود ہو چکی تھی۔ پاس رکھی چھوٹی سی ٹیبل پر دوائیوں، انجکشن، گولیوں اور کیپسول کے پیکٹ، جوس سے بھرے ڈبے، دوستوں، رشتہ داروں، حکیموں، ڈاکٹروں کی تسلیاں اور جھوٹے دلاسے اس کے دل میں امید کی ایک رمق بھی پیدا نہ کر سکے۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس کی خالہ نے جب مرغیوں کو دانہ صحن میں پھینکا تو اس نے دیکھا کہ بیری کی شاخوں پر بیٹھی بہت سی چڑیاں باری باری ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی نیچے اترنے لگیں۔ وہ مرغیوں کو دانہ چگنے میں مصروف دیکھ کر تھوڑا تھوڑا اور قریب ہونے لگتیں اور نظریں بچا کر دانہ اچک لیتیں اور پھر واپس بیری کی شاخوں پر بیٹھ کر اطمینان سے پر کھجانے لگتیں۔ وہ چڑیوں اور دیگر پرندوں کی معصومیت پر غور کرنے لگی کہ یہ سب اپنے موت کے انجام سے بے خبر کتنے اطمینان، سکون کے ساتھ کھلی فضاؤں میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اسی

اثنا میں اس کی مانو بلی بھی دبے پاؤں اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اس کی گردن کے نیچے اپنی نحیف وزار انگلیوں کو پھیرا تو بلی کی غرغر کی آواز سے اسے اپنے بدن میں محبت کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بلی نے احساس تحفظ، اطمینان اور سکون محسوس کرتے ہی آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ سب جانور اور پرندے اپنے حال میں مست ہو کر جیتے ہیں اور مستقبل کے خوف سے بے نیاز ہو کر سکون و اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

چرند، پرند اور دیگر تمام جاندار غم روزگار کا شکار تو ہو سکتے ہیں مگر موت کے درد سے ہمیشہ نا آشنا رہتے ہیں۔ چیتے کے آگے بھاگتے ہرن کو بھی صرف پکڑے جانے کا خوف ہوتا ہے، موت کا نہیں۔۔۔۔

نسرین باجی! نسرین باجی! آنکھیں کھولو۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔ کون آیا ہے۔۔۔!!!!! اس کے سرہانے کھڑی اس کی چھوٹی بہن خوشی سے چیخنے لگی تھی۔ اس نے تکیے میں دبائے سر کو باہر نکالا۔ بوجھل پلکوں کو بمشکل کھولا۔ دونوں کہنیوں سے سہارا دے کر سر اٹھانے کی کوشش کی مگر بھاری بھرکم سر کا بوجھ اس کی کمزور گردن نہ اٹھا سکی اور سر دوبارہ تکیے پر جا گرا۔

نسرین۔۔۔ نسرین۔۔۔ ''آپ تکلیف نہ کرو۔'' اس کی کلاس فیلو ساجدہ اپنی چیخ سمیت اس کے جسم سے آ لگی تھی۔ اس نے اپنی پیشانی پر ساجدہ کے پیوست ہوتے ہونٹوں کی ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ گرم گرم آنسو اس کے بے جان گالوں سے لڑھکنے لگے تھے۔ ساجدہ کے سینے سے لگتے ہی اس کی خشک آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے، ندی کی صورت بہنے لگے تھے۔ کافی دیر تک وہ دونوں سسکیاں بھرتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ جب کچھ جی ہلکا ہوا تو ساجدہ نے چارپائی پر آلتی پالتی مار کر اس کے پاؤں کو اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ وہ بار بار دونوں پاؤں کو ہاتھوں سے سہلاتی اور ہڈیوں کے ڈھانچے میں زندگی تلاشنے لگتی۔

کافی توقف کے بعد نسرین کی کمزوری آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی، ساجدہ کے کانوں سے ٹکرانے لگی تھی۔

ساجدہ۔۔۔! تم تو جانتی ہو۔۔۔ میں زندگی کو کتنا جینا چاہتی تھی۔ تمھیں شاید اندازہ نہ ہو کہ موت کو اپنی زندگی میں روتا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ مجھے دکھ فقط اتنا ہے کہ زندگی کی جو بھی بچی ہوئی سانسیں میرے نصیب میں ہیں۔ انھیں موت کے خوف سے کیسے آزاد کراؤں۔۔؟

فطرت نے کسی بھی جاندار کو موت کا خوف نہیں بخشا تھا تو پھر انسان نے یہ ''جاننے کا دکھ'' دوسرے انسان کو کیوں دیا ہے؟

رسی سے بندھے بکرے، سرسبز پتے کھانے کے لیے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

عاطف علیم

ایک ناگزیر بلاوے کی روداد

ان دنوں رات کے پہلے ہی پہر کہرا اترنا شروع ہوتا تو گلی چپ کی چادر تانے ایک آلکس میں اونگھنے لگتی۔

یہ وہ وقت تھا جب گلی میں قدموں کی آخری چاپ بھی معدوم ہو چکی تھی اور اب وہاں گھنی چپ تھی جس کی سرسراہٹ نے اس پر بھی گہری نیند طاری کرنا شروع کر دی تھی۔ ابھی نیند کے جھولے نے ٹھیک سے اٹھان بھی نہ پکڑی تھی کہ اچانک ایک سائیکل سوار گھنٹی بجاتا گزرا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کے ہلکورے لیتے دماغ میں جمی نیند کی دبازت میں گھنٹی کی آواز دیر تک ارتعاش پیدا کرتی رہی۔

گھنٹی کی آواز کا سحر اور رات کی گھپ خاموشی، اس کے لاشعور میں آخری بلاوے کی علامتوں کے طور پر جانے کب سے محفوظ پڑی تھیں سو اس نے جان لیا کہ یہی وہ رات ہے جب اس کے عمر بھر کے سفر کو تمام ہونا تھا۔

بستر پر لیٹے لیٹے اسے سانس لینے میں مشکل ہوئی تو اسے لگا کہ جیسے ٹھنڈے ٹھار کمرے میں سے کسی نے ہوا کی چادر سرکانا شروع کر دی ہو۔ اس نے منہ کھول کر سانس لیا لیکن آکسیجن ناکافی تھی، اسے زور لگا کر پھیپھڑوں میں ہوا کو بھرنا پڑا۔ اس مشقت سے وہ ہانپ گئی اور سانس لینا زیادہ دشوار ہو گیا تو اس نے ہمت سمیٹی اور بستر میں ایڑھیاں جما کر خود کو اوپر کھسکایا پھر جسم کے گرد لحاف کو دباتی تکیے کے سہارے بیٹھ گئی۔

فضا سے ہوا کھینچنے کی کوشش میں اس کا سینہ لوہار کی دھونکنی بنا ہوا تھا۔ اس نے گلے کی پھولی رگوں کو سہلاتے ہوئے کچھ دیر اپنی سانس کے بحال ہونے کا انتظار کیا پھر زیرو کے بلب کی زرد روشنی میں انھیلر کو ٹٹول کر دو پف کھینچے اور فوری ریلیف کے لیے آکسیجن سلنڈر کی نالی کو ڈھونڈ ذرا سی ناب کھول کر گیس ماسک کو ناک پر جمایا اور چند گہرے سانس کھینچنے کے بعد نڈھال سی ہو لحاف میں سرک گئی۔ ماسک سے نکلتی آکسیجن کی ہلکی سی پھوار اور سوں سوں کی آواز کے تسلسل میں ایک کیف سا تھا کہ وہ پھر سے ہولے ہولے غنودگی کی گہرائیوں میں اترنے لگی۔ تب کچھ یاد آنے پر اس نے سر کو جھٹک کر خود کو نیند کے ہلکورے سے آزاد کیا اور چونکی سی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اسے آج کی رات جاگ کر گزارنا تھی۔

اس نے مدہم روشنی میں اپنے سرہانے پڑے سرخ ہندسوں والے ٹائم پیس پر وقت دیکھا، ابھی بارہ نہیں بجے تھے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس کی چھوٹی بیٹی اس کے پاس ہی موجود تھی۔ وہ اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ اس کے بہت اصرار پر بھی جب اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تو گرم گرم سوپ بنا لائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے چمچ چمچ سوپ پینے پر مجبور کیا۔ وہ چھوٹی کو آج کی رات کے بارے میں بتانا چاہتی تھی لیکن وہ اپنی بپتا میں الجھی ہوئی تھی۔ آج پھر اس کی اپنے شوہر سے منہ ماری ہو گئی تھی اور وہ اپنی بدنصیبی کے احساس سے بھری ہوئی چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ پونچھ دل کا غبار نکالتی رہی تھی۔ وہ بھی لحاف میں دبکی یہ سوچ کر کہ وہ اپنے رونے دھونے میں اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لے گی، اوپرے دل سے ہوں ہاں کرتی رہی۔ جب چھوٹی اسے کھانسی اور سینے کی جکڑن کو کم کرنے والے سیرپ پلا کر قہوہ بنانے گئی تو کھانسی کے ایک مختصر دورے کے بعد بھی وہ اسے اپنے راز میں شریک کرنے کا فیصلہ نہ کر پائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی، قہوے کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کسی اور ضرورت کا پوچھتے ہوئے ٹرے اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی جہاں وہ کچھ دیر کھٹ پٹ کرتی رہی پھر سونے کے لیے اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ ابھی اسے رات کے کسی پہر دوبارہ آنا تھا کہ اس کا روز کا معمول تھا کہ نیند کے دوران شوگر لیول کم ہونے پر وہ جاگ جاتی اور پھر نیچے اتر کر باورچی خانے کا رخ کرتی جس کے بعد وہ احتیاطاً ماں کے کمرے میں بھی جھانک لیتی تھی۔

کیا ہوتا جو وہ اسے روک لیتی، بھلے نہ بتاتی مگر اپنے کمرے میں ہی سلا لیتی کہ کہیں بعد میں چھوٹی کو اور باقی سبھوں کو قلق نہ رہتا لیکن اگلے لمحے وہ پچھتاوے کے بوجھ سے نکل آئی کہ وہ بہادری کے ساتھ آج کی رات کا تنہا سامنا کرنا چاہتی تھی۔

یوں تو خوف اپنے ہر روپ میں ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا لیکن جب بھی اس کے دماغ میں گھنٹی کی آواز اور رات کی گھپ خاموشی کے اشارے ابھرتے ایک انجانا خوف اسے جھرجھرا دیا کرتا تھا لیکن اب جبکہ لاشعور میں چھپی علامتیں خود کو ظاہر کر چکی تھیں وہ ہونی کے قدیم سے لاحق خوف سے یک لخت آزاد ہو گئی اور خود کو ایک ٹھنڈی ٹھار کاہل سی خود سپردگی کے حوالے کر دیا۔

‘بس اتنی سی بات تھی؟’ اس نے تکیے پر سر کو جمایا اور مسکرا دی، ”میں بھی پاگل ہوں، ایویں ای ڈرتی رہی۔“

دکھ البتہ یہ تھا کہ ابھی کرنے کو بہت کام پڑے تھے اور یہ سارے کام تنہا وہی کر سکتی تھی۔ وہی اپنے ناگزیر ہونے کا خیال جو عمر بھر سے کام میں جتے رہنے اور دوسروں کے بوجھ کو ڈھوتے چلے جانے کے لازمی

نتیجے میں اس کے دماغ میں رچ بس گیا تھا۔

وہ سردیوں کی یخ بستہ راتیں تھیں، لمبی اور اونگھتی ہوئی اور صبح کا اجالا پھیلنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ آج رات کسی بھی وقت اسے اجالا دیکھے بغیر اور رات کے خاتمے کا اعلان کرتی اذان کی آواز سنے بغیر چلے جانا تھا اور یہ اس کی زندگی کی پہلی رات ہوتی جس کا اختتام اس کے عمر بھر کے معمول کے بغیر ہوتا۔ یہ سوچ کر اسے احساس گناہ سا ہوا کہ آج وہ تڑکے اٹھ کر وضو نہیں کرے گی، نماز نہیں پڑھے گی، تلاوت نہیں کرے گی اور بستر کے ساتھ والی کھڑکی سے زندگی کو ہولے ہولے بیدار ہوتا نہیں دیکھے گی۔ بس یہی ایک پریشان کن احساس تھا ورنہ وہ خود کو ہر ناگواری سے آزاد محسوس کر رہی تھی۔

وہ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں بیٹھی اپنے کمزور ہاتھوں کی پشت پر ابھری ہوئی رگوں پر انگلی پھیرتے ہوئے چھوٹی کی بے معنی شکایتوں کو یاد کرتے ہوئے مسکرائی اور اس کا دل لاڈ سے اور رفاقت کی خواہش سے بھر گیا۔ اسے ایک بار پھر خیال ستانے لگا کہ اسے چھوٹی کو روک لینا چاہیے تھا۔ خوف کو جھٹکنے کے لیے کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس پانے کے لیے نہیں بل کہ اس لیے کہ ابھی کہنے کو بہت کچھ باقی تھا، بہت سی ان کہی باتیں تھیں جو دوسروں کی امانت تھیں۔ وہ یہ سوچ کر ملول ہو گئی کہ چھوٹی کو جانے کی اجازت دے کر اس نے ناقابل تلافی خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر گردن گھما کر گھڑی کے ہندسوں کو دیکھا۔ ابھی چھوٹی کے شوگر لیول کے کم ہونے میں بہت دیر تھی۔ رات کے جس پہر میں بھی ایسا ہوتا اسے لمحہ بھر کے لیے چھوٹی کی مبہم سی رفاقت نصیب ہو جاتی حالاں کہ جب بھی رات کی خاموشی میں دروازہ ہولے سے چرچراتا وہ جاگنے کے باوجود سوئی بن جاتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماں کو جاگتے پا کر وہ مروت میں پاس آ بیٹھے اور اس کچی نیندوں سونے والی کی نیند پوری ہونے سے رہ جائے۔

یخ بستہ کمرے میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی کپکپاہٹ کے باوجود وہ آکسیجن لینے کے باعث خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہی تھی سو اس نے سلنڈر کی ناب بند کر کے ماسک کو ہٹا دیا۔

اب کے برس بھی سردیوں میں گیس ہیٹر کا آسرا نہیں تھا کہ گیس صبح کی گئی آدھی رات کو آتی تھی۔

پچھلی سردیوں میں جب چھوٹی اور فرخی دونوں اس کے پاس موجود تھیں تب بھی گیس کا یہی معمول تھا لیکن ابھی شوگر چھوٹی کی جان کا روگ نہیں بنی تھی لہذا وہ رات گئے گیس آنے پر کھانا وغیرہ بنا دیا کرتی تھی اور کچھ دیر کے لیے ہی سہی ماں اور بڑی بہن کے کمرے کو جسے وہ مذاق میں جنرل وارڈ کہا کرتی تھی، گرم کر دیا کرتی تھی لیکن ان سردیوں میں گیس کی سپلائی اور پریشر کو جانے کیا موت آئی تھی کہ رات میں اگر ہیٹر جلنے پر آمادہ ہو بھی جاتا تو

کچھ دیر میں پھبکے مار کر بجھ جاتا تھا۔ دوسری طرف اس کے نیم جان پھیپھڑوں کے لیے ٹھنڈی راتوں کو سہارنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ یہ والی سردیاں نکال ہی جاتی اگر اسے گرم راتیں نصیب ہوتیں لیکن کون رات بھر ہیٹر پر نظریں جمائے رہتا کہ کب وہ پھبکا مار کر بجھے اور وہ گیس کی سوں سوں پر کان جمائے، تیلیاں جلا جلا کر گیس کی بحالی کا یقین کرتا رہے۔

یہ گھر جو کبھی بھرا پرا تھا اب یہاں ماں کے علاوہ فقط ایک چھوٹی ہی رہ گئی تھی لیکن وہ بھی اتنی کھیچل کے قابل کہاں کہ راتوں کو اٹھ کر ٹھنڈ میں ہانڈی چولہا بھی کرے اور رات رات بھر ماں کے کمرے میں گیس ہیٹر کی نگرانی بھی کرتی رہے۔ ماں کی سخت راتیں شروع ہوئیں تو چھوٹی نے کہا بھی کہ وہ ماں کے کمرے میں سو جایا کرے اور گیس کی سپلائی کا دھیان رکھے لیکن ماں نے اس کی بے آرامی کا سوچ کر سختی سے منع کر دیا تھا۔

پار سال فرخی بھی ٹھنڈ کے مارے پچھلی سردیاں نہ نکال پائی تھی اور اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے اور بڑی کے درمیان بس ایک ٹھنڈے موسم کا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔ یوں بھی چھٹتی بھی کیسے کہ بڑی اتنی اچھی کہاں کہ اسے جینے کے لیے اکیلا چھوڑ دے۔

اسے استخوانی ہاتھوں کی پشت پر ابھری رگوں کو سہلاتے ہوئے فرخی کا خیال آیا تو اس کا گلا رندھ گیا۔ اس نے کروٹ بدل کر اس کی خالی چارپائی پر نظریں جما دیں جہاں اس کا بیمار ہیولا اس کی دوسراتھ کو ابھی تک موجود تھا۔

فرخی بہادری کا بوجھ اٹھائے جینے کے لیے پیدا ہوئی تھی کہ اسے عمر بھر نفی کو اثبات میں بدلنے کی لاحاصلی میں مبتلا رہنا تھا اور پھر ایک روز چپ چاپ مر جانا تھا۔ سب سے بڑی نے اپنے سے بعد پیدا ہونے والی بہنوں کے حصے کا دودھ بھی چوس لیا تھا۔ اس کے بعد پیدا ہونے والی دو بہنیں بھینس کے کھلے دودھ کو سہار نہ سکیں اور پانچواں برس لگنے سے پہلے ہی آنکھ مچولی کھیلتے کسی اور دنیا میں جا چھپی تھیں۔ فرخی اگر ماں کے دودھ سے محرومی اور بیماریوں کے پے در پے حملوں کے باوجود اگر پانچویں سے چھٹے سال میں داخل ہوئی تو یہ اس کی جنگجو طبیعت کے باعث ہی ممکن ہوا تھا اور یہ بھی اسی کا جگرا تھا کہ وہ جینے کے مخدوش امکانات کے باوجود موت سے لڑتے بھڑتے عمر کی چار دہائیاں نکال گئی تھی۔

اس کے بعد آچھو اس دنیا میں آیا تو ماں کا دودھ بھی رواں ہو گیا تھا اور لڑکیوں والے گھر کی سوگوار چھاپ بھی اس گھر سے مٹ گئی تھی۔ فرخی کا خدا کے بعد پہلا جھگڑا آچھو سے ہی ہوا تھا کہ ماں نے جو لاڈ فرخی کے لیے سنبھال رکھے تھے وہ آتے ہی اس نے چرا لیے تھے جبکہ دوسرے جھگڑے کا فریق اس کا باپ تھا جو اپنے دل میں عورت ذات کے لیے دائمی تحقیر رکھتا تھا اور بیوی ہو یا بیٹی، انھیں ایک محفوظ فاصلے پر رکھنے کا قائل

تھا سو ایک روز تنہا تنہا ننگے پاؤں مٹی میں کھیلتے وقت اس نے آچھو کو باپ کے کندھے پر سوار دیکھا تو طے کر لیا کہ باپ کے ساتھ اس کا جھگڑا تا عمر چلنے والا تھا۔

فرخی نے خود کو تسلیم کروانا تھا سو پرائیویٹ میٹرک کرتے ہی اس نے محلے کے ایک سکول میں پڑھانا شروع کر دیا اور ایف اے کے بعد اسے بھاگ دوڑ کر کے ایک میونسپل سکول میں ملازمت بھی مل گئی۔ تب وہ اپنی ماں کی بیٹی ہوا کرتی تھی اور اس کے ساتھ مل کر گھر کو گھر جیسا بنانے کے پر جوش خواب دیکھا کرتی تھی۔ سب سے بڑی کا بوجھ کچی عمر میں ہی اتارا جا چکا تھا سو باپ کی ازلی لاتعلقی کے باعث اسے اس گھر کے سرپرست کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ انھی دنوں اس نے کمیٹی ڈال کر بھائی کو پہلی سائیکل خرید کر دی تو وہ اپنے سے چھوٹوں کے باپ کے طور پر بھی تسلیم کر لی گئی لیکن ابھی اور تسلیم کیا جانا باقی تھا سو اس نے چولہا جھونکتے جھونکتے پرائیویٹ بی اے کے بعد بی ایڈ اور ایم اے تک کر لیا۔ وہ ابھی اور سربلند ہوتی کہ اچانک اسے لال جوڑا پہنا کر اپنے باپ جیسے ایک مرد کے حوالے کر دیا گیا اور اماوس کی طرف اس کا سفر شروع ہو گیا۔ اب اس کا ماں سے بھی جھگڑا شروع ہو گیا کہ اس کے خوابوں کے قتل پر سب سے زیادہ وہی خوش تھی۔

دو ہی سال بعد وہ بیوہ ہو کر گھر واپس آ گئی تھی لیکن اب وہ کوئی اور تھی، اپنے خوابوں سے محروم ایک لاتعلق سا وجود۔ تب اس نے اپنے سائے کو سہیلی مانا اور اپنی کھوئی ہوئی ملازمت پر واپس آ گئی۔ اسے خود کو منوانے سے محروم کر دیا گیا تھا سو اس نے خاموشی اور بیماری میں پناہ ڈھونڈ لی تھی اور پھر ایک روز ماں سے لڑتے جھگڑتے اس نے اپنا علم بغاوت بغل میں دبایا اور کفن اوڑھ لیا۔

ماں کو اس سے بس یہی ایک شکوہ تھا کہ اس نے ماں سے جھگڑا پالنے کے بعد ایک بار بھی اس کے دل میں جھانکنا ضروری نہ سمجھا تھا۔ وہ اپنی کمزوریوں کی ماری ماں کے لیے بہادری کی علامت تھی اور اس کے بعد اب جینے کے لیے کچھ رہ بھی نہیں گیا تھا۔

یخ بستہ موت کے ماحول سے اس کے پاس چھوٹی نہ سہی فرخی تو موجود تھی سو وہ خالی چارپائی کو مخاطب کرتے دل میں مدتوں سے جمع بخار کو ہلکا کرتی رہی۔ فرخی جب زندہ تھی تو جانتی تھی، سب کچھ، ایک ایک نقطہ، ایک ایک شوشا تک سو جب شنید کے قدیم بحران کی ماری ماں جس نے سہ جانے اور چپ رہنے کی تربیت پائی تھی جب کبھی روح کی گہرائی تک بھر جاتی تو فرخی کے سوا کون تھا جو اس کی سنتا لیکن اپنی ضیق النفسی سے ہلکان فرخی کو بھی کہاں شنید کی تاب تھی سو وہ جھلا اٹھتی تھی اور کوئی تلخ بات کر کے ماں کو مزید زخمی کر دیتی تھی لیکن آج وہ اپنی خالی چارپائی پر ہیولا سی پڑی، ناگواری دکھائے بغیر اسے صرف دیکھ سکتی تھی اور سن سکتی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈ جو اس کی برداشت میں تھی، دھیرے دھیرے برداشت سے باہر ہونے لگی تھی

حالاں کہ ابھی ٹھیک سے رات کا نصف بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک موٹا لحاف تھا جس پر ایک کمبل تھا لیکن ٹھنڈ تھی کہ سات تہوں میں بھی گھسی جا رہی تھی۔ اس نے ناک تک لحاف کھینچا اور کپکپاتے ہوئے تھوڑا اور اپنے اندر سمٹ گئی۔

اس نے یاد کیا کہ ایک بار وہ چھوٹے کے ساتھ مری گئی تھی۔ سردیوں کا جوبن تھا لیکن اس میں ابھی گئی جوانی کا اتنا زور ضرور باقی تھا کہ ٹھنڈ کی شدت کو سہار سکے۔ اس نے یونہی باتوں میں اس حسرت کا اظہار کیا تھا کہ زندگی میں اتنا کچھ دیکھنے کے باوجود اس نے کبھی برف پڑتے نہیں دیکھی۔ چھوٹے کے پاؤں میں تو پہلے ہی بلیاں بندھی تھیں، یہ سننا تھا کہ جھٹ ماں کو بھی ڈال چاخ چاخ دو پاریاں لیں اور مری جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اگلے ہی روز اس نے ایک دوست سے اس کی کھٹارہ کار مانگی اور ناں ناں کرتی ماں کو کار میں لادیہ جا اور وہ جا (ہائے چھوٹے!۔۔۔ ماں صدقے، جانے تو اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگا؟)

وہ رات مرادوں والی تھی کہ اس رات مری میں خوب برف پڑی۔ جب برف کے گالوں نے کھڑکی کے شیشوں کو نرمی سے تھپتھپایا تو اس نے بھاگ کر کھڑکی کھول دی۔ اس کے سامنے طلسمی دھاگوں سے بنا ہوا ایک منظر پھیلا ہوا تھا، مال روڈ کے کالے آسمان کے بیک ڈراپ میں روئی کے چھوٹے چھوٹے گالے اترتے اور زرد روشنیوں کی مہین کرنوں میں پروئے جاتے تھے۔ اس کی آنکھوں نے اتنا بھرپور حسن کبھی نہ دیکھا تھا سو وہ پاگل ہو اٹھی۔ اس نے پلٹ کر چھوٹے کو دیکھا جو دن بھر کی ڈرائیونگ سے ماندہ سویا پڑا تھا، وہ سدا کی ڈرا کل اسے سویا چھوڑ کر اکیلی ہی سیڑھیاں اتر کر مال پر نکل گئی۔ وہاں اس جیسے اور بھی بہت تھے، گرم میدانوں کے باسی جو برف دیکھنے کی چاہ میں اپنے گرم بستروں سے نکل پڑے تھے اور اب مارے خوشی کے چیخیں مار رہے تھے اور ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک رہے تھے لیکن وہ وہاں کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سحر زدہ تھی اور اس کی زبان پر سبحان تیری قدرت کا ورد تھا۔ اس نے دل ہی دل میں چھوٹے کا شکریہ ادا کیا اور رات کے کالے آسمان سے برستے یخ بستہ نور کو اپنی سانسوں میں اتارتی جانے کس سمت چل پڑی۔ یہ تو تب پتا چلا کہ ٹھنڈ کیا ہوتی ہے جب برف اترنا بند ہوئی اور تیز ہوا نے اس کے جسم میں چھریاں اتارنا شروع کر دیں۔ سو ایک ٹھنڈ وہ تھی اور ایک یہ، مگر وہ بھی کیا تھی کہ اس ظالم کی دل آویزی جینے کی امنگ سے بھری ہوئی تھی، ٹھنڈ تو آج تھی جو اپنے ساتھ موت کا سندیس لے کر آئی تھی۔

کیسے ممکن تھا کہ مری کی ٹھنڈ یاد آئے اور چھوٹے کی یاد نہ آئے، اس بہانے اسے تو آنا تھا اور دھڑلے سے اس کے دل کو روندتے ہوئے چلے جانا تھا۔ سو جانے کتنی دیر وہ اپنا دل تھامے، بھیگی آنکھوں چھوٹے کے خیال سے گھائل ہوتی رہی۔

وہ چھوٹی سے بڑا اور باقیوں سے چھوٹا تھا اور ان آٹھ بچوں میں سے پانچویں نمبر پر تھا جو اپنی زندگی کا پانچواں برس پورا کرنے کے بعد بھی زندہ رہے تھے۔ وہ بڑا ہو چکنے پر بھی چھوٹا کہہ کر بلایا جاتا رہا جس پر وہ ہمیشہ طیش میں آیا کرتا تھا، اس کا دوسرا معروف نام مٹھو تھا۔ وہ زور لگا ہارا لیکن کسی نے اسے اصل نام سے پکارنا ضروری نہ سمجھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اصل نام سے پکارے جانے کا مطلب اسے باعزت فرد تسلیم کیا جانا تھا اور پیچ در پیچ وجوہات کی بنا پر کوئی اسے برابری دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ خود بھی اس کے اصل نام کے ساتھ ساتھ اسے مٹھو پکارا کرتی تھی لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ جب وہ مٹھو کہتی تو اس کے منہ میں شیرینی گھل جاتی تھی، وہ بھی جانتا تھا لہٰذا اس نے کبھی ماں کا برا نہیں منایا۔

چھوٹا ایک طرح کا پرابلم چائلڈ تھا۔ اس کی کبھی باپ سے بنی نہ بہن بھائیوں اور نہ کسی اور سے کہ وہ ایک باغی روح تھا جو تراشیدہ راستوں پر سر جھکائے چلنے کی بجائے اپنا راستہ خود بناتا تھا اور اکثر منہ کی کھاتا تھا۔ اس سے پہلے اس گھر میں بغاوت کا علم فرخی کے ہاتھ میں تھا لیکن اس کی بغاوت نظریاتی کی بجائے شخصی بنیادوں پر استوار تھی، چھوٹے کی بغاوت اس کے برعکس تھی اور لامحدود تھی۔ وہ ضدی تھا، سرکش تھا، اپنی کرنے والا تھا، بہت خامیاں تھیں اس میں لیکن اس کی شخصیت کا خام پن اسے نظرانداز کیے جانے کی اہانت سے جنم لیتا تھا، وہ یہ بات سمجھتی تھی یہی وجہ ہے کہ اس گھر میں وہ چھوٹے کے ہونے کا واحد جواز تھی۔

وہ جو بچپن سے تنہا تنہا رہنے کا عادی تھا، جانے کب اور کیوں اس نے اپنی ذاتی بولی ایجاد کر لی تھی اور دوسروں کی بولی بھول گیا تھا، نتیجہ یہ کہ نہ وہ کسی کی بات سمجھتا نہ کوئی اس کی سمجھنے پر تیار ہوتا۔ وہ گھر میں اور گھر سے باہر بیک وقت بے شمار لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ کی حالت میں تھا، اسے سسٹم، مذہب اور سماج سمیت ہر ایک کے ساتھ مسئلہ تھا، وہ بہت سی اندھی دیواروں کے ساتھ ٹکراتا پھرتا تھا جس میں وقت کے ساتھ شدت ہی شدت تھی۔ اکثر گھر میں یہ ٹکراؤ جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر لیتا جس میں ہمیشہ اسے اپنی سادگی کے ہاتھوں مات ہوتی اور وہ اس کی مات پر دکھی ہو جاتی۔ وہ بھی چھوٹے سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہ جنم جنم سے ہاری ہوئی فوج کی سپاہی تھی اور عادی تھی اپنی بغاوت کو خود کچل دینے کی جبکہ چھوٹا اپنی ذات کا پرچم تھام کر چلتا اور بیک وقت سب کے ساتھ آمادہ پیکار رہتا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ چھوٹا اس کے زیادہ قریب رہے اسی لیے وہ بچپن سے ہی اس کے بازار کے پھیروں اور سفروں کا ساتھی تھا۔ اس کی اولاد میں بھی الگ الگ وجوہات کی بنا پر ٹوٹے پھوٹے کھلونے تھے، اپنی خام چالاکیوں کے باوجود ہارے ہوئے اور زخم خوردہ تھے۔ وہ سب کا مرہم بننا چاہتی تھی لیکن ایک چھوٹے کے سوا کوئی اس کا طلبگار ہی نہیں تھا۔

وہ چھوٹے کی باغیانہ طبیعت سے ہمیشہ خوفزدہ رہی تھی۔ جب کبھی وہ بغیر بتائے راتوں کو غائب

ہو جاتا تو وہ اس پر خوب بگڑتی لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ کہ ہر بار اسے لاڈیاں کر کے ٹھنڈا کر دیتا لیکن کرتا وہی جو اس کا من چاہتا۔ آخری دنوں میں اس کی بھائیوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی تو تکار ہونے لگی تھی۔ وہ ڈرے ہوئے تھے کہ چھوٹا خفیہ والوں کی نظروں میں آ چکا ہے اور کسی بھی وقت غائب کر دیا جائے گا، چھوٹا اس بات پر برہم ہوتا کہ انھیں اس کی نہیں اپنی سلامتی کی فکر تھی۔ ایک بار ایسا ہوا بھی کہ چھوٹا بہت سے دنوں کے لیے غائب ہو گیا۔ جس روز وہ گیا اس رات بہت سے سادہ کپڑوں اور درشت چہروں والے کچھ لوگ گھر میں گھس آئے اور سارے گھر کو الٹ پلٹ کر چلتے بنے۔ بہت دنوں بعد چھوٹا واپس آیا تو وہ ماں ہونے کے باوجود پہلی نظر میں اسے پہچان نہ پائی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا اور نچلے ہونٹ میں مسلسل کپکپاہٹ اتر آئی تھی۔ اس نے اسے بہت کریدا لیکن جواب میں ایک پھیکی سی مسکان کے سوا کہنے کو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ جب سے واپس آیا تھا اس کی آنکھوں میں ایک ہولا دینے والی ویرانی بس گئی تھی۔ وہ چلتا تو یوں احتیاط سے کہ کہیں اس کا وجود بکھر نہ جائے۔ جب اپنی نوکریاں اور عزت بچانے کی فکر میں مبتلا بھائیوں نے اسے گھر سے چلے جانے کا کہا تو وہ ماں کے پاس آیا اسے خوب پیاریاں کیں اور پھر اپنا سفری بیگ لے کر گلی میں اتر گیا۔

بہت دنوں بعد خبر ملی کہ اس نے خود کو جلاوطن کر دیا تھا اور سرحد پار کر کے نامعلوم دیسوں کو سدھار گیا تھا۔ وہ کبھی کبھار ماں کو خط لکھ کر اپنی خیر خبر دے دیا کرتا تھا لیکن یہ نہ بتاتا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ گھر میں ایک فرخی تھی جو چھوٹے کے لیے دکھی تھی لیکن کب سے ماں کے ساتھ سہیل پنا ختم کر چکی تھی جبکہ چھوٹی دوسرے شہر میں ہوا کرتی تھی سو وہ اپنا غبار دل میں چھپائے تکیے کو سینے کے ساتھ بھینچ کر رو لیا کرتی تھی۔ جب چھوٹے کی جانب سے خاموشی کے وقفے میں طوالت آئی تو اس نے کرلا کرلا کر بڑوں کو اس کا پتا چلانے پر مجبور کیا، انھوں نے تو خیر کچھ اور بتایا لیکن اسے پتا چل گیا کہ وہ کسی بہ فیلے ملک کی جیل میں ہے اور اسے باہر نکالنے والا کوئی نہیں۔

وہ دیر تک بے حس سی پڑی آکسیجن کی سوں سوں سنتی رہی۔

’’کیا میں اسے دیکھے بغیر ہی چلی جاؤں گی؟‘‘

اس کے دل پر کٹاری سی چلی جس سے اسے اپنی پیش گفتہ موت کے خلاف بغاوت کا جواز مل گیا۔

تب اس پر ایک گیان اترا اور اس نے ماسک اتار کر یخ بستہ ہوا میں گہرا سانس کھینچا۔

وہ اپنے مٹھو کو ایک نظر دیکھے بغیر کیسے جا سکتی تھی۔

اسے ضرور آج رات جاگ کر گذارنا تھی تاکہ وہ اس صبح کا سورج دیکھنے تک زندہ رہے جس نے چھوٹے کی واپسی کی نوید لے کر طلوع ہونا تھا۔

اس نے ایک عزم کے ساتھ زور لگا کر لحاف اپنے گرد کسا تو اس زور آزمائی کے نتیجے میں اسے تھوڑی دیر کے لیے پھر سے گیس کا ماسک منہ پر چڑھانا پڑا۔

ایک کمبل اگر اور مل جائے۔ اس نے یاد کیا کہ کیا گھر میں کوئی اور کمبل بھی موجود ہے۔ دماغ پر تھوڑا زور دینے پر یاد آ گیا کہ لحافوں والی پیٹی کے دائیں کونے میں کھیسوں کی تہہ کے نیچے پرانے سویٹروں کی اون سے بنا جانے کن زمانوں کا کمبل دھرا ہوا پڑا ہے۔ اگلا مسئلہ یہ کہ چھوٹے سے سٹور میں دھری پیٹی کو اس وقت کون کھولے اور کون کمبل نکال کر اس پر اوڑھائے۔ چھوٹی بیچاری دن بھر کی ماندی گہری نیند سوئی پڑی ہو گی، وہ خود جاگے تو جاگے کوئی اور تو اسے نہ جگائے۔

کیا کیا جائے؟

تبھی ایک دھڑاکے سے دروازہ کھلا اور کمرہ سائبیریا سے آنے والی ہواؤں سے بھر گیا۔ اب کے کھانسی جو چھڑی تو وہ کھانستے کھانستے بے دم ہو گئی۔ اسی بے دم ہونے کی حالت میں وہ زندگی کی دہلیز سے باہر جا پڑی تھی۔ جانے کتنے پہر وہ ہوش سے بیگانہ پڑی رہی لیکن جب رفتہ رفتہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی تو دیکھا کہ رات وہیں کی وہیں تھی اور ہوائیں شائستگی سے دروازہ بند کر کے اپنے وطن لوٹ چکی تھیں البتہ ایک کاٹ تھی جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ کھانسی کے دورے کے دوران اس کے منہ سے لوتھڑا سی بلغم نکل کر بستر پر جم گئی تھی۔ اس نے ایک کراہت اور شرمندگی کے احساس سے رومال نکال کر بستر کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور سلنڈر کی ناب کھول کر منہ پر ماسک چڑھا لیا۔

اب کے اسے غنودگی نے اپنی آغوش میں لیا تو قدرے راحت سی محسوس کرتے ہوئے دماغ پھر سے آوارگی پر نکل کھڑا ہوا۔

”آ چھو تو شاید سویا پڑا ہو گا اس وقت، جانے مرن جوگی فرخی اس کا خیال بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ جب وہ پچھلی بار آیا تھا تو چوچا سا منہ نکلا ہوا تھا اس نے۔ اب کوئی اسے کیسے سمجھائے کہ اتنا غم نہ کھایا کرے، دھی پتر نصیب کی بات ہے، اللہ کے معاملے اللہ پر چھوڑ دے لیکن جو سب کو سمجھا کر بیٹھے، اسے کون سمجھائے؟ ۔۔۔ اور وہ اجو؟ شوہدیا تو ایک بار ماں کے پاس تو آ پھر دیکھ ماں کیسے تیرا دل ٹھنڈا کرتی ہے۔ یہ غلطی بھی تو میری ہے، میں نے ان دونوں پر سوتن جیسی بیویاں لا دی ہیں اور ان کی نکیل ان کمینیوں کے ہاتھ میں دے دی ہے۔“

اس کا لحاف سے باہر نکلا ہاتھ برف سا ہوا تو اس نے اندر کھینچ کر رانوں میں دبا لیا۔

”وے آ چھو، وے اجو! بھیڑیو تمھیں اپنے نکے ویر کا ذرا بھی خیال نہیں؟ تم دونوں اتنی شان والے

ہو، اتنے بڑے بڑے لوگ تمھاری میل جول والے ہیں، اگر تم دونوں بھاگ دوڑ کرو تو مٹھو کا اتا پتا کیوں نہ چلے اور وہ واپس کیوں نہ آئے؟۔۔۔ ہیں وے! سنا تم نے کہ نہیں؟ اس بدنصیب پردیسی کو پردیس سے لانے کے لیے زمین آسمان ایک کیوں نہیں کرتے ہو؟۔۔۔ فرخی تو گئی، میری ہک کا ساڑ، خون تھوکتے تھوکتے مر گئی نصیبوں جلی، ماں سے ملنے نہیں آتے تو نہ آؤ کبھی اس کی قبر پر دو پھول چڑھانے ہی آ جایا کرو۔ اور وہ تمھاری بیویاں نخرے پٹیاں، اللہ پوچھے گا انھیں۔۔۔ اور وہ سب سے بڑی، خیر سے میری پہلی اولاد۔۔۔ دیکھو تو بھلا ہزار میل کا فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہے؟۔۔۔ گھر میں اس کا دل کیسے لگتا ہے، اس کے کلیجے میں تڑپ کیوں نہیں اٹھتی؟ ماں نے کوئی سدا تو نہیں اس کے انتظار میں بیٹھے رہنا۔ بس مہینے دو مہینے خط لکھ دیتی ہے کہ اُفے! شوہر نہیں ملنے دیتا۔ کوئی پوچھے تم اس سے پوچھے بنا دبئی تک تو ہو آتی ہو، چوری چھپے ماں سے ملنے نہیں آ سکتی؟ شوہدی کے جہان وی نہ ہووے۔ تے!"

اس کی یاد کی دھندلی پڑتی سکرین پر ایک ایک کر کے نمودار ہوتی تصویروں اور نا ختم ہونے والے فاصلوں کی تلخی نے اس میں کڑواہٹ بھر دی۔

"اللہ میاں جی! میں کیوں اتنی بدنصیب ہوں کہ میری کوکھ کے جنموں کو تم نے اتنی دور بسا دیا کہ میں ان کی شکلوں کو ترستے ترستے اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔ وہ آئیں گے تو ضرور، دوڑے دوڑے آئیں گے لیکن جب میں ہی نہ رہی تو وہ آئیں آئیں نہ آئیں۔"

کھانسی کے اگلے دورے کے دوران جب وہ حواس سے بیگانہ ہوئی تو اچانک ایک لمحہ کوندا سا لپکا اور نا افق پھیلتا چلا گیا۔ اس ایک لمحے کے پھیلاؤ میں اس نے دیکھا کہ وہ صحن میں نہلائی دھلائی پڑی ہے اور اس کے گرد بہت سے لوگ اکٹھے ہیں، عورتیں غم سے نڈھال ہو رہی ہیں اور ہر ایک کے چہرے پر سخت سوگواری برس رہی ہے۔ ایک جانب آچھو کسی کے ساتھ گلے لگ کر پرسا لے رہا ہے تو دوسری جانب اجو آستین سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ٹینٹ سروس والوں کے ساتھ معاملہ طے کر رہا ہے۔ وہیں کہیں فرخی بھی دو گھڑی جی اٹھنے کی مہلت لیے آئی بیٹھی ہے اور پائنتی بیٹھ کر اپنی آنکھیں ماں کے ٹھنڈے تلووں سے مل رہی ہے۔ چھوٹی بھی وہیں کہیں عورتوں میں گھری بیٹھی ہے کہ اتنے میں باہر رکشہ رکنے کی آواز آتی ہے، یہ سب سے بڑی ہے جو اپنے جوان بچوں کا سہارا لیے غم کی تصویر بنی اندر داخل ہوتی ہے، اس کے چھوٹے بہن بھائی اسے دیکھتے ہیں تو واویلا کرتے اس کی طرف بڑھتے ہیں اور اسے گھیر کر ٹھسکنے لگتے ہیں۔ اس منظر میں اس کے لیے کچھ نہیں دھرا سو وہ نظریں گھماتی ہے۔ ان بہت سے لوگوں میں اسے چھوٹے کی تلاش ہے۔ وہ خوشی سے نہال ہو جاتی ہے جب دیکھتی ہے کہ وہ بھی موجود ہے اور ایک کونے میں سمٹا ہوا سر کو جھکائے کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا ہے، اگلے

لمحے یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھ جاتا ہے کہ چھوٹے کا گلا کٹا ہوا ہے اور اس میں سے رستے خون نے اس کی قمیض کو سرخا رکھا ہے اور پھر وہ یہ دیکھ کر موت در موت مر جاتی ہے کہ کوئی چھوٹے کو اپنے غم میں شریک نہیں کر رہا جیسے وہ کوئی اجنبی ہو اور یونہی رسم دنیا نبھانے کے لیے کہیں سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔

‘‘یا اللہ، ان لوگوں کی نفرتیں اتنی پکی کیوں ہیں، میرے دودھ کی مٹھاس ان کے باپ کی کڑواہٹ پر کیوں غالب نہ آسکی؟’’

بچوں کے باپ کا خیال آتے ہی اس نے یہاں وہاں دیکھا لیکن ہمیشہ کی طرح وہ ان میں نہیں تھا، وہ ضرور آیا ہوگا فرض کی طرح دو گھڑی جینے کی مہلت پا کر۔ اس نے اس کی تلاش میں باہر نکل کر دیکھا تو وہ بیچ میں موجود تھا لیکن گلی میں بچھی کرسیوں پر بیٹھا ہوا، اپنے چہرے پر دائمی ناراضگی لیے، سب سے لاتعلق جیسا کہ وہ زندگی بھر رہا تھا۔ اسے وہاں دیکھ کر اس کا دل ڈوب سا گیا اور وہ واپس اپنی چارپائی کے پاس آموجود ہوئی۔

بس ایک لمحے بھر کا پھیلاؤ تھا جو کھانسی کے دوران اس کے حواس مختل ہونے پر ایک کوندا سا لپکا اور اپنے پیچھے ایک گہری تھکن چھوڑ گیا تھا۔ وہ حواس میں واپس آئی تو اوندھے منہ پڑی تھی، اس نے خود کو جتن سے سیدھا کیا اور بستر پر ڈھ سی گئی۔ کھانسی کے دورے کے دوران اس کی بہت سی جان خرچ ہو چکی تھی لیکن دماغ تھا کہ پہلے کب ایسے جگا ہوگا۔ اس نے مصنوعی آکسیجن کی مدد سے تھوڑا سنبھالا لیا تو فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو چھوٹی کو بلا لیا جائے۔ وہ آئے تو اس پر کمبل ڈال دے، گرم گرم یخنی پلا دے، لیکن وہ آئے تو کیسے؟ اس کی پکار تو دہلیز پار کرنے سے رہی اور جسم میں اتنی جان نہیں کہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائے اور اسے جھنجھوڑ کر جگا دے۔

اس نے پلٹ کر گھڑی کی طرف دیکھا، سرخ چمکتے ہوئے ہندسے گھنٹہ بھر آگے بڑھ چکے تھے، یعنی رات ابھی بہت سی باقی تھی۔ تب اسے خیال آیا کہ ایسا نہ ہو کہ جب چھوٹی رات کے کسی پہر آئے تو کچھ بھی نہ باقی رہا ہو اور وہ ساری عمر اس افسوس میں گذار دے کہ اس نے ماں کو اکیلا کیوں چھوڑ دیا تھا۔

‘‘نہیں، یہ چھوٹی کے ساتھ ظلم ہوگا۔ آخر ایک وہی تو ہے جو دو ڈھائی سال سے میرے گوڈے کے ساتھ لگی رہی ہے، کیا میں اسے عمر بھر کے افسوس کے حوالے کر کے جاؤں؟ اسے بلانا تو ہوگا اور پھر کیا پتا وہ آئے اور ہونی کو ٹال دے۔ ہونی کو کیوں نہیں ٹالا جا سکتا کہ کیا پتا آج رات کے بارے میں جو میں نے سوچ رکھا تھا وہ نرا وہم ہی ہو۔’’

اس کے دماغ نے زندگی کے امکان کو تلاش کیا تو وہ جینے کے لالچ میں آ گئی۔

‘‘اگر میں نہ رہی تو یہ گھر کیسے چلے گا؟’’

کچھ بھی ہو اسے زندہ رہنا ہوگا کہ ابھی بہت کاج پڑا تھا جو صرف وہی کر سکتی ہے۔

کمرے کی سیال دیواروں پر کٹیلی ہواؤں کے ایک اور جھکڑ نے حملہ کیا تو اسے لگا جیسے وہ موت سے پہلے مر جائے گی اور آسانی سے نہیں، جیسا اس نے خود کی تسلی کے لیے سوچ رکھا تھا، بل کہ شاید کسی جھکڑ کے ایک دھکے سے وہ سرد جہنم میں جا گرے گی اور اس کی اتھاہ گہرائیوں میں برہنہ بدن برف کے کوڑے کھانے کا عذاب اس پر ہمیشہ ہمیش کے لیے نازل ہو جائے گا۔

اب کے اس کی سانس اکھڑی تو اس نے چاہا کہ لحاف میں سے ہاتھ نکال کر آکسیجن والا ماسک چڑھا لے لیکن ہاتھ نے جنبش کرنے سے انکار کر دیا، انگلیوں کی پوروں سے کندھے تک اس کے دائیں بازو میں اکڑ اوُ اتر آیا تھا، شاید اس لیے کہ وہ کافی دیر تک دائیں جانب کروٹ لیے لیٹی رہی تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کر کے کروٹ لی اور چت لیٹ گئی پھر اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے دائیں ہاتھ کو اٹھایا اور رانوں کے درمیان دبا لیا جو اس کے جسم میں واحد ایسی جگہ تھی جہاں قدرے حدت باقی تھی۔ دائیں بازو کی رگوں میں خون کی روانی ہوئی تو اس ہاتھ کی انگلیاں جنبش کرنے کے قابل ہو گئیں اور اسے اطمینان ہوا کہ ابھی اس کا بازو مردہ نہیں ہوا ہے لیکن کب تک؟ کمرے کی سیال دیواریں کٹیلی ہواؤں کے پے در پے حملوں کو روکنے میں ناکام ہو چکی تھیں۔ کچھ دیر گذرتی کہ وہ سردی سے اکڑ کر مر گئی ہوتی۔ وہ جو اپنے ناگزیر ہونے کا سوچ کر اس میں پھر سے جی اٹھنے کا لالچ پیدا ہوا تھا اب موت کے خلاف اس کی مدافعت کا بہانہ بن گیا تھا۔

”پیٹی میں جو کچھ پڑا ہے اگر اس پر لا دو دیا جائے اور یخنی یا قہوے کا ایک گرما گرم کپ پینے کو مل جائے تو جینا کیا مشکل ہے۔“، اس نے سوچا اور پھر سے چھوٹی کو بلانے کا حیلہ کرنے کا سوچا۔

”چلو آواز تو دی جائے، کیا پتا وہ خود یا اس کا خوند اتفاق سے یہیں کہیں ہوں۔“

شاید یہ اتفاق ہی ہو کہ جب وہ یہ سوچ رہی تھی اس کے کمرے سے ملحق ٹی وی لاؤنج میں کوئی کھٹ پٹ سی سنائی دی اور ایک ناگوار خیال نے اس کے منہ کی کڑواہٹ میں کچھ اور اضافہ کر دیا:

”اوہ! تو وہ پہلے سے ہی یہاں منڈلا رہا ہے۔“

چھوٹی کا شوہر خاندان بھر کا چہیتا تھا کیوں کہ دوسروں کے خیال میں اس نے پہلے بڑی بہن اور پھر ماں کی خاطر قربانی دی تھی اور دوسرے شہر سے اس شہر میں اپنا تبادلہ کرا لیا تھا تاکہ چھوٹی گھر کو ڈسٹرب کیے بغیر ماں کے پاس رہ سکے۔ اس نے کیا بھی یہ کہ سارا بندوبست اپنے ہاتھ میں لے کر گھر کا بڑا بن بیٹھا تھا۔ ماں کی دوا دارو، گھر کے چھوٹے موٹے مسائل، آنے جانے والوں کی خاطر داری اور گلی محلے میں گپ شپ کے تعلقات، اس نے وہ سب کام اپنے ہاتھ میں لے لیے جو ایک مرد ہی کر سکتا تھا اور اس سیاپے سے کہ گھر واقعی گھر جیسا دکھنے لگا تھا۔ اس کی اس لازوال قربانی نے اپنے اپنے محفوظ ٹھکانوں میں بیٹھے چھوٹے بڑوں کو ممنون

احسان کر رکھا تھا۔ خاص طور پر بڑا آچھو تو اپنے چھوٹے بہنوئی کا گرویدہ تھا کہ اگر وہ نہ ہوتا تو اس کے احساس ندامت میں جانے کتنا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ خود ساس کے ساتھ بھی اس کا رویہ عام طور پر فدویانہ نہیں تو ہمدردانہ ضرور تھا۔ دور کا رشتے دار ہونے کے تئیں وہ اکثر ماں کے پاس آ بیٹھتا اور دوسرے رشتے داروں کی چغلیاں لگا لگا کر اس کا دل بہلایا کرتا تھا۔

اس میں سے کوئی برائی تلاش نہ کر پانے کے باوجود ماں اس کی موجودگی میں بے چین سی ہو جاتی، وہ کوشش کرتی کہ اس کے ساتھ اس کا کم سے کم سامنا ہو۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے من میں میٹھی چھری کے نام سے یاد کرتی کہ اس نے جان لیا تھا کہ اس کے لہجے کی مٹھاس خود غرضی کے زہر سے کشید کی ہوئی تھی اور دراصل وہ اس کی موت کا انتظار کر رہا ہے تا کہ اس گھر پر سہولت کے ساتھ قبضہ کر سکے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے مرتے ہی جب وہ اپنے اصل روپ میں سامنے آئے گا تو اس کی بیوی سمیت اس کا کلمہ پڑھنے والے اس کی اصلیت کو جان کر حیران رہ جائیں گے۔ اسے خیال آیا کہ یہ جو اس میں اپنی پیش گفتہ موت کو جل دینے کا خیال پیدا ہوا تھا اس کی ایک وجہ اس گھر کو چھوٹی کے شوہر کے ناپاک ارادوں کا ناکام بنانا بھی تھا۔

’’اچھا ہے میری آواز پر وہی آئے اور دیکھ لے کہ ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔‘‘

اس نے چہرے سے لحاف سرکایا اور بستر کے گدے میں اپنی کہنیاں گاڑ کر تکیے کی ٹیک کے سہارے بیٹھنے کے قابل ہو گئی۔ اس سخت جد و جہد کے بعد اس نے منہ پر ماسک رکھ کر چند گہرے سانس لیے اور پھر سلنڈر کی ناب بند کر کے آواز دینے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کی:

’’چھوٹی!‘‘

شاید گلے میں کچھ پھنس گیا تھا کہ کوشش کے باوجود اس کی آواز نہ نکلی۔ اس نے اس بار زیادہ زور لگا کر آواز دی لیکن منہ سے ایک بے معنی آواز کے سوا کچھ نہ نکلا، تیسری بار اور پھر چوتھی بار، وہ اسے آوازیں دیے گئی اور پھر ایک دہشت ناک خیال نے اسے لرزا دیا، اس خیال سے رہائی پانے کے لیے وہ ایک جنون کے عالم میں اپنے حلق میں پھنسے الفاظ کو نکالنے کے لیے زور لگانے لگی لیکن وہی غوں غوں جیسی مہمل آواز۔ اس نے اپنی ساری توانائی خرچ کر دی اور پھر ہار کر نڈھال سی بستر پر گر گئی۔

اس کی آواز مر چکی تھی۔

زیادہ دیر نہیں گذری جب چھوٹی اس کے پاس بیٹھی تھی، تب تو وہ چھوٹی سے اچھی بھلی باتیں کرتی رہی تھی۔ اس نے چھوٹی کو اپنے بلاوے کا تو نہیں بتایا لیکن اپنی صحت کی خرابی اور اداسی کے بہانے اسے بڑی اور دونوں بڑوں کو فون کر کے فوری بلانے پر اصرار کیا تھا۔ چھوٹی نے خبری سلا کہہ کر اس کی بات کو روا روی میں

لیا تھا جس پر وہ جھنجھلائی تو چھوٹی کو وعدہ کرتے ہی بنی کہ کاموں سے فارغ ہونے پر وہ تینوں کو فون کر دے گی۔ سو جب وہ چھوٹی سے باتیں کر رہی تھی تب تو اس کی زبان میں بڑی روانی تھی، اب اچانک کیا ہو گیا تھا؟

اس کی پیش بینی میں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ جسم کی موت سے پہلے اس کی آواز کو موت آ جائے گی۔ اس نے ساری عمر بے بسی کی حالت میں بسر کی تھی لیکن ایسی بے بسی تو کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہ اپنے ہی گھر میں مددگاروں کی موجودگی کے باوجود تنہائی اور لاچارگی کی موت سے ہمکنار ہو گی۔ اس نے جینے کے امکانات کو ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو آنسوؤں کی ایک دھار اس کے پچکے ہوئے گالوں کو بھگو گئی۔

”صرف اایک کمبل اور گرم مشروب کا ایک کپ، کیا پتا میں جی اٹھوں۔“

موت کی سرحد پر کھڑے جو اسے اپنے ناگزیر ہونے کا احساس ستانے لگا تھا، آواز کے گم ہو جانے کے بعد اس میں شدت آ گئی تھی۔

ابھی کتنا کچھ باقی تھا منتوں سے مانگے آ چھوکی نرینہ اولاد کے لیے ایک اور منت، اجو کے دل کو نرمانے اور منانے کا ایک اور جتن اور پھر مٹھو جو اس کے دل کا گہرا بھیٹ تھا اور اس وقت جانے کن برفیلے ملکوں میں کس قید میں پڑا ہو گا یا کہیں ہو گا بھی یا۔۔۔ اس کا دل اچانک مٹھی میں آ گیا اور وہ دیر تک کچھ سوچنے کے قابل نہ رہی۔

تب اسے ایک شک گذرا کہ کیا واقعی وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں، ہڈیالے کندھوں کو دبایا، گردن، سینہ، پیٹ، ٹانگیں اور پاؤں سب کو باری باری ٹٹولا اور جانا کہ اس کا پورا جسم ابھی تک زندہ تھا، دماغ بھی یقیناً زندہ تھا کہ وہ سوچ سکتی تھی، کڑھ سکتی تھی اور اپنی بے بسی پر رو سکتی تھی۔

”چھوٹی پتا نہیں کب جگے۔“ اس نے مایوسی سے سوچا ”لیکن وہ ٹی وی لاؤنج سے سنائی دینے والی آہٹ؟“

اگر الفاظ نہیں تو پیغام دینے کا کوئی اور وسیلہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر نظر کی۔ وہاں چند شیشیاں پڑی تھیں اور ایک شیشے کا گلاس جس کے ساتھ کھانے کا ایک چمچ رکھا تھا۔ اسے سوجھی تو اس نے اپنے لرزتے ہاتھ میں اپنی بدن کی کل توانائی سمیٹی اور چمچ اٹھا کر ٹن ٹن گلاس پر بجانے لگی۔ چمچ دیر تک گلاس سے ٹکراتا رہا لیکن اس سے نکلنے والی آواز نا شنیدہ رہی۔

اسے بچپن میں پڑھی اور سنی سنائی کئی ایسی کہانیاں یاد آئیں جو جینے کی جدوجہد پر مبنی تھیں، ہر کہانی

میں زندگی کی ناممکن اور مایوسانہ جدوجہد کے بعد ہیرو کو اچانک غیبی امداد مل جاتی تھی اور وہ اپنوں میں پہنچ کر ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگتا۔ وہ کسی داستان کا عنوان نہ سہی پر کیا اسے غیبی امداد نہیں مل سکتی؟ اگر چھوٹی کی نیند نہ ٹوٹے تو ایسا کیوں ممکن نہیں ہو سکتا کہ گھر بیٹھے اچانک آچھو کو کوئی اشارہ ملے اور وہ تڑپ کر چار کپڑے بیگ میں ٹھونسے اور گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دے یا اسی شہر میں رہتے ہوئے اجو کو اچانک ندامت گھیر لے کہ وہ صرف مکان سے حصہ نہ ملنے اور اپنی بیوی کی لگائی بجھائی میں آ کر اس دھاگے کو توڑ بیٹھا ہے جو ماں کے دل کے ساتھ بندھا ہوا تھا، یا۔۔۔ یا (اور اس امکان پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آنے لگا) کسی بد فیلے ملک میں مٹھو کو جیل میں ڈالنے والے بدمعاشوں کے دل میں اچانک رحم جاگ اٹھے اور وہ اس بدنصیب کو جیل سے نکال کر جہاز میں سوار کرا دیں کہ جاؤ تمھاری ماں تمھارا انتظار کر رہی ہے۔

ان میں سے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا اور پھر کیا ناممکنات صرف ماؤں کے لیے ہی رہ گئے ہیں؟

اس نئے خیال کے بعد اب امکانات کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا سو اس کی سماعت نے چھوٹی کے قدموں کی چاپ سے دھیان ہٹا کر ڈور بیل کے ساتھ تعلق جوڑ لیا۔ وہ انتظار کرتی رہی اور خود کو یقین دلاتی رہی لیکن دروازے پر کوئی گاڑی رکی نہ بے تابی سے گھنٹی بجی۔ اسے یہ خیال بھی گذرا کہ کہیں آواز کے ساتھ سماعت بھی نہ مر گئی ہو لیکن اگلے لمحے اس نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ جب وہ چمچ سے گلاس کو بجا رہی تھی تو اس کے کان صاف ٹن ٹن کی آواز سن سکتے تھے۔

ہیجان کی حالت دیر تک چلی تو اس کے لیے سانس کھینچنا مشکل ہو گیا۔ اس نے پھر ہمت کی اور اپنے ہاتھ کو گھسیٹ کر سلنڈر تک لے گئی اور ہاتھ کی محتاط جنبش سے اس کی ناب کو کھول کر ماسک کو منہ پر چڑھا لیا۔ آکسیجن گیس کی کیف آور سوں سوں نے اس کے سینے کے مدوجزر کو ہموار کرنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ غنودگی میں اترنا شروع ہو گئی۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر خود کو جگائے رکھنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ دیر نیند سے لڑتی رہی پھر بے ارادہ ایک کیف کی کثیف گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔

اس نے دیکھا کہ اس خواب آگیں کیف کی تھاہ میں ایک شہر تھا جس کی گلیاں ہتھیلی کی لکیروں کی طرح ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔ وہ ایک بہاؤ میں گلی گلی تیرتے ایک بند گلی میں داخل ہو گئی، یہیں ایک گھر تھا جو بے دیوار اور بے در تھا۔ اس گھر کے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے صحن میں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بہت سے راستے بنے ہوئے تھے، ان میں سے ہر راستہ نامعلوم سے نامعلوم کی جانب جاتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس گھر میں کچھ لوگ تھے۔ ایک ڈھلتی عمر کا مرد تھا جس کے گورے چٹے بارعب چہرے پر تجی سرخ داڑھی اس پر خوب پھب رہی تھی، اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی رانگلے پایوں والی چارپائی کے بے شکن اور

بے داغ بستر سے اترا اور کچھ دور بیٹھ کر ہاتھ میں جگر جگر کرتا پیتل کا لوٹا لے کر وضو کرنے لگا۔ وہیں ایک چھوٹی عمر کی لڑکی تھی جو منہ سر پر دوپٹا درست کیے صحن میں بنے چولہے پر دیگچا چڑھائے گیلی لکڑیوں میں آگ دھکانے کی کوشش میں دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی فرش پر ایک کتاب کھلی پڑی تھی، وہ چولہے میں پھونکے مارتے ہوئے اپنی آنکھیں پونچھتی اور ایک نظر کتاب پر بھی ڈال لیتی تھی۔ شاید وہ سکول میں پڑھتی تھی اور سکول کی پڑھائی اور گھر کے کام کاج کے درمیان توازن قائم رکھنے کی کوشش میں مبتلا تھی۔ صحن میں کچھ ہی دور دو کم سن بچے کفن میں لپٹے ہوئے ساتھ ساتھ پڑے تھے اور ایک عورت جو اس مرد کی بیوی اور ان بچوں کی ماں ہو سکتی تھی ان کے پاس بیٹھی بین کر رہی تھی۔ اچانک وہ عورت پلٹ کر لڑکی کو دیکھتی ہے پھر اس پر چلاتے ہوئے جھپٹتی ہے اور کتاب اٹھا کر چولہے میں ڈال دیتی ہے لڑکی رونا شروع کر دیتی ہے۔ اس پر مرد اپنا وضو ادھورا چھوڑ کر بڑھتا ہے اور لڑکی کو سینے سے لگا کر خود بھی رونا شروع کر دیتا ہے۔

وہ جو کیف کی کثافت میں بہتی ہوئی اس گھر میں داخل ہوئی تھی کچھ فاصلے پر کھڑی اس ابسرڈ منظر کو دیکھتی رہتی ہے۔ تبھی اچانک ایک آندھی اٹھتی ہے اور گیلی لکڑیوں سے اٹھتا دھواں ایک دیو کی شکل دھار لیتا۔ اس نے دیکھا کہ دیو کے بڑے سے سر پر ایک ننھا سا سہرا بندھا ہوا تھا اور گلے میں گوٹے تلے والا ایک ہار جھول رہا تھا۔ وہ چولہے کے پاس خوف سے منجمد لڑکی کی جانب دیکھ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ اس کا قہقہہ شاید کوئی سگنل تھا کہ اسی آن بہت سے شتونگڑے اپنے گلوں میں اسی طرح کے ہار ڈالے گاتے بجاتے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر عورت بھی کفنائے ہوئے بچوں کو بھول کر ان میں شامل ہو جاتی ہے اور انھی کی طرح ناچنے اور شادی بیاہ کے گانے لگتی ہے۔

وہ کچھ فاصلے پر کھڑی اس عجیب تماشے کو دیکھتی ہے اور جان لیتی ہے کہ یہاں اس کم سن لڑکی کا بیاہ رچایا جا رہا ہے۔ تب مرد آگے بڑھتا ہے اور دیو سے گلے ملتا ہے اور لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔

اچانک وہ دیکھتی ہے کہ وہ کمسن لڑکی غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ وہ خود کھڑی خوف سے کانپ رہی ہے۔ تبھی شتونگڑوں کا ہجوم اس کے گرد اکٹھا ہو کر رقص کرنے لگتا ہے، وہ گا رہے ہیں، ناچ رہے ہیں اور اس کا منہ چڑا رہے ہیں اور پھر دیو آگے بڑھتا ہے اور اسے دبوچ کر ویمپائر کی طرح اپنے بڑے بڑے دانت اس کی گردن میں گاڑ دیتا ہے۔ وہ چیختی ہے اور اس عورت اور مرد کو مدد کے لیے پکارتی ہے لیکن دیکھتی ہے کہ مرد اس تماشے سے لاتعلق سا بہت اطمینان سے اپنا ادھورا وضو مکمل کرنے میں مشغول ہو چکا ہے اور عورت ایک سہولت کے احساس کے ساتھ کفنائے گئے بچوں پر بین کر رہی ہے۔ تب دیو قہقہہ لگاتا ہے اور اپنے شتونگڑوں

کی ہمراہی میں اسے گھسیٹتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

ایک کراہ کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ماسک سے نکلتی سوں سوں کی آواز اسے لمحہ موجود میں کھینچ لائی۔ اسے خود کو، کمرے کے ماحول اور اپنی کیفیات کو جاننے میں تھوڑی دیر لگی۔ وہ چت لیٹ کر چھت سے لٹکتے پنکھے کے ساکت پروں کو گھورتے ہوئے اس بارہا کے دیکھے ہوئے خواب کی گرفت میں تھی۔ اس خواب اور اس کے نتیجے میں حملہ آور ہونے والے یادوں کے غول بیابانی نے اس طرح اسے گھیر لیا تھا کہ وہ اپنا ناگزیر ہونا اور موت سے لڑنا بھول گئی۔ کچھ یوں ہوا کہ ناگزیریت کے جواز کو تھامے پیش گفتہ موت کے ساتھ دوبدو لڑنے والی ماں خواب کے دوران ہی کہیں چپ چاپ مر گئی تھی۔ اس کی جگہ اس سرد جہنم میں جھلستی ایک نیم جان عورت رہ گئی جو بدتہذیب شتونگڑوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔

وہ اپنے ہونے کے احساس سے ماورا خالی ذہن کے ساتھ کمرے میں اس جگہ کو گھورتی رہ گئی جہاں سال دو سال پہلے اس شخص کی چارپائی بچھی ہوتی تھی جس کے ساتھ وہ کم عمری میں بیاہی گئی تھی اور جسے اپنا خون پلاتے ہوئے اس نے ساری عمر کاٹ دی تھی۔ اس ان گھڑ اور دائمی طیش میں مبتلا شخص کے ساتھ جڑی ان گنت یادیں شتونگڑوں کا روپ دھار کر اس کے گرد گا رہی تھیں، ناچ رہی تھیں اور اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔

ماں کی حالیہ افسوسناک موت نے اس عورت کو کچھ دیر کے لیے دوبارہ زندہ کر دیا تھا جو اپنی زندگی کا پہلا سانس لیتے ہی مر گئی تھی۔ اس کے لیے کہرے کی یخ بستگی میں بھیگتی گلی میں قدموں کی کوئی چاپ نہ تھی جبکہ سائیکل کی گھنٹی بجے دیر ہو چکی تھی۔

وہ ایک ہاری ہوئی ناتواں عورت خالی آنکھوں ان شتونگڑوں کو تکتی رہی جو اپنی لال زبانیں نکال کر اس کا منہ چڑا رہے تھے شور مچا رہے تھے اور ناچ ناچ بے حال ہو رہے تھے۔

اس ناگزیر بلاوے کی منتظر پامال عورت کے لیے اس رات کا سورج دیکھنا قطعی طور پر ایک بے معنی خواہش تھی۔

جب سیال دیواروں سے ٹکراتی برفیلی ہواؤں نے ایک دھڑاکے سے دروازہ کھولا تو شتونگڑوں کا شور ان ہواؤں کے شور میں ڈوب گیا۔

تب اس نے در و دیوار پر بھرپور نگاہ کی پھر گیس ماسک کو اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور لحاف کو سر پر کھینچ لیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

افضل مراد

دُزدیدہ

اگلے موڑ تک آتے آتے اُس کی شاطر اور مکار نگاہیں میرا پیچھا کر رہی تھیں......!!!

اب تو یہ روز کا معمول بن گیا تھا گھر، دفتر، بازار حتیٰ کہ لائبریری جاتے ہوئے بچوں کے ساتھ پارک میں گھومتے ہوئے بھی شہر کی تیز رفتار سڑکوں پر کسی سگنل کی سُرخ بتی کے جلنے اور بجھنے کے وقفے میں بھی ہر وقت اُس کا منحوس چہرہ میرے سامنے ہوتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے کسی نہ کسی مصروفیت کی اداکاری کرنے لگتا، میں اسے یہ تاثر دیے بغیر کہ وہ میری حرکات سکنات پر نظر رکھے ہوئے ہے، بغیر آگے بڑھتا، اور دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے کہ وہ میرے نظر انداز کیے جانے پر اندر سے کڑھ رہا ہوگا، دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے الجھن ہو رہی ہے اور میں اُس کی نگرانی، توجہ یا مخبری کو کوئی معنی نہیں دے پا رہا، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے اب وہ دھیرے دھیرے میرے اعصاب پر سوار ہو رہا ہے۔ کبھی اسے دیکھتے ہی مجھے غصہ آجاتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ رُک کر اس سے پوچھوں کہ بھائی تمھارا مسئلہ کیا ہے۔۔۔ تم کس کے لیے کام کر رہے ہو۔ کس نے تمھیں میری خبر رکھنے پر مامور کیا ہے، اور یہ کب تک ہوتا رہے گا۔

مجھے عجیب سے خدشات نے گھیرے رکھا میں اپنی عمرِ رفتہ کی کتاب کھولے ورق گردانی میں مصروف رہا تا کہ اس بات کا جائزہ لے سکوں کہ ایسا کون سا کام، کون سی حکم عدولی یا کون سا جرم ہوا ہوگا جس کی پاداش میں میری مخبری ہو رہی ہے۔ میرے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، لکھنے پڑھنے کی نگرانی شروع ہو گئی ہے۔ اس الجھن نے میری طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا اور میری پیشہ وارانہ کارکردگی خاصی متاثر ہوئی لیکن کسی کو یہ صورت حال بتانے سے قاصر تھا، یا شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وقت آنے پر مجھے اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے نتائج اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔

اب تو وہ میرے گھر تک بھی پہنچ گیا تھا۔ بالکونی پر آ کر جب میں ابھرتے سورج کو دیکھنے اور تازہ ہوا میں سانس لینے آتا تو اسے ایک کونے میں کھڑا اپنی نگرانی پر مامور پاتا ......لیکن اسے یہ احساس نہ ہونے دیتا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ بہر حال اب شک کا یہ آسیب یقین کے اژدھے میں بدل چکا تھا کہ یہ بد بخت

میری مخبری پر تعینات ہے......!

میں ایک لاابالی اور لاپرواسا شخص رہا ہوں اپنے لکھنے پڑھنے میں کبھی احتیاط سے کام نہیں لیا، جو لکھا، جو کہا اُس پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی اور کوشش کی کہ لوگوں کو حالات سے باخبر رکھا جائے۔ میں کبھی کسی کے سامنے جواب دہ نہیں رہا سوائے اپنے ضمیر کے......میں نے ہر موقع پر جو بہتر سمجھا وہ لکھا......طبیعت کی اس بے باکی اور جرات کے بدلے میں مجھے ہر سطح پر داد ملتی رہی۔ میرے قلم سے اٹھنے والے شعلے اور زبان سے نکلتی ہوئی چنگاریاں دور تک روشنی پھیلاتی جا رہی تھی۔ یہ ترقی پسند سوچ، یہ روشن خیالی کا لپچا اور سماج کو بدلنے کی خواہش اب میرے مزاج کا حصہ بن گئی تھیں۔ میں نے بے روزگاری، مفلسی اور غربت کے کئی دن گزارے۔ حالات کا مقابلہ کیا اور سرکاری نوکری ملنے تک بڑی تگ ودو کی۔ اب میں ایک اچھی پوسٹ پر کام کر رہا ہوں۔ لیکن میرے اندر کا لکھنے والا اپنا کام کیے جا رہا ہے۔ سرکار دربار کا نوکر ہوتے ہوئے بھی میرا قلم حالات کے جبر کو سامنے لانے میں کبھی نہیں جھجکا جہاں ظلم، ناانصافی یا انسانیت کی تذلیل ہوئی میرا قلم اس کے خلاف اپنی شعلے اگلتا رہا۔

اُس شام جناح روڈ کی لائبریری سے کتابیں لے کر نکلتے ہوئے ایک بار پھر اُس سے میرا سامنا ہوا۔ شدید سردی کے باوجود وہ گاڑیاں صاف کرنے والے نوجوانوں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی گپیں ہانک رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں گاڑیاں صاف کرنے والا ایک وائپر بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ کتنا چالاک ہے۔ یہ تاثر دینا چاہ رہا ہے کہ وہ گاڑیاں صاف کرنے میں مشغول ہے اور اتفاق سے مجھ پر اُس کی نظر پڑی ہے۔ میں اُسے نظر انداز کیے جانے کی اداکاری کرتے ہوئے جوں ہی پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا، مجھے لگا کہ وہ میرا پیچھا کر رہا ہے لیکن میں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے قدموں کی رفتار مزید تیز ہو گئی یک دم وہ میرے کاندھے سے اپنا کاندھا بچاتے ہوئے میرے آگے آ گیا اور بڑی تابعداری سے سلام کرتے ہوئے گویا ہوا: ''صاحب! یہ کتابیں مجھے دے دیں میں گاڑی تک پہنچاتا ہوں آپ کے ساتھ......بہت وزنی لگ رہی ہیں۔''

''رہنے دو......میں اپنا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔''

''صاحب! آپ ناراض نہ ہوں میں تو......میں کہہ رہا تھا کہ آپ کا بوجھ کم ہو......اور......اور بس......''

''تمھارا مسئلہ کیا ہے''

''نہیں صاحب، میں کہہ رہا تھا آپ کی کتابیں......''

میں نے اُس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بادل نخواستہ اُس کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتے ہوئے دوبارہ گاڑی دھونے والے مزدوروں کا حصہ بن گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مجھے اپنا رویہ صحیح اور بروقت لگا۔ سڑک سے گاڑی کو موڑتے ہوئے۔ میں نے بیک مرر میں اسے دیکھا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اچھا موقع تھا اسے بے عزت کرنے کا۔ دو چار تھپڑ رسید کرتا اُس کی منہ پر ...... تاکہ آئندہ وہ میرے سامنے نہ آتا۔ مجھے ٹینس نہ کرتا۔ خیر وہ لمحہ گزر چکا تھا۔ میں نے اُس پر لعنت بھیجتے ہوئے گھر کی راہ لی۔

زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ادب کی دنیا میں بھی خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ کتابوں، نصابوں اور میڈیا کے علاوہ سوشل میڈیا کے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی سامنے آئی۔ لوگ اب کتابوں کے بجائے فیس بک، ٹیوٹر اور وٹس ایپ پر لکھنے پڑھنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔ میں بھی اب اکثر بیشتر اپنے تبصرے اور تحقیقی مواد فیس بک پر اپ لوڈ کرنے لگا تھا۔ جس پر مجھے دور نزدیک کے کئی پڑھنے والوں کی داد ملتی تھی۔

اُس دن شہر میں پہیہ جام ہونے کی وجہ سے میں دفتر جانے کے لیے پیدل نکل آیا تھا۔ کچھ فائلیں بھی جن پر ضروری نوٹس لکھنے تھے اور انھیں ای میل کرنا تھا ساتھ لے کر نکلا تھا گلی کا موڑ مڑتے ہی وہ ایک موٹر سائیکل پر میرے سامنے آیا اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ رک کر مجھے موٹر سائیکل پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے غصے کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ لیکن بھرے بازار میں کوئی ردعمل دیے بغیر میں نے انکار کر دیا۔ وہ اصرار کرتا رہا کہ صاحب آج شہر میں کوئی ٹریفک نہیں ...... بڑا احتجاج ہو رہا ہے۔ آپ بیٹھ جائیں میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔ یہ میرے ایک دوست کی موٹر سائیکل ہے پیٹرول ڈلوانے نکلا ہوں۔ آپ بیٹھ جائیں۔ میں نے گھڑی دیکھی وقت نکلتا جا رہا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی میں موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ میں حیران تھا اس پہیہ جام میں بھی یہ دندناتا ہوا موٹر سائیکل چلا رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں یقیناً اس کے پاس کوئی خاص قسم کا کارڈ ہوگا۔ اس نے میری سوچ کے درمیان دخل اندازی کرتے ہوئے مجھے اور حیران کر دیا۔

’’صاحب! کل آپ نے فیس بک پر بڑا اچھا لکھا تھا ...... یہ ظالم ہر وقت غریبوں اور مسکینوں کا جینا حرام کرتے ہیں آپ نے حکومت کے خلاف بھی سخت لہجے میں بات کی ہے۔ بہت اچھا کیا ہے۔ صاحب۔‘‘

میرا دل پہلی بار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں واقعی اپنے لکھے ہوئے پر گھبرا سا گیا تھا۔ اب میرا شک یقین میں بدل گیا کہ یہ شخص میرے بارے میں ساری واقفیت رکھتا ہے۔ اک اک چیز دیکھتا اور پڑھتا ہے۔ یقیناً یہ ساری باتیں اوپر تک بھی پہنچاتا ہوگا۔ آفس پہنچنے تک میرا گلہ خشک ہونے لگا میں اس کی کسی بات پر توجہ دیے بغیر موٹر سائیکل سے اترا اور اس کا شکریہ ادا کیے بغیر دفتر میں داخل ہوا۔ دفتر میں حاضری بہت کم

تھی۔ میرا ابھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مجبوراً کچھ فائلیں نکالیں اور کرسی پر ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ اب مجھے احتیاط کرنی چاہیے۔ میرے خلاف کوئی فائل بن رہی ہے۔ مجھے اسے فیس کرنا پڑے۔ شاید اس کے نتائج اچھے نہ ہوں۔ میرے بچے، بیوی، میری نوکری اور بہت ساری باتیں سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ احتیاط سے کام لوں گا۔

ورنہ یہ مخبر مجھے لے ڈوبے گا۔

اس سے پہلے کہ وہ ساری صورت حال اوپر تک لے جائے مجھے اس کی خبر لینی ہے۔

پتہ کرنا ہوگا کہ یہ کس لیے کس بنیاد پر اور کس حوالے سے میری مخبری کر رہا ہے۔

میری تحریروں کو جانچ رہا ہے۔ میری عزت اور توقیر، میری سوچ اور روشن خیالی کے سامنے دیوار بن رہا ہے۔

نہیں! لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی اس کمزور سوچ اور لچر خیال پر خود کو لعنت بھیجنے کو جی چاہا۔ میں نے سوچا ......نہیں ......''

''نہیں میں ایسا نہیں کروں گا......''

''میں اپنا قلم نہیں روکوں گا۔'' اپنی تحریروں کے ذریعے روشنیوں کے سفر کو جاری رکھوں گا......اپنا کردار نبھاتا رہوں گا۔

ہاں مجھے لکھنا ہے۔ مجھے اپنے مظلوم اور محروم لوگوں کی آواز بن کر لکھنا ہے۔ چاہے مجھے اس کے لیے کسی مشکل مرحلے سے گزرنا پڑے۔ دار و رسن میرا مقدر کیوں نہ بنیں لیکن میں اپنے قلم سے بے وفائی نہیں کروں گا۔ جان جائے پر مان نہ جائے۔

میں فیصلہ کن انداز میں دفتر سے نکلتا ہوں بیرونی گیٹ کے سامنے اُس کا منحوس چہرہ ڈھونڈتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑتا ہوں۔!!!

بدلتے موسم کے ساتھ ہمارے دفتر کے اوقات بھی بدل گئے تھے۔ میں ۹ بجے کے بعد دفتر پہنچا تو سیکورٹی کے کمرے میں اسے موجود پایا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک خوشگوار تاثر ابھرا میں نے اسے دیکھنے کے باوجود احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے اسے دیکھ لیا لیکن میرا دل دھڑکا ضرور تھا یہ سوچتے ہوئے میں اپنے کمرے میں داخل ہوا کہ اب تو یہ میرے آفس تک پہنچ گیا۔ چپراسی نے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا ''صاحب! آپ کا مہمان ہے بولا صاحب سے بہت ضروری کام ہے'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا: ''بلا لو اسے آج فیصلہ ہو جائے گا۔'' چپراسی میری طرف حیرت سے

دیکھ کر کہنے لگا: ''صاحب کیسا فیصلہ، کس کا فیصلہ'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے باہر بھیج دیا دوسرے لمحے نوجوان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی بڑے ادب کے ساتھ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا چند لمحے خاموشی رہی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں نوجوان میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا ''صاحب! آپ ہمارا ادھر آنے پر ناراض تو نہیں۔''

''میں نے کہا...... میری ناراضگی چھوڑو...... تم اپنا کام بتاؤ......

تم نے یہ جو فائل تیار کی اس کا حال دواس کے بارے میں بتاؤ اب میں مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کوئی بھی حالات ہوں میں نے حق اور سچ کا ساتھ دیا ہے یہ کوئی جرم نہیں ہے''

نوجوان حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں۔

''تم بولتے کیوں نہیں ہو...... ایسے کیوں دیکھ رہے ہوں مجھے۔''

نوجوان اپنے چہرے پر بے چارگی لاتے ہوئے اٹھا اور فائل میرے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا'' صاحب میں اس شہر میں نیا نیا ہوں گاؤں سے آنے کے بعد یہاں پر ایک کرائے کے گھر میں رہ رہا ہوں کافی دنوں سے میں دیکھ رہا تھا اس علاقے میں کون میرے کام آ سکتا ہے میں نے اپنا گھر، دفتر اور سارے دوستوں کا پتہ کیا بس مجھے یقین ہے کہ آپ میرے کام آ سکتے ہوں میں کافی دنوں سے بے روزگار ہوں صاحب یہ میری فائل ہے میں گریجویٹ ہوں اگر مجھے کوئی نوکری دلا سکیں آپ تو......!! آپ ایک مشہور رائٹر بھی ہیں...... صاحب!'' آپ کے پاس قلم کی آواز ہے آپ ہی میرے کام آ سکتے ہیں۔!!!

☆ ☆ ☆ ☆

فرخ ندیم

ایک فٹ کا فاصلہ

پچھلے دنوں میرے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ میں نے بسکوپان کھائی، شام کا وقت تھا، تھوڑی بہت واک کی، مگر درد ختم نہ ہوا۔ اسی درد کے ساتھ گلی کی نکڑ پر ایک جنرل سٹور پہنچا۔ وہاں سے سیون اپ نمک ملا کر پی۔ تھوڑی دیر کے لیے آفاق ہوا مگر پھر وہی درد۔ پیٹ پھولنے لگا۔ ایسے جیسے غبارے میں ہوا بھرتی جا رہی ہو۔ میں نے گلی کے مزید دو چار چکر لگائے۔ تا کہ گیس کا دباؤ کچھ کم ہو لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرے پیٹ سے ٹیسیں اٹھتیں اور دماغ کی شریانوں تک کو ہلا دیتیں۔ میں تھک کر اپنے محلے کے پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہ دسمبر کا آخری ویک تھا۔ یخ بستہ ہواؤں کے چلنے سے سردی شدید ہو چکی تھی۔ جکتر کی طرف سے سیاہ بادل ایسے امڈے جیسے طوفانی سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ جنگلی شہتوت کے سوکھے پتے گرتے پڑتے شور مچا رہے تھے۔ ان تند ہواؤں کے پیچھے ایک دھاڑتا ہوا جھکڑ تھا جس کی کئی میل فی گھنٹہ رفتار سے درخت چاروں طرف جھکتے پھر اپنی جگہ اپنے تنوں پر کھڑے ہو جاتے۔ سارا مارگلہ سلسلہ کالے سیاہ بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ موسم کی مناسبت سے میں نے لباس تو گرم ہی پہن رکھا تھا مگر اس سردی کے سامنے میرے جسم کے مسام جواب دے رہے تھے۔ شام رات میں ڈھلتے دیر نہ لگی اور انسانوں کے ڈگمگاتے قدموں اور پھولتے ہوئے سانسوں سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کسی بڑی آفت سے بچاؤ کی خاطر گھروں میں پہنچنا ضروری ہے۔ درد کی شدت سے بینچ سے اٹھنا محال ہو رہا تھا، مگر میں اٹھا۔ اپنے سے دوگنا بوجھ اٹھاتا، ایسے جیسے لوہے کا بینچ پیٹ میں پیوست ہو گیا ہو۔ میں دہرا ہو کر کراہنے لگا اور دھڑام سے اسی بینچ پر گر گیا۔ پھر تھوڑا سیدھا ہوا تو پیچھے ٹیک لگا کر بلبلانے لگا۔ درختوں کے جھکنے اور پھر اپنی جگہ پر کھڑے ہونے کے عمل سے دنیا میری آنکھوں کے سامنے پھیلنے اور سکڑنے لگی۔ کچھ منظر دھندلائے ہوئے تھے تو کچھ اندھیرے کی اوٹ میں غائب ہو رہے تھے۔ کچھ زیادہ ہی متحرک تھے۔ ان میں ایک متحرک منظر اپنی موت کا تھا۔ ایک مریل سی خود کلامی اور ٹوٹے پھوٹے لفظ، کچھ بے ترتیب سانسیں اور میری سوچیں، کہ اگر مر گیا یہاں، تو پھر کیا ہوگا۔ میرا یہاں تھا ہی کون! ایک اجنبی شہر، اجنبی لوگ۔ میرا گھر! نہیں، اس کو گھر کیسے کہا جا سکتا تھا۔ میرا کرائے کا فلیٹ جس میں دو فرنشڈ کمرے اور ایک کچن ایک باتھ روم شہر کے اچھے فلیٹوں میں شمار ہوتا تھا۔ مگر میں اس کو اپنا گھر نہ بنا سکا۔ گھر بنانے کے لیے ایک

چالیس سال کے مرد کو کیا کرنا چاہیے تھا شاید مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ اپنے گاؤں سے تین سو کلومیٹر دور میں اپنی ہی دنیا میں مگن کئی سال بے معنی سا سود و زیاں تیا کرتا چلا گیا تھا۔ دفتر سے فلیٹ اور فلیٹ سے دفتر، یہی میرا سفر تھا۔ کوشش کے باوجود کچھ ایسا تھا کہ کوئی محرم راز نہ دل وا۔ اس سلسلے میں ایک ماہر نفسیات سے مل چکا تھا۔ سال کے آخر میں مجھے احساس ہوا کہ وہ ڈاکٹر صاحب بھی مجھے دوست سمجھنے کے روادار نہیں۔ مجھے کیا معلوم میری کونسی بیماری ہے لیکن وہ ڈاکٹر صاحب نفسیات کی مشکل مشکل اصطلاحات استعمال کرتے جس سے میرے اعصاب مزید شل ہو جاتے اور میں ان اصطلاحات کا بوجھ اٹھائے فلیٹ پہنچ جاتا۔ بات اس دن ختم ہو گئی جب ماہر نفسیات نے بجلی کے جھٹکوں کو بطور علاج تجویز کیا۔ بجلی کے جھٹکے لگے تو نہیں تھے مگر میں نے حقیقت میں محسوس ضرور کیے۔ ہر رات میں سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر پھونکتا۔ مگر خوابوں میں بجلی کے یہ جھٹکے میرا پسینہ نکال دیتے۔ مارگلہ پہاڑیوں سے بادل نیچے اترنے لگے تو مجھے بجلی کے جھٹکوں سے ڈر لگنے لگا۔ اس بار میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی پوری کوشش کی اور میں کامیاب بھی رہا، اور پیٹ کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ فلیٹ کی طرف چلنا شروع کیا۔ میری دوست، میری کولیگ نیلما اس سطح مرتفع پوٹھوہار پر واحد ہستی تھی جس سے میں اپنے دل کی باتیں کرتا۔ حقیقت اور تصور دونوں میں ہمیشہ وہ میرے ساتھ رہی۔ وادی نیلم کی نیلی آنکھوں والی یہ نیلم پری میرے ساتھ نہ ہوتی تو مغائرت مجھے مار ڈالتی۔ اس نے بتایا تھا کہ شادی شدہ تھی۔ بظاہر خوش اور مطمئن لیکن کچھ ایسا ہوا کہ چار سال پہلے اس کی طلاق ہو گئی۔ کس وجہ سے ہوئی، آدھی کہانی تو اس نے بتادی تھی اور شاید آدھی اس نے قاری پہ چھوڑ دی تھی جو میں کوشش کے باوجود بھی نہ سمجھ سکا۔ ان چار سالوں کی دھوپ چھاؤں میں ہم ایک دسرے کو بہت حد تک سمجھ چکے تھے۔

اگر ہم قسمت نصیب پر یقین رکھتے ہوں تو ہمارے جیسا شاید ہی کوئی خوش قسمت تھا۔ دفتر میں لنچ اور ٹی بریک اکٹھے کرنا، شام کے وقت، اکثر شہر کے کسی پارک میں لمبی واک کرنا، مارگلہ واکنگ ٹریکس پر پانی کی بوتلیں اٹھائے پوری چھب کے ساتھ ملکی سیاست، ثقافت اور دفتری معاملات پر باتیں کرتے چلتے رہنا ہماری زندگیوں کا خوشگوار معمول تھا۔ اسی پارک میں جہاں میں بینچ پر بیٹھا درد سے کراہ رہا تھا، ہم کئی بار گھومے پھرے۔ وہ تمام موسم عبور کر کے دوستی نبھانا جانتی تھی۔ آج اس لیے ساتھ نہیں تھی کہ شاید مجھ سے ناراض تھی۔، شاید پوری دنیا سے یا شاید دنیا کے ہر مرد سے، شاید اس لیے کہ ... یقین سے کچھ کہ نہیں سکتا۔ عورتوں کا راضی یا ناراض ہونا بھی شاید موسمی ہے۔ میرا اپنا تجربہ تو نہیں لیکن کچھ لوگوں سے یہی سنا ہے۔ ان چار سالوں میں شاید ہی کوئی ایسا موسم ہو جب وہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ نیلما کے ہوتے مجھے کسی ماہر نفسیات کی ضرورت نہ پڑی۔ میں کم و بیش اپنی تمام کیفیات اس پر ظاہر کر چکا تھا۔ اور اپنی خوابی بڑبڑاہٹ پر بھی قابو پا چکا تھا۔ مگر پتا نہیں

کیوں میں اپنے کلبوت سے پوری طرح باہر نہ نکل سکا۔ اور وہ پوری طرح سے نکل چکی تھی۔ شاید اس کی منزل الگ ہے، شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ پیٹ میں درد کی شدت سے میں سوچنے لگا کہ اگر میں مر گیا تو کیا نیلما میری موت پر روئے گی؟ کیا مجھے یاد کیا کرے گی؟ اور اگر یاد کیا بھی تو کن لفظوں میں؟

کوئی سوفٹ دور میرا فلیٹ تھا جواب مجھے سو دو سو کوہ محسوس ہو رہا تھا۔ شاید شاید کے بوجھ تلے میرا وجود اتنا بھاری ہو گیا تھا جیسے روئی کا ڈھیر بارش میں بھیگ گیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میری ہمت جواب دے دیتی اپنے آپ کو گھسیٹتا میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے اپنے جسم کے اوپر والے حصے کے کپڑے اتارے، ہیٹر تو پہلے سے آن تھا۔ اس لیے کمرے کا ماحول کافی بہتر تھا۔ پھر اپنے آپ کو شیشے کے سامنے دیکھا۔ جب سے نیلما ملی تھی میں روز اس شیشے سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اس آئینے کو میری کمزوریوں خوبیوں کا بخوبی علم تھا۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہو کر پوٹھوہاری، ہندکو، کشمیری اور انگریزی بولنے کی مشق کرتا۔ نیلما ان زبانوں پر عبور رکھتی تھی اور جہاں کہیں موقع ملتا وہ بہت ہی اچھا ادبی سا جملہ بول کر محفل کو لاجواب کر دیتی۔ میں اس کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اپنے نفسیاتی خلاؤں کو پر کرنے کے لیے میں نے کچھ شاعروں ادیبوں کی کتابیں اپنے کمرے میں ضرور رکھی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک خوبصورت کتاب اور نیلما میں گہری مماثلت ہے۔ اس لیے میرا شوق بھی دن بدن بڑھنے لگا تھا۔ اساطیر، قصے کہانیوں، ناول، افسانوں اور شاعری میں نیلما کو مختلف کرداروں کے روپ میں جب محسوس کرتا تو دعا کرتا کہ کہانی کی ہیپی اینڈنگ میری ذات کے سبب ہو۔ پھر میں نے کئی بار سوچا کہ کیوں نہ ایک کہانی لکھوں اور ایک ہی بار سب کچھ کہہ دوں اور سلگتے ہوئے سوالات بھی کر ڈالوں۔ کوشش تو کی تھی مگر، شاید، اتنا آسان بھی نہ تھا۔ ملازمت کی تربیت میں میرے ذہن میں ایک بات بیٹھ چکی تھی کہ اپنا اظہار ریہ گول اور ہینڈڈ ہونا چاہیے۔ اس سوچ کو پریگمیٹک کہا جاتا ہے۔ ایسا بھی شاید نہیں تھا کہ مجھ میں جرات اظہار نہیں تھی۔ کچھ ایسا بولنا لکھنا چاہتا تھا جو پریگمیٹک ہو۔ میں تمام جتن بروئے کار لانا چاہتا تھا مگر تھک ہار کر سو جاتا۔ نیلما جیسی لڑکی کو امپریس کرنا شاید میرے بس کی بات بھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ میری رقت آمیز دعائیں بھی بے مراد ٹھہریں اور میں واکوں، ڈنروں سے واپسی پر گہری کھائیوں میں گرتا محسوس کرتا۔ ایسے ریلیشن میں پریگمیٹک کیسے ہوتے ہیں، مجھے تو شاید معلوم ہی نہیں تھا۔ بہت سے سوالات تھے جن کے بوجھ تلے میں اپنے آپ کو تقریبا کبڑا محسوس کرتا رہا۔ ادب سے میرا تعلق نیلما سے مشروط تھا۔ میں نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر کئی بار سوچا تھا کہ کیا لکھوں۔ ظاہر ہے میں کچھ ایسا لکھنا چاہتا تھا جسے پڑھ کر نیلم ولیس کی برف پگھلنے لگے۔ یہ بھی سوچتا تھا کہ شاید لوح محفوظ پر اس کے نام کے ساتھ جہاں میرا نام لکھا تھا وہ کچی پنسل سے لکھا ہوگا، شاید وہ لکھت مدھم ہو چکی ہے۔ نہیں ایسا

نہیں ہے۔ خدایا میرا وجود ادھڑنے سے بچا۔ کسی دن میرے اعصاب جواب دے جائیں گے یا میری نس پھٹ جائے گی، شاید نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو سمجھنے میں میرے محسوسات نا کام کیوں ہو گئے؟، اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ بس ایک فٹ فاصلے پر کیوں کھڑی ہوتی؟

ایسی ہی سوچوں میں غرق میں درد بھرے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا جا رہا تھا۔ پیٹ ایسے تھا جیسے کسی نے اندر چھتری کھول دی ہو۔ پھر میری بائیں پسلی پھڑ پھڑانے لگی۔ جیسے پانی سے باہر کوئی مچھلی تڑپتی ہے۔ میں نے اس پسلی پر ہاتھ رکھ کر محسوس کیا۔ حیرت سے میرے مساموں سے پسینہ نکلنے لگا۔ پیٹ کا بایاں حصہ ایسے پھولتا جا رہا تھا جیسے اندر سے فٹ بال کو ایک طرف دھکیلا جا رہا ہو۔ اس بائیں حصے پر میں نے دونوں ہاتھ رکھے اور اندر کی طرف دھکیلنے لگا۔ اس دھکم پیل میں میری پسلیاں چٹخنے لگیں جن کی آواز میں نے سنی تو میرے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی۔ شاید اس درد سے میں مرنے لگا ہوں۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے نیلما کے موبائل پر میسج کرنا چاہا کہ طبیعت سخت خراب ہے۔ کال بھی اس لیے نہیں کی کہ میری آواز سن کر اس نے فوراً گاڑی نکالنی ہے اور ہسپتالوں کے چکر شروع ہو جانے ہیں۔ پھر اپنا پیٹ کسی پر کون ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنا درد چپ چاپ اکیلے ہی سہنے کا فیصلہ کیا۔ پیٹ مسلسل پھولتا جا رہا تھا۔ میں نے دیوار کے سہارے فرش پر بیٹھنا شروع کیا۔ بے بسی کا عالم یہ تھا کہ میں کچن تک نہیں جا سکتا کہ ایک گلاس پانی پی سکوں حالاں کہ پیاس سے میری زبان سوکھ رہی تھی۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ کمرے کی در و دیوار میں بھونچال گردش کرنے لگے۔ دیوار کے سہارے بیٹھے بیٹھے میں چکرا گیا۔ میری بائیں پسلیاں ٹوٹ رہی تھیں اور جلد پھٹنے لگی۔ میں نے مشکل سے اپنا ہاتھ رکھا تو خون میری انگلیوں سے باہر رسنے لگا۔ یا خدا! یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ کونسی بیماری ہے۔ میری آنکھوں سے خوف اور پانی تیزی سے بہنے لگے۔ پسلیاں مزید ٹوٹیں تو خون کے ساتھ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی باہر نکلتا محسوس ہوا۔ اب میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرف رکھا اور جو میں نے محسوس کیا وہ میرے وہم و گماں میں نہیں تھا۔ یہ کسی انسان کا سر تھا۔ مجھ پہ کپکپی طاری تھی کہ اگلے ہی لمحے کمرے کی چھت میرے سر پہ گری۔ میں نے اس پہ ہاتھ پھیرا تو وہ مزید باہر نکلنے لگا۔ جیسے میرے ہاتھ کے اشارے کا منتظر تھا۔ میں پریگنلٹ تھا؟ اور میں حاملہ کیسے ہو سکتا ہوں؟ یہ سوالات میرے سر پہ اس زور سے لگے کہ میری چیخیں نکل گئیں۔ وہ انسانی سر میرے پیٹ سے باہر نکلنے کی تگ و دو میں تھا اور میری ذات زمین بوس ہوتی جا رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے! کس نے اور کب کیا مجھے پریگنلٹ؟ میری دوستی تو سوائے نیلما کے کسی کے ساتھ نہیں تھی اور وہ بھی کچھ فاصلے کی۔ تو یہ سب کیسے ہو گیا۔ کیا میں کوئی اساطیری کردار رہوں؟ میں نے زور سے ہاتھ دیوار پہ مارا تو مجھے نہ صرف درد محسوس ہوا بلکہ ہاتھ پہ جما خون دیوار پر بھی چپک گیا۔ ہاں یہ وہم نہیں، میں جیتا جاگتا انسان ہوں۔

میں نے خود کو سمجھایا۔ تو میرے اندر یہ انسان کون ہے؟ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ کیسے اور کس وقت یہ وجود میرے وجود میں آیا؟ اسی وقت ہڈیاں چرچرائیں اور وہ وجود جلد پھاڑ کر گردن تک باہر نکل آیا۔ میں نے اپنا سر دیوار سے ہٹایا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ گیلے گیلے بالوں سے اٹا ہوا تھا۔ میں نے ہانپتے دل اور کانپتے ہاتھ کے ساتھ اس کے بال ہٹائے۔ اف خدایا یہ تو عورت تھی۔ جس کا سر ایک اچھی خاصی جوان عورت جتنا تھا۔ دونوں ہاتھ خون آلود تھے اس لیے اپنی بانہوں سے میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں، اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ابھی تو خدوخال واضح نہیں تھے۔ لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے جانا پہچانا چہرہ ہو۔ یہ جانا پہچانا کون تھا جو اس حمل کا سبب بنا۔ جی چاہا اس وجود کا گلا یہیں دبا دوں تا کہ قصہ ہی ختم ہو۔ میرے پاس جواز بھی تھا، میں دنیا کو کیسے ساری کہانی سناؤں گا اور میری بات کا یقین کون کرے گا۔ کمرے میں گھٹن سے میرا دم گھٹنے لگا۔ شدت سے جی چاہا کہ اس تابوت کی کیلیں اکھاڑتا پہاڑوں کی طرف نکل جاؤں۔ لیکن مجھے تجسس تھا کہ یہ کچھ تو بولے گی، اگر یہ کوئی معجزہ ہے تو اس کی زبان کچھ کہانی ضرور سنائے گی، اس انہونی کے پیچھے کوئی راز ضرور ہے۔ لیکن معجزات کا باب تو ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ کیا میں کسی بڑے کلاسیکی المیے کا کردار بننے جا رہا ہوں، یا اللہ خیر، مجھے کسی بڑی آزمائش سے بچا۔ یہ سوچتے سراسیمگی میرے ٹوٹے پھوٹے جسم پر رینگنے لگی۔ پسلیاں پھر کڑکڑانے لگیں اور اب کی بار میرے جسم کا شگاف بازو تک پھیل چکا تھا۔ بڑی اذیت کی کیفیت میں اپنے جسم کو دیوار سے الگ کیا اور پیروں کو دیوار سے ٹکایا تا کہ زور لگا کر اس کا وجود اپنے سے الگ کیا جا سکے، بلا وجہ میں اس کے بال نہیں کھینچنا چاہتا تھا۔ سو میں نے پہلے اس کا ایک ہاتھ نکالا، پھر بازو اور پھر زور لگا کر اس کا سارا وجود اپنے آپ سے الگ کیا۔ اس کوشش میں سر سے پاؤں تک مجھے اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، ایسے جیسے غشی طاری ہو۔ میں دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا تھا کہ پسلیوں میں پھر چٹخنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ یہ ایک ہی وجود تھا یا جڑواں تھا؟ فورا میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ لیکن ایسا نہیں تھا میری جلد بند ہونے لگی تھی۔ ہڈیاں آپس میں جڑنے لگیں۔ ایک ہاتھ سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا وجود کیسے اب جڑنے کے مراحل طے کر رہا ہے۔ جیسے زخم مندمل ہونے پر خارش سی ہوتی ہے ایسے ہی میرے بائیں طرف کی کیفیت تھی۔ میں نے اس نومولود کو ایک نظر دیکھنا چاہا۔ وہ دوسری طرف کروٹ لیے سانس لے رہی تھی۔ ہاتھوں سے خون صاف کرنے کے لیے مجھے ایک کپڑے کی ضرورت تھی۔ میرے پاس میری شرٹ پڑی تھی۔ لیکن ادھڑے بدن کے ساتھ اس تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ ایک ہاتھ میں نے سلتے ہوئے زخموں پر رکھا اور دوسرے کو قمیص سے صاف کیا اور تھوڑا اٹھ کر اس نئے انسان کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ یہ پوری عورت کا چہرہ تھا۔ ایک خوبصورت وجود، میرے جسم کا ٹکڑا۔ میں سوچنے لگا کہ اس کا مجھ سے کیا

تعلق ہے۔ اس سوحانِ روح کے ساتھ کونسی شناسائی ہے کہ بے اختیار میری ممتا جاگ اٹھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں لیکن سانس تسلسل سے چل رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ اس کو ٹھنڈ لگ جائے۔ جلدی سے میں نے چادر کو تلاش کیا۔ ایک بیڈ شیٹ پاس پڑی تھی۔ اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے چادر اٹھائی اور اس کے جسم کو ڈھانپ دیا۔ اس کا صاف شفاف چہرہ میرے سامنے تھا۔ مجھے اس پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ زندگی میں پہلی بار کوکھ اور ممتا کا رشتہ سمجھ آیا۔ میں نے وال کلاک پر وقت دیکھا۔ ساری رات اس زچگی کے عمل میں بسر ہو چکی تھی۔ لیکن جس زچگی سے میں جسمانی اور نفسیاتی طور پر گزر رہا تھا اس کی شدت میں ہی جانتا تھا۔ میں منتظر تھا کہ اب یہ بولے گی۔ اس کے بال گھنے سیاہ تو نہیں لیکن بہت سلکی تھے۔ مجھے اس کی آنکھیں دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ چہرے کے خدوخال اب واضح ہو رہے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے نیلما کے ہوں۔ کشمیری اور پوٹھوہاری خمیر سے کشید کیا گیا کوئی فن پارہ جس کے ساتھ اشتیاقی مطالعہ سے ارم عدن کی چکا چوند ماند پڑنے لگے۔ شاید میری سوچوں نے اسے سینچا تھا۔ وہ جو ہمیشہ ایک فٹ فاصلے پر کھڑی رہتی اور میرے لیے ایسا تھا جیسے یہ فاصلہ تمام آسمانی صحیفوں میں فیصلہ کن ہو۔ اسی اثنا میں دور کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی تو میں نے لڑکھڑاتی ہوئی پنڈلیوں کے سہارے کھڑکی کھول دی۔ بادل بجلیاں برس گرج چکی تھیں۔ آسمان پر ہلکے بادلوں کے درمیاں نیلے وقفوں پر ستارے ٹمٹماتے نظر آئے۔ اگرچہ نیلما مذہب سے تین صدیاں دور تھی لیکن مجھے یقین تھا وہ اذان سن رہی تھی۔ میرا چاک پیٹ اب مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ بس زخم کا نشان باقی تھا ایسے جیسے جلد کی ڈبل سلائی کی ہو۔ میں خود کو سرخرو محسوس تو کرنے لگا، ایک گنجلک کیتھارسز کا عذاب مسلسل میرے اعصاب پر رینگ رہا تھا اور میری تخلیق ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کشمکش میں میں بوڑھا ہونے لگا تھا۔ میرا سانس اکھڑا اور سگریٹ کے دھویں سے مجھے کھانسی کا اس قدر شدید دورہ پڑا کہ میری آنکھوں سے پانی نکل کر گالوں سے نیچے اترنے لگا۔ شاید کھانسی کے شور سے لیکن اس کے جسم میں حرکت کیا ہوئی میرے کلبوت کی طنابیں اکھڑنے لگیں۔ اس کی پلکوں کی سرسراہٹ سے میری سانسوں میں ارتعاش پیدا ہوا، آس پاس وسوسے دائرے بناتے الجھنے لگے۔ شاید وہ کھڑکی کے پار ملگجے پن سے روشنی کشید کر رہی تھی۔ اسکی آنکھیں اسی کھڑکی سے چپک چکی تھیں۔ وہ بھوکی تھی نہ پیاسی۔ شاید اس بھوک پیاس سے ماورا مخلوق تھی۔ فریزر میں ایپل جوس پڑا تھا۔ میں نے سوچا کچھ کھانے پینے کو مانگے گی تو جوس پلا دوں گا حالاں کہ ہر پیدا ہونے والا انسان ضرورت کی خاطر بلکتا ہے مگر اس کے ہونٹ جیسے برف کی طرح جمے ہوں۔ پھر میری پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ چادر سنبھالتے ہوئے بیٹھنے لگی۔ اس دوران دو ایک بار اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ پھر چاروں طرف گردن گھما کر دیکھنے لگی۔ کمرے میں خون کی اس لکیر کو بھی دیکھا جو

میری پسلیوں سے نکلتا دیواروں کے ساتھ جمتا جا رہا تھا۔ مگر خاموشی سے بدن سمیٹتے گٹھڑی بننے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم سردی سے سکڑ رہا ہے۔ اسے حدت کی ضرورت تھی۔ میری موجودگی پر اسے کوئی تعجب ہوا نہ خوف۔ نہ محرم غیر محرم کا سوال۔ بڑے اعتماد سے اس نے چادر کھول کر بکل ماری اور سمٹ کر دیوار سے چپک کر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں پر رکھے سوچنے لگی۔

اسی وقت میرے فلیٹ کی ڈور بیل بجی تو میں اٹھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا۔

نیلما ہی تھی۔

''آج آفس سے چھٹی کیوں کی؟'' اس نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی سوال داغا۔

''ایک کہانی لکھ رہا تھا''۔ میں نے اس کے چہرے کے خدوخال سے کچھ تلاشتے ہوئے جواب دیا۔

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے دھیمے سے لیکن اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا۔ اور شاید کچھ مزید کہنے لگی تھی کہ۔۔۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔۔۔ مجھے تو بس اس کے حلق سے کچھ نیچے اترتا محسوس ہوا۔ اس نے مجھ سے آنکھیں چھپالی تھیں۔ ایسا اس نے کیوں کیا۔ یقین سے کچھ کہ نہیں سکتا۔ میں نے بس یہ محسوس کیا کہ شاید اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ کریم کلر کے لانگ سویٹر میں سردیوں کی میٹھی دھوپ نے جب قدم آگے بڑھایا تو میری لال سرخ مٹی میں گندمی پانی دوڑنے لگا۔

''اچھا۔ کہاں تک پہنچی کہانی؟'' اس نے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں سے تازہ لیکن تھوڑی سرد ہوا ہمارے جسموں کو آزمائش میں ڈال رہی تھی۔

''بس مکمل ہونے کو ہے''۔ میں نے اسکا راستہ چھوڑتے ہوئے بتایا

''سناؤ تو۔ آج اس نئے افسانہ نگار کی کہانی سنتے ہیں، لیکن،،،''

''لیکن کیا؟'' میں نے متجسس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا

''کہانی ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے گا۔ تا کہ سمجھنے میں آسانی رہے''

''جی بہتر''

وہ اسی جگہ بیٹھی تھی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے نومولود بیٹھی تھی۔ اسی طرح دیوار کے سہارے، بکل مارے، گھٹنوں پر منہ رکھے۔ آج نیلما پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ یا شاید مجھے ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوتا۔ مجھے ہمیشہ ایسے لگتا جیسے چپکے گالوں والی یہ خوبصورت پہاڑن میری آنکھوں سے میرے دل تک ایک ایک سطر پڑھ لیتی تھی۔ اس نے سگریٹ کے پیک سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور نیلی اور متجسس

آنکھوں کے کواڑ میرے ہاتھوں پر کھولے مجھے سننے لگی۔ میں نے ٹھہر ٹھہر کر اسے پوری کہانی سنا دی۔ شروع سے آخر تک۔ درمیان میں اس نے جھکتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا تھا۔ مگر اس کی 'ہوں'، 'ٹھیک'، 'اچھا' سے میں نے اندازہ کیا کہ کہانی اس نے انہماک اور اضطراب ملے جلے تجربے سے سنی۔ جب کہانی ختم ہوئی تو اس کے چہرے پر بڑی مایوس کن مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ایسے جیسے میں نے کوئی بھیانک غلطی کی ہو۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے مجھ سے کہانی مانگی۔ میں نے رجسٹر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اپنے پرس سے اپنا قلم نکالا اور اس کے نیچے کچھ لکھنے لگی۔ میرا دل دھڑکتا ہوا حلق میں آ گیا۔ پتا نہیں کہانی کا کیا انجام کر دے۔ اس دوران میں نے بھی سگریٹ پیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بال پین منہ میں دبائے کچھ سوچنے لگی، اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی میں نے پہلے کبھی نہ محسوس کی۔ پھر اس نے وہ کہانی مجھے سنائی جو اس نے حیران کن ترمیم کے ساتھ لکھی۔ پلاٹ تو کم و بیش وہی تھا، جزئیات نگاری اور لوکیل میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ کہانی کا اختتام کچھ یوں تھا کہ عورت میرے وجود کی بجائے گیلی مٹی سے جنم لے رہی تھی۔ صرف عورت ہی نہیں بلکہ عورت اور مرد۔ ایک ہی مٹی کے دو مختلف باوے، وہی دو کردار۔ دونوں کا سراپا نہایت خوبصورتی سے کھینچا گیا تھا۔ ایسے جیسے کسی اصل کہانی کے دو حقیقی کردار ہوں لیکن آخری لائن پہ بجلی کوندے کی طرح لپکی اور میری پسلیاں پھر چٹخنے لگیں۔

"دونوں کے درمیان فاصلہ ایک فٹ تھا"۔

☆☆☆☆

محمد عباس

سفر کا ستارہ

"آج بتیس برس بعد اپنا وطن اپنا لگ رہا ہے۔ اس بار یہاں رہ کر دن نہیں گننے۔ جیسے دکھوں کی کڑوی زندگی گزارنے کے بعد جنت میں پہنچ گیا ہوں اور اب یہاں سکھ کی لامحدود زندگی ہے۔"

گاڑی میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہوئی تو وہ کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا تھا۔ مارچ کا آخر تھا۔ ڈھلتی شام کے اس وقت ہوا خوشگوار ہو چلی تھی۔ چیت کی ہلکی ٹھنڈی ہوا کھلی کھڑکی کے راستے تیزی سے اندر آئی اس کے چہرے اور بالوں سے ٹکرائی تو اس ہوا کی محبت میں ڈوب کر اسے یہ خیال آیا تھا۔

وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا اور ڈرائیور جو انھی کے محلے کا رہائشی تھا اور کرائے پر گاڑی چلاتا تھا، اس کے دائیں طرف براجمان سٹیئرنگ سنبھالے تھا۔ بیٹا پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے سو رہا تھا یا شاید آرام کر رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو ہمیشہ اپنے وجود کی توسیع ہی سمجھا تھا۔ زندگی کے کسی مرحلے پر بھی جب اسے جان کا خطرہ ہوا تو وہ یہی سوچ کر اس مرحلے سے گزر گیا کہ مر بھی گیا تو کیا ہے، پیچھے یاسر تو موجود ہی ہے۔ گویا اس نے یاسر کی شکل میں زندہ رہنا تھا۔ اسے یاد ہے کہ جب یاسر پیدا ہوا تھا، تب خود اس کی اپنی عمر کتنی تھی۔ بیس سال۔ شادی کے ایک ہی سال بعد بیوی نے اسے یہ تحفہ دے دیا تھا۔ وہ اسے ہاتھوں میں لیے کتنی دیر تک سمجھ نہ پایا تھا کہ وہ باپ بن گیا ہے تو اس خوشی کا اظہار کیسے کرے بلکہ انتہائی مسرور ہونے کے باوجود اسے یہ سمجھ نہ آتی تھی کہ اس خوشی کی نوعیت کیا ہے۔ بس یہ احساس ہوا تھا کہ یہ یاسر اس کا بیٹا نہیں ہے، وہ خود ہی ہے۔ پہلے والی سے ذرا بہتر زندگی گزارنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ اس کی ہر خوشی کا خیال پوری توجہ سے رکھتا۔ اس کی ہر خواہش اپنی ہی ریاتی خواہش سمجھ کر پوری کرتا۔ خود وہ بچپن میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے جانے کن کن خوشیوں سے محروم رہا تھا، یاسر کی شکل میں وہ ان ساری خوشیوں کو دوبارہ پانے کی سوچتا تھا۔ یاسر کو گھماتے پھراتے، کھلاتے پلاتے وقت وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے امڈتی بے ریا چمک دیکھ کر ایک ہی وقت میں دو محبتوں کا تجربہ کرتا تھا۔ باپ کو بیٹوں پر کتنا پیار آتا ہے، بیٹوں کے لیے باپ کتنی بڑی نعمت ہوتا ہے۔ اس نے جو باپ کو دیکھا تک نہ تھا، اب خود اس کے اپنے باپ کی صورت کا ایک مہربان نقش اس کے تصور میں چھایا رہتا تھا اور وہ ننھے یاسر کی آنکھوں جیسے بے غرض

چمک لیے اپنے باپ کے تصور کو نہارتا رہتا۔

کچھ ہی مہینوں بعد یاسر کے نین نقش جب واضح ہوئے تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ خود اس کا اپنا ہی وجود ہے۔ ویسی ہی شکل وصورت تھی۔ ابھی بھی، اس نے مڑ کر پھر اسے دیکھا، وہ بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے بیس سال پہلے، چونتیس کی عمر میں وہ خود تھا، بس گال تھوڑے بھاری ہیں اور پیٹ باہر نکل آیا ہے۔ چہرے پر عینک لگ گئی ہے۔ باقی سب اسی کی طرح ہے۔ وہ باپ بیٹا اتنے ہم شکل تھے کہ ایک دن اس کی آمد سے بے خبر اُن کی ایک محلے دارنی نے اسے بیوی کے ہم راہ جاتے دیکھ کر اس کی بیوی سے بے ساختہ پوچھ لیا تھا، 'ماں بیٹا کدھر جا رہے ہو؟' اس غلط فہمی پر بیوی تو جو تپی، سو تپی، اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ اپنے بیٹے کو یہ بات سنا سنا کر وہ ہنستا رہتا تھا۔ 'یعنی تیری ماں اتنی بڈھی ہو گئی ہے کہ میری ماں نظر آنے لگی ہے۔' اس بات کے یاد آنے پر وہ ایک دفعہ پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

ڈرائیور پوری توجہ سے گاڑی چلا رہا تھا۔ سوہاوہ کے قریب جی ٹی روڈ کے موڑ خاصے خطرناک ہیں۔ یہاں توجہ ضروری بھی ہے، پھر وہ پنڈی سے یہاں تک آتے آتے کافی گپ لگا چکے تھے اس لیے اب آرام کر کے گویا باتوں کے اگلے سلسلے کے لیے توقف کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے ایک سگریٹ اُس کی طرف بڑھایا جو اس نے لے کر سلگا لیا اور دوبارہ باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ بیٹا جو باپ کی پسند سے واقف تھا نور جہاں کے پنجابی گانے ساتھ لایا تھا اور اب ''سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آ گیا'' چل رہا تھا۔ ان گانوں کے ساتھ اس کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ یہ انگلی پکڑ کر اسے اپنے گاؤں میں، اپنی جوانی میں اور واپس اپنی چونچالی میں لے جاتے تھے۔

مسکراتے ہوئے وہ واپس اپنے خیالوں کے سلسلے میں جا کر جڑ گیا۔ اس کی مسکراہٹ کو اس تلخ حقیقت کے احساس نے ماند کر دیا تھا کہ وہ اَب جوان کدھر رہا تھا۔ گو کہ عمر ابھی چون سال تھی۔ اس سے دس سال بڑا اسی ڈرائیور کا باپ ابھی بھی تن تنہا بھینس کو کَٹ کے کاڑھا پلوا دیتا تھا جب کہ اس کی کمر جھک گئی تھی۔ سر کے بال اُڑ گئے تھے، گھٹنوں میں پانی پڑ گیا تھا، ہڈیاں بھر بھرا گئی تھیں اور خیال بُڑھیانے لگے تھے۔ بتیس سال میں ابوظہبی کے خشک صحراؤں نے اس کے بدن کا سارا تیل چوس لیا تھا۔ اب کھلک ہی بچی تھی۔ ان اپنے پہاڑوں پر ہوتا، جہلم دریا کے تازہ پانی میں نہایا کرتا تو جانے ابھی کتنا تگڑا ہوتا۔ ابوظہبی میں چلتی خشک ریتیلی ہوا، معدے میں جانے والے بے جان خبس اور غیر صحت بخش پانی نے بدن کو ہر طرح سے بگاڑ دیا تھا۔ وہ دیکھنے میں بھی خاصا بوڑھا لگنے لگا تھا اور اندر سے خود کو زیادہ بوڑھا محسوس کرتا تھا۔ کہاں اپنے وطن کے ٹھنڈے پانی اور کہاں راس الخیمہ کے صحراؤں میں تیل کی طرح کڑھتے ہوئے گرم پانی۔ یہاں کا پانی بدن پر

پڑے تو بدن کو جگا کے رکھ دیتا ہے اور وہاں بدن پر پانی ڈالنے کا خیال بھی دل کو مردہ کر دیتا ہے۔ آدمی بوڑھا نہ ہو تو کیا ہو۔ یہ یاسر ابھی جس طرح توانا ہے، یہ ایسی ہی اٹھان چلتا رہے، اسی ملک میں رہے تو ستر سال کی عمر میں اپنے پہاڑوں کی چٹانوں سا قائم رہے گا۔ جب کہ وہ خود ابھی سے جڑیں چھوڑتے درخت کی طرح سوکھتا جا رہا ہے۔

اسی یاسر کے بہتر مستقبل کے لیے تو وہ ابوظہبی گیا تھا۔ ابھی یاسر دو سال کا ہونے والا تھا جب اُس نے وطن چھوڑا تھا۔ وہ اُن دنوں مستری کا کام کرتا تھا۔ سارا دن اینٹیں تھپتا، پلستر کرتا تھا۔ دن بھر کی مشقت کے بدلے اسے اتنا ہی ملتا تھا کہ گھر کا گزارا ہوتا رہے۔ جٹ پُتر ہونے کی وجہ سے گزارے سے زیادہ کی اسے خواہش بھی نہ ہوتی تھی۔ دس بیگھے زمین تھی، محنت کا کچھ رخ اُدھر کرتا تھا اور سال بھر کے لیے تھالی کی فکر سے بے نیاز ہو جاتا۔ اس کے باپ دادا نے تو اِسی زمین کے سہارے، عمر گزاری تھی۔ تن کے دو کپڑے ہوتے، دَھنیے کی چٹنی اور سوکھی روٹی کھاتے اور زمین کو اللہ کی بڑی نعمت شمار کرتے تھے۔ بارانی علاقوں کی دس بیگھے زمین اس سے زیادہ دے بھی نہیں سکتی تھی۔ جب کہ خود اس کے گھر میں مستری کی آمدنی سے گھر میں کھانا ڈھنگ کا بن جاتا تھا اور میاں بیوی ڈھنگ کا پہن بھی لیتے تھے۔ یاسر کے ساتھ اسے بہت محبت تھی۔ ایک دن اُس نے یاسر کو بھی تیسی اور کرنڈی سے کھیلتے دیکھا تو اُس کی قسمت اُسے اپنے ہاتھوں پر لکھی دکھائی دینے لگی۔ گرمی کی دوپہروں میں اونچی گو پر کھڑے ہو کر اینٹیں جوڑنا، ساون کی جھڑ اس میں کمروں کی چھتوں کو پلستر کرنا اور کیچڑ پسینے سے آلودہ ہاتھ پھیلائے اپنی ہی مزدوری کو بھیک کی طرح طلب کرتے یاسر کا تصور اسے لرزا گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ اپنے بیٹے کو مستری نہیں بننے دینا، اسے اچھا سا پڑھانا ہے تا کہ اس کی زندگی آرام سے گزرے۔ اُس نے زیادہ آمدنی کے بہت طریقے سوچے۔ جٹ پتر کاروبار کر نہ سکتا تھا۔ کرتا بھی تو مہینوں میں الٹا مقروض ہو جاتا۔ نوکری اسے ڈھنگ کی مل نہ سکتی تھی۔ سرکاری دفتروں میں اسی جیسے اہلیت کے لوگوں کے لیے چپڑاسی، مالی یا بیلدار کی اسامیاں تھیں اور ان اسامیوں کا مطلب تو پہلے سے بھی زیادہ بھوک تھی۔ ناچار اس نے وہی کیا جو پوٹھوہار خطے کے ہر نوجوان کا خواب ہوتا ہے۔ قرض پکڑا اور ابوظہبی کے ریتیلے صحراؤں میں جا اترا تھا۔ اس کا بدن قدرتی طور پر بھی کچھ کمزور تھا اور اب جو ماں سے دور ہوا، پردیس میں ٹھکانہ لگایا اور بے رحم مشقت کے لامتناہی سلسلے میں جکڑا گیا جہاں تھکن کا ہر احساس قرض اتارنے اور گھر کے حالات بہتر کرنے کے خیال تلے دب جاتا تو اس کا بدن دو ہی مہینے میں تڑخنے لگا تھا۔

یتیم پلا تھا تو ماں کے لاڈ نے سختی جھیلنے کی اِتنی سکت پیدا ہی نہ ہونے دی تھی۔ بدن نے بہت دہائی دی لیکن اُس کے اندر ایک ضد تھی۔ ہار نہ مانی۔ آہستہ آہستہ بدن سختیانے لگا اور وہ اِس گرمی اور اِس سختی کا عادی

ہونے لگا اور کام آسان لگنے لگا۔ ایک ہی برس میں اس نے سب قرض اتار دیا۔ لیکن یہ ایک سال جس طرح سے اس کے دل پر سے ہو کر گزرا تھا، کچھ وہ ہی جانتا تھا۔ سب سے بڑا دُکھ تو جگہ کی اجنبیت کا تھا۔ گاؤں میں تھا تو ہر طرف اس کی پہچان تھی۔ یاروں دوستوں کے ساتھ گپ شپ، رشتہ داروں سے میل ملاپ اور گھر کے پُرسکون ماحول کی وجہ سے اسے زندگی کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا جیسے ساون کی پہلی بارش کے بعد تازہ ہوا کے جھونکے چل رہے ہوں لیکن یہاں پردیس میں ہر وقت اجنبیت کی نگاہیں اس پر گڑی رہتی تھیں۔ کسی کو کیا معلوم وہ کون ہے، کسی کو اس کی کیا پروا۔ اتنے اجنبی لوگوں کے درمیان اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہاں اس کا ماحول نہ تھا اور اسے یوں لگتا تھا کہ وہ خود بھی نہیں تھا۔ جیسے مچھلی اپنے پانی میں ہوتی ہے، ایسے ہی وہ اپنے ماحول سے تھا، ماحول چھن گیا تو وہ بھی نہ رہا تھا۔ جیسے جیٹھ کی تپتی لو میں کسی کو برہنہ پا چلنا پڑ رہا ہو۔ ایک ایک قدم پر پاؤں کے چھالے ٹیس دیتے تھے۔ پھر یہاں کے موسم اس کے لیے اجنبی تھے۔ وہ پانچ موسم چھوڑ کے آیا تھا جو اس کی زندگی میں اپنے اپنے رنگ بھرتے تھے۔ یہاں ایک ہی موسم تھا جو شکلیں بدل بدل کے آتا تھا۔ گرمی۔ ہلکی گرمی۔ سخت گرمی۔ اِس موسم کی بے رحمی اس کے وجود کو خشک کرتی جا رہی تھی۔ وہ پانی چھوڑ کے آیا تھا، یہاں ہر طرف ریت تھی۔ ہریالی سے جدا ہوا تھا اور یہاں منظر اور نظارے دونوں میں خاک اُڑتی تھی۔

سب سے بڑا درد بیوی کا تھا۔ اپنے گھر میں اُس کے ہونے سے سُکھ تھا۔ وہ کچھ نہ بھی کرے، آس پاس اُس کی موجودگی کا صرف احساس بھی ہو تو اس کے حواس پر کیف آمیز نشہ سا چھایا رہتا۔ وصال کا رانگلا پلنگ اس کے تصور میں بچھا رہتا۔ اس کی خوشبو دار قربت میسر ہو تو سب غم اور سختیاں چارپائی کے چاروں پائیوں سے ہٹ کر کھڑی رہتی تھیں۔ وہ پاس ہوتی تو اس کی اداؤں پر غور کرنے کی مہلت ہی نہ ملتی۔ بس نشے کے عالم میں دیکھتا رہتا تھا جیسے ساون کی بارش سے پہلے کی ٹھنڈی ہوا بدن کو سہلا رہی ہو۔ یہاں اس کے نہ ہونے سے زندگی خارزار تھی۔ ہر قدم پر کانٹے چبھتے تھے اور ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ تھکن سے اداسی سے گھبرا جاتا تو اس کا دل پکار پکار کر بیوی کو یاد کرنے لگتا۔ اس کی ایک ایک ادا اُس کے دھیان میں آتی اور اسے تڑپاتی رہتی۔ کبھی اس کا نہا کر غسل خانے سے نکلنا یاد آتا جب اس کی شلوار قمیض اس کے گیلے بدن سے جگہ جگہ چپکی ہوتی۔ کبھی وہ تندوری میں جھک کر روٹیاں تھاپتی نظر آنے لگتی۔ کہیں اس کے پاتنی سمٹی سی بیٹھی پنکھی جھل رہی ہوتی اور کبھی کبھی راتوں کو اس کے سونے بستر میں لیٹ کر اس کے ساتھ چپکی دیر تک میٹھی سرگوشیاں کرتی رہتی۔ اس کی یاد سے جہاں دو گھڑیاں اچھی گزر جاتیں وہیں دل کی تڑپ میں اضافہ ہونے لگتا۔ وہ واپس پلٹنے کو مچلتا لیکن جن خوابوں کے لیے وہ آیا تھا، وہ ادھورے چھوڑنے ممکن نہ تھے۔ وہ خواب یاسر کی زندگی تھے۔ یاسر جو کہ وہ خود ہی تھا۔ وہ اکثر بیس سال آگے دیکھنے لگتا جب اس کا بیٹا عین مین اسی طرح کا جیسا وہ ہے، خوبصورت لباس میں کسی اچھی سی

یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوگا۔ اپنے باپ کی طرح پسینے، مٹی اور گرد سے اٹے ہوئے کپڑے پہنے دھوپ میں کھڑے ہوکر مزدوری تو نہیں کرے گا۔ آج ایک نسل نے قربانی دینی ہے تو اگلی نسل نے آسان زندگی گزارنی ہے۔ اگر وہ ہار کر واپس چلا گیا تو اس کا بیٹا بھی مستری ہی بنے گا۔ یہی جلتی آگ جھیلنا اور تپتے طبوق اٹھانا اس کی قسمت ہوگی۔ اگر بیٹے کی قسمت لکھنے کا اختیار خدا کے بعد کسی کے ہاتھ میں ہے تو خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہمت کرے تو بیٹے کی قسمت اچھی ہو جائے گی ورنہ بیٹا بھی قسمت کو کوستا رہے گا جو بالواسطہ باپ کی کم ہمتی کو طعن ہوگا۔ رہی بات بیٹے سے ملنے کی، اس کو ساتھ لیے پھرنے کی، اس کے پاس بیٹھنے کی، تو یہ سدھر بہت زیادہ تھی۔ وہ یاسر کو دیکھنے کو پل پل ترستا تھا۔ اس کے بغیر اسے اپنا وجود خالی خالی لگتا تھا۔ جب اس کا خواب پورا ہو جائے گا، بیٹا پڑھ لکھ کر کہیں نوکری لگ جائے تو وہ واپس چلا جائے گا۔ بیٹے کے ساتھ رہے گا اور جی بھر کے اسے دیکھا کرے گا۔

اس دوران بہت سی مشکلیں بھی آئیں لیکن اس نے بے ہمتی کا مظاہرہ نہ کیا۔ ایک دفعہ لوہے کی وزنی چادر گرنے سے ایڑی کی پچھلی رگ کٹ گئی، چلنے سے معذور ہوا اور چار ہفتے ہسپتال رہنے کے بعد بحال ہوا۔ اتنا کچھ ہوا لیکن گھر والوں کو اشارہ تک نہ دیا۔ تھکن ہوتی۔ بدن ٹوٹتا۔ ذہن میں پریشانیوں کے جھکڑ چلتے رہتے لیکن سب کچھ اکیلے برداشت کیا۔ گھر جب بھی خط بھجوایا، یہی بتایا کہ سب ٹھیک ہے اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ ماں کی یاد ستاتی اور وطن کی بہاریں بھی بلاتیں لیکن کسی طرح بھی دل نہ ہارا۔ صحن میں گھٹنیاں کرتا یاسر اس کی آنکھوں کے آگے رہتا اور وہ اس کے لیے محنت کرتا جاتا۔ محنت کے اس سارے دورانیے بلکہ ابھی بھی جب کہ بتیس برس گزرے گئے، اس کے ذہن پر یہی خیال حاوی رہا کہ میں اپنے وجود کی نفی کروں گا تو میرا بیٹا اپنے وجود کی پہچان بنائے گا۔ میں اپنے گھر والوں سے دور، پرائے دیس کی بے رحم خاک میں جی رہا ہوں تو کیا، اس کی اولاد تو ہریاول میں رہے گی نا۔

ابوظہبی میں گزرا پہلا سال اس کے لیے جہاں بہت مشکل تھا وہاں ایک ایسا قابلِ اعتبار دوست بھی مل گیا تھا جس کے ہونے سے زندگی کے پل آسانی سے کٹنے لگے تھے۔ خالد محبوب۔ لالہ موسیٰ کا رہنے والا تھا۔ اچھے اخلاق اور کردار کا مالک تھا اور دوستی نبھانے والا تھا۔ اس کے ساتھ پہلی ملاقات تو صرف ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ہوئی لیکن جب ساتھ رہے تو رفتہ رفتہ ایک اچھا تعلق بن گیا اور کچھ مدت بعد وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن چکے تھے۔ یہ دوستی بڑی مثالی دوستی تھی جس میں سکھ اور دکھ کے بہت سے مواقع آئے تھے۔ دونوں میں جس کے ساتھ بھی کچھ بیتا، دونوں نے اکٹھے ہی جھیلا۔ برسوں کا ساتھ رہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوتے گئے اور باوجود پردیس اور نوکری کی غیر یقینی صورتحال کے، وہ

جہاں بھی رہے، اکٹھے رہے۔ ایک کو نوکری سے نکالا گیا تو دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے فٹ پاتھ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک کو نئی جگہ نوکری ملی تو دوسرے کو بھی وہاں لے گیا۔

ابوظہبی سے واپس تو کسی وقت بھی آ سکتے تھے، کمپنی ہر مہینے کے حساب سے دو چھٹیاں دیتی تھی لیکن یوں آنے میں کوئی دانائی نہ تھی۔ البتہ دو سال بعد اگر ملازم گھر جائے تو اڑتالیس دنوں کی چھٹیوں کے ساتھ ساتھ کمپنی واپسی کا ٹکٹ بھی دیتی تھی۔ اس پیش کش سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ دو سال اٹکا رہا اور دو سال بعد پہلی دفعہ اڑتالیس دِن گزارنے کو گھر لوٹا۔ یہ چھٹیاں اس کے لیے خوابوں کی کسی سرزمین پر چلنے جیسی تھیں۔ دِن کم تھے اور حسرتیں بہت زیادہ۔ کیا کیا کچھ نہ تھا جو دیکھنے کی تڑپ نہ تھی۔ دیکھنے کو دو آنکھیں اور دِن گِن کر اڑتالیس۔ اپنی بیوی کی زلفوں کی مہک بھی اس کی شامہ میں رچنے نہ پائی تھی، ابھی بیٹے کو رَج کے کھلایا بھی نہ تھا، ابھی ماں کے شفیق سائے میں تھوڑی دیر بیٹھا بھی نہ تھا، پہاڑوں میں سردیوں کی طویل رات میں شکار کی خواہش دبی رہ گئی، دریا پر جی بھر کے نہانے کی حسرت بدن کے ہر اَنگ میں اٹکی رہی، سائیں ڈھول شاہ کے میلے کے رنگ ابھی کھلنے ہی نہ پائے تھے کہ مہلت ختم ہو گئی۔ واپسی کی فلائٹ تیار کھڑی تھی۔ جہاز میں بیٹھے حسرت سے اپنے وطن کی فضاؤں کو دیکھتے ہوئے اس نے جانا کہ زندگی اسی طرح دکھ کی لمبی دھوپ میں جلانے کے بعد دو گھڑی سکھ کی چھایا دیتی ہے اور اگر سُکھ کی چھایا میں بیٹھنے کی طلب ہو تو پھر سے دُکھ کی دھوپ جھیلنی پڑے گی۔

پاکستان اور ابوظہبی۔ یہ چکر لگتے رہے۔ اس دوران ان دونوں نے کئی ملازمتیں چھوڑیں، نئی جگہ تلاش کی، بے کاری کے دن بھی گزارے اور بیماری کے بھی لیکن خالد محبوب اور اس کی مثالی سنگت کی وجہ سے پردیس بھی پردیس نہ لگتا تھا۔ ایک قابلِ اعتماد یار ہو تو آدمی کے سبھی غم ہلکے ہو جاتے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر بتیس سال گزار گئے۔ اس دوران خالد ہر سال اور وہ دو تین سال بعد سُکھ کی چھاؤں میں آتے رہے۔ پردیس میں اتنی مدت رہ کر جو کلفتیں چمڑے پر کھرنڈ بن کر چمٹ جاتی تھیں، انھیں جہلم چناب کے پانیوں سے دھو لیتے اور تازہ دم ہو کر واپس پھر خشک ریت پھانکنے چلے جاتے۔

اٹھارہ برس بیت گئے جب اس کا بیٹا Comsat میں انجینئر بننے کے لیے داخل ہو گیا۔ اسے لگا تھا کہ اس کی محنتوں کا صلہ مل رہا ہے۔ ابھی وہ چالیس کا ہو گا اور اس کا بیٹا انجینئر ہو چکا ہو گا۔ اپنی کمپنی میں اس نے انجینئروں کی شان دیکھ رکھی تھی۔ اُس کا بیٹا بھی اُسی مقام تک پہنچ جائے گا۔ اِس کا مطلب ہے کہ کچھ ہی مدت بعد وہ اپنے باپ کی طاقت بنا ہوا ہو گا۔ بیٹے بڑھاپے کی لاٹھی ہوتے ہیں لیکن اس کا بیٹا جوانی کا ساتھ ہو گا۔ یہ سوچ کر اُس کے تصور میں آتش بازی ہونے لگتی۔

بیٹے کے ساتھ اس نے تعلق بھی بہت دوستانہ رکھا تھا۔ اسے احساس ہی نہ ہونے دیا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ جو اس نے مانگا، وہ دیا، جو اس نے کہا، وہ مان لیا۔ کھانے پہننے سے لے کر اپنے پڑھنے تک کے بھی فیصلے وہ خود کرتا۔ باپ کو بتانا بھی گوارا نہ کرتا اور بتا بھی دیتا تو باپ اعتراض نہ کرتا۔ اس نے ساتویں کلاس میں سگریٹ پینے شروع کر دیے لیکن اس کے روکنے کے بجائے اسے بلا جھجک اپنے سامنے پینے کی اجازت دے دی۔ اس کے حلقۂ احباب میں بیٹھ کر اسی کی سطح پر گپیں ہانکتا، تاش کھیلتا اور لغو گوئی کرتا۔ یاسر کے دوست اس کے باپ کو بھی اپنا ہی دوست سمجھتے تھے۔ خود یاسر نے اسے باپ کم اور دوست زیادہ سمجھا تھا۔ اپنا ہر دُکھ سُکھ اس کے ساتھ بیان کر دیتا۔ اپنی سبھی الجھنیں اسے بتا کر رہنمائی لیتا۔ حتیٰ کہ پہلے ہی سمسٹر میں تھا کہ اس نے حنظلیہ کو پسند کرنے اور اس کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ سنا دیا تو باپ نے دوستانہ انداز میں خوشی منائی تھی۔ اسے یاسر کے ساتھ باتیں کرنے کا شوق تھا بھی بہت۔ اس لیے ہر جمعے کی شام جب وہ لوگ راس الخیمہ (پیچھے اس کا تفصیلی ذکر) کے اپنے کیمپ میں فارغ ہوتے تو وہ یاسر کے ساتھ کال ملا کر گھنٹوں بات کرتا رہتا۔ یاسر بھی باپ کے ساتھ گرمجوش بات کیا کرتا اور جمعہ کی شام کوئی مصروفیت نہ رکھتا اور باپ کی کال کا منتظر رہتا۔ باپ نے اس کے ساتھ اسی طرح باتیں کرنے، وقت گزارنے کے خواب دیکھتے ہوئے عمر گزار دی تھی۔ پردیس کا عذاب ایک ایک دن کر کے کاٹا تھا۔ اس نے یاسر کو بھی آمادہ کر رکھا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد اس نے اپنے ملک میں ہی روزگار ڈھونڈنا ہے۔

صحرا کے بیس سال گزرے تو یاسر کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ اُسے لگا کہ منزل کچھ قریب آ گئی ہے۔ لیکن جب اسے نوکری ملنے میں وقت کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے خواب بکھرنے لگے۔ اِدھر اُدھر کے چھوٹے موٹے کام اس نے کافی کیے اور کچھ عرصے بعد آخر کار ایک نوکری مل گئی۔ پنڈی کی کسی پرائیویٹ کمپنی میں نوکری ہوئی تھی اور ابھی تنخواہ بھی معمولی سی تھی لیکن یاسر کو امید تھی کہ اسی کمپنی میں رہ کر اچھی خاصی ترقی کر جائے گا۔ باپ بھی پُرامید تھا۔ یاسر نے شادی کے لیے کب سے لڑکی پسند کر رکھی تھی تو وہ بھی اب ضروری تھی۔ لڑکی اچھے گھر کی تھی۔ پڑھی لکھی۔ اسے بیاہ کر لانے میں اُس نے خاصی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور بیٹے کو کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ حنظلیہ کے آنے سے اس کے گھر میں رونق بن گئی تھی۔ وہ جب کبھی آتا تو اپنے بیٹے اور بہو کو دیکھ دیکھ کر یوں خوش ہوتا جیسے اپنی جوانی کے دن یاد آ رہے ہوں۔ شادی کے چھ سال بعد ان کے گھر بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ چھوٹی سی، کھِلی سی رامین۔ یوں لگا کہ اس کا گھر مکمل ہو گیا ہے، بس خود اس کی کمی رہ گئی ہے۔

اُسے گئے بتیس سال گزر گئے تھے۔ گھر کی حالت بھی بہت بہتر ہو گئی تھی۔ پختہ مکان۔ دو منزلہ۔ زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ گاؤں بہت بڑا تھا اور لوگوں کے بڑے بڑے گھر بھی تھے مگر اس کے گھروندے

میں بھی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ سب کچھ ہی تو اُس نے بنالیا تھا۔ جو سُکھ اُس کی حیثیت کے آدمی کے خواب ہوتے ہیں، وہ سب اس کے گھر میں روشن تھے۔ یو۔ اے۔ ای نہ جاتا تو یہ کبھی نصیب نہ ہوتا۔ پاکستان میں رہ کر ایک مستری اپنی اور اپنے بچوں کی دال روٹی بھی چلا لے تو غنیمت ہے۔ ان بتیس برسوں میں اسے ایک ہی خیال کا سُکھ تھا کہ جب جائے گا تو اپنے بیٹے کے ساتھ جی بھر کے وقت گزارے گا۔ بیٹے کی شادی ہوگی، اس کی اولاد ہوگی اور وہ ایک بزرگ کی طرح ان کا خیال رکھے گا، ان کی خوشیوں میں خوش رہے گا اور شام کے وقت جب یاسر کام سے پلٹا کرے گا تو اس کے ساتھ جی بھر کے باتیں کیا کرے گا۔ اب گھر میں سب کچھ تھا تو اُسے یہ بات کھلتی تھی کہ وہ خود وہاں کیوں نہیں ہے۔

اور آج کتنا سُکھ تھا یہ سوچ کر کہ یہاں رہتے ہوئے اُسے دن گننے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب وہ لامحدود مدت کے لیے یہاں رہ سکتا ہے۔ اب اُس نے کبھی اُس دوزخ میں دوبارہ اپنے قدم نہیں رکھنے۔ اس طرح مستقل آنے کا، اس نے کب سے سوچ رکھا تھا لیکن گھر کے حالات اجازت ہی نہ دیتے تھے۔ گھر کی ضروریات ایسی تھیں کہ انھیں ابوظہبی کی نوکری ہی پورا کر سکتی تھی۔ پاکستان واپس جاتا تو بھوک ہی کاٹنی پڑتی۔ یاسر کی نوکری کے بعد اسے امید تھی کہ اُس کے لیے آسانی ہو جائے گی لیکن اُس کی شادی پر اتنا کچھ خرچ کرنا پڑ گیا کہ پھر کتنی مدت اُس قرض کو اتارنے میں لگ گئی۔ پھر یاسر کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ گھر پہلے کی طرح چل سکتا۔ باپ کی آمدنی ضروری تھی۔ اس کے باوجود وہ جوڑ توڑ کر کے گھر جانے کا کئی دفعہ ارادہ کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ خالد محبوب بھی تھا جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور تھا۔ پانچ بیٹیوں بعد اس کا ایک بیٹا تھا اور اس کو جوان ہونے اور باپ کا سہارا بننے میں ابھی مدت لگ جانی تھی۔ ان سب کی شادیاں اس نے ہی کروائی تھیں۔ بوجھ پہاڑوں کا سا تھا، خالد اکیلے اتنا چل نہ سکتا تھا۔ سو جب بھی خالد اس سے واپسی کا تذکرہ سنتا تو ہنس کر اس کا حوصلہ بڑھاتا اور دو چار سال کے لیے مزید روک لیتا: 'ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔ تم تو مجھ سے بھی ایک سال چھوٹے ہو۔ ابھی سے گھر جا کے اولاد پر بوجھ کیوں بنتے ہو۔ کماتے رہو تاکہ گھر والوں کو تم پر فخر رہے۔ بوجھ بن گئے تو اٹھا کر پٹخنے پر آ جائیں گے۔ اور پھر میرا بھی تو سوچو، تم چلے گئے تو میں کس کے سہارے پر یہاں رہوں گا۔ تمھارے بغیر لقمہ کیا اترنا ہے۔ سانس بھی کیا پتا راستے میں اٹک جائے۔ جائیں گے تو ایک دن اکٹھے ہی پاکستان جائیں گے۔' وہ اپنے بیٹے کو جانتا تھا کہ وہ باپ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کر سکتا لیکن خالد کے اکیلا رہ جانے کا خیال اسے بھی ڈستا تھا۔ وہ کام کرتا رہا۔ خالد کا سانس چلتا رہا۔ اولاد کو اس پر فخر ہوتا رہا۔

ابھی مہینہ ڈیڑھ پہلے تک اس کا حوصلہ قائم رہا تھا لیکن جب ایک رات خالد محبوب کا سانس اس کی موجودگی کے باوجود راستے میں اٹک گیا تو اس کا حوصلہ دھڑام سے نیچے آ گرا۔ خالد جیسے زندہ دل آدمی کو یوں

بے جان دیکھنا اس کے لیے زندگی کا سب سے روح فرسا تجربہ تھا ہی، اس کی بیوی اور بیٹیوں کو فون پر تسلی دیتے دیتے اس کے اپنے آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ پھر جب میت کو پاکستان بھیجنے کے لیے یو اے ای کے غیر انسانی قواعد و ضوابط سے واسطہ پڑا اور موت کے تیس دن بعد اس نے لاش روانہ کروائی تو وہ خود بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس کے اندر لاش کے ساتھ جانے کی ہمت نہ تھی۔ وہ خود لاش بنا پڑا رہا تھا۔ پانچ دن بعد اس نے بیٹے سے صرف ایک بار پوچھا تھا، 'کیا میں فنش کر کے گھر آ جاؤں؟' بیٹا اس کے جذبات سمجھتا تھا، اثبات میں جواب دے دیا۔ اس کے بعد اسے راس الخیمہ اور یو اے ای میں گزرے بتیس برس سمیٹنے میں تین دن لگے تھے۔ بلکہ بتیس برسوں سے سب سمٹا سمٹایا پڑا ہی تھا، بس اٹھا کر چلنے میں تھوڑا وقت لگ گیا تھا۔

وہ گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یاسر نے آنکھیں کھول لی تھیں۔ عشا کا وقت ہو چلا تھا اور ہر سو تاریکی تھی۔ اُس نے باپ سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔

“ابا جی! کیسا لگ رہا ہے ہمیشہ کے لیے واپس آ کر۔”

“لگنا کیا ہے۔ ایک خواب تھا جو پورا ہو گیا ہے۔ اچھا ہے کہ زندہ آ گیا ہوں۔ خالد کی طرح آتا تو شاید آنکھوں کو قبر میں بھی سکون نہ آتا۔”

“خالد چاچا کی وفات کا بہت افسوس ہے ابا جی! بہت پرانی دوستی تھی آپ لوگوں کی۔”

“تم جنازے پر گئے تھے اس کے؟ اس کا چہرہ دیکھا؟ نہیں دیکھا۔ یو اے ای سے لاش ہی ایسے بھیجتے ہیں کہ نہ ہی دیکھنا بہتر ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ مرا ہوا لگتا ہی نہ تھا۔ جیسے زندگی میں ساتھ رہا، مسکراتا ہوا، ایسے ہی موت کے بعد بھی تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی کہہ اٹھے گا، کی ہویا اے؟ اس وچ رون آلی گل کیہڑی ہے۔” اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

“بہت اچھے آدمی تھے۔ میں ان کے جنازے پر گیا تو سب لوگ ان کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ان کے بچوں کا رو رو کے برا حال تھا۔ چھوٹا احتشام تو پاگل ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ان بے چاروں کا کیا بنے گا۔”

“کچھ نہیں ہوگا انھیں۔” وہ اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ “اللہ مالک ہے۔ پوری عمر خالد نے ان کے لیے بہت کچھ کیا۔ اتنا کچھ جمع ہے کہ انھیں زندگی کی تنگی نہیں ہوگی۔ بس باپ کی کمی محسوس ہوگی جس کا کوئی علاج نہیں۔”

پھر ایک خیال سے مسکرانے لگا: “تمھیں پتا ہے کہ یو اے ای کے قانون کے مطابق زندہ ہاتھی لاکھ کا ہوتا ہے تو مردہ ہاتھی بیس لاکھ کا۔”

“کیا مطلب؟”

''مطلب یہ کہ اگر یو۔ اے۔ ای میں آدمی نوکری کے دوران مر جائے تو اس کو کمپنی کی طرف سے انشورنس کے پیسے الگ ملتے ہیں اور مزدوروں کی انجمن کی طرف سوشل سیکیورٹی الگ۔ خالد کے کل ملا کے بائیس تئیس لاکھ بن گئے ہیں۔ تو یہ اُس کی اولاد کو اچھا خاصا سہارا ہو گیا ہے۔''

''ابا جی! پیسے اپنی جگہ، باپ کی جگہ تو کوئی نہیں لے سکتا نا۔''

''اتنی مدت باہر رہ کر یہ تو ہمیں پتا چل ہی گیا ہوتا ہے کہ پیسے کے بغیر باپ کا رشتہ اپنی اہمیت منوا ہی نہیں سکتا۔''

یہ کہہ کر بیٹے کی طرف دیکھے بغیر وہ نور جہاں کے ساتھ آواز ملا کے گانے لگا۔ 'کہندے نیں نیناں، تیرے کول رہنا۔' اسی آواز کے ہمراہ گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی تو اس کے اندر بچپن کا زمانہ لوٹ آیا۔ جی چاہا پکار پکار کر ان گلیوں، دیواروں، اس مٹی اور ان کھیتوں کو بتاؤں کہ میں لوٹ آیا ہوں، میں تمھارا ہی تھا تمھارے پاس پلٹ آیا ہوں۔ لیکن اس عمر میں ایسی حرکتیں کرنا اپنا تماشا بنوانا ہے۔ دل سے اٹھتے سبھی جذبوں کو سینے کی سِل تلے دبائے وہ چپ بیٹھا رہا۔ یوں تو پہلی دفعہ سے لے کر اب تک وہ کتنی ہی دفعہ یہاں آیا تھا اور گاؤں میں آنے والی ہر تبدیلی کا اسے علم تھا لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ بتیس برسوں کے بعد آج پہلی دفعہ وہ واپس لوٹا ہے۔ جس ماں کو جوان چھوڑ کر گیا تھا، وہ اب جھکی کمر اور نابینا نظر کے ساتھ ملے گی، جس بیوی کا کسا ہوا بدن خون کی فراوانی سے گلابی جھلکتا تھا، آج جھریایا ہوا دیکھے گا۔ یہی سوچتا سوچتا جب وہ گھر کی دہلیز پر پہنچا تو بتیس برسوں سے ضبط کیے ہوئے آنسو تمام بند توڑ کر پھوٹ نکلے اور وہ ماں کے سینے سے لگ کر گم شدہ بچے کی طرح دھاڑ دھاڑ رونے لگا۔ یاسر بھلا کیسے سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیوں اس طرح رو رہا تھا۔ سبھی نے اسے دلاسہ دیا اور اندر لے گئے جہاں وہ بستر پر اس طرح گر پڑا جیسے بتیس برسوں کی لمبی مسافت نے اس کی ہوش مت ختم کر دی ہو۔

☆ ☆

گھر آ کر جیسے اپنی زندگی واپس مل گئی تھی۔ یاسر تو راولپنڈی ہوتا تھا کہ اس کی جاب وہیں تھی لیکن وہ خوش تھا کہ اپنے گھر میں تھا۔ اپنی ماں تھی، بیوی تھی، بہو تھی، پوتی تھی، پوری برادری تھی اور اپنی زمینیں تھیں۔ وہ وقت جو راس الخیمہ کے کیمپ میں سخت پتھر کو کاٹنے جیسا گزارنا پڑتا تھا، یہاں جہلم کے بہتے دھارے جیسا رواں رہتا تھا۔ ہفتہ مہینہ کس طرح گزر جاتے خبر ہی نہ ہوتی۔ گھر میں چار نسوانی وجود۔ اس کے آنگن میں پھولوں کی چار کیاریوں جیسے تھے۔ وہ ان سے سیر ہوتا ہی نہ تھا۔ ایک نشیلے سے سرور میں مست رہتا تھا۔ بیٹے کو ہفتہ، اتوار کی چھٹی ہوتی تو وہ بھی آ جاتا اور باپ بیٹا اکٹھے دو دن گزارتے۔

گھر کی زندگی اس کے لیے اُس جنت کی تعبیر تھی جس کا خواب اس نے عمر بھر دیکھا تھا۔ پوری رات

اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹنا، جدائی کے کسی متعین لمحے کے خوف کے بغیر، یہ بھی اس کے لیے انوکھا لطف ہی تھا۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا کہ عورت لطف تب ہی دیتی ہے جب وہ ہمیشہ پاس رہنے کا احساس لے کر آئے۔ اگر جدائی کا لمحہ مقرر رہے تو اس کی قربت کا لطف لینے کے بجائے انسان اس کی قربت سے ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ لذت کشید کرنے کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اپنی عورت کے پہلو میں پڑے رہنا بھی آسودگی ہے جو شاید دوسری عورت کو چھوڑنے پر بھی نہ مل سکے۔ پھر بیوی کے ہاتھ کا ذائقہ۔ راس الخیمہ میں اپنے ہاتھوں سے یا دوستوں کے ہاتھوں سے بنے کھانے کھاتے وقت بھی وہ یہی ذائقہ یاد کیا کرتا تھا جس میں کچھ خاص نہ ہوتا تھا لیکن اس کے کھرے پیار کا سواد ضرور شامل ہوتا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ ڈالے، محبت کی ایک نظر ہی ڈال دے تو کھانے کا لطف بن جاتا تھا۔ وہ روٹی جو ہاتھوں تک آتی تو روکھی ہوتی، بیوی کی جھکی جھکی نگاہوں کو دیکھتے دیکھتے زباں تک آتی تو شہد و شکر میں گھلتی حلق میں اترتی چلی جاتی۔ اور یہ سب نہ بھی ہوتو اس کے قریب ہونے کا احساس ہی اسے سکھ دیتا تھا۔ اس کے پیروں کی آہٹ ہوتی، اس کی چوڑیاں [illegible]، اس کی آواز سنائی دے جاتی، اس کے رنگین کپڑوں کی ایک جھلک ہی دکھائی دے جاتی تو وہ چہک اٹھتا تھا۔ بیوی سے بھی زیادہ سکھ اسے ماں کے پاس بیٹھ کر ملتا تھا۔ اصل رشتہ تو اسی کے ساتھ تھا۔ باپ تو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی اگلی دنیا کو سدھار گیا تھا۔ بچپن سے جوانی تک اس کے لیے دنیا میں واحد آسرا، اپنی ماں ہی تھی۔ یہ ماں اب بوڑھی تھی اور اس سے خدمت کی متقاضی تھی۔ بیٹا بھی کوئی کمی نہ رہنے دیتا اور ماں کے ہونٹوں سے نکلی ہر بات پوری کرتا۔ اس کی بہو خلیہ پڑھی لکھی تھی۔ اچھے سلیقے والی اور بہت زیادہ خوبصورت۔ اسے اپنے گھر میں دیکھنا ہی ایک انوکھی مسرت کا باعث بنتا تھا۔ وہ خوش ہوتی تو جان لیتا کہ بیٹا بھی خوش ہے اور بیٹے کی خوشی کا سوچ کر وہ قربان ہوتا رہتا۔ پھر اس کی لاڈلی رامین تھی۔ دو سال کی معصوم کلی۔ پورے گھر کی رونق۔ اپنی تتلی تتوڑی باتوں سے گھر بھر کو چہکائے رکھتی اور پھرکی کی طرح گھومتی اپنے وجود کی خوشبو سے ہر جگہ کو مہکائے رکھتی۔ بہت تیز تھی اور چپ ہونا جانتی تھی نہ کسی جگہ بیٹھنا۔ ان کا گھر خوشیوں کا ازلی بسیرا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے مولا کا شکر ادا کرتا جو اسے اپنے گھر میں یوں واپس لے آیا۔ اس نے انھی خوشیوں کی دعا مانگی تھی۔ اگر خالد کی طرح آتا تو کیا یہ سب ایسے ہوتے؟

گھر میں اس کی زندگی سکھ سے عبارت تھی تو گھر سے باہر کی زندگی سکون کا دوسرا نام تھی۔ تین دہائیوں سے ترسے ہوئے کے لیے اپنے گاؤں میں ہونا بھی سکھ تھا۔ اس کے سگے بہن بھائی تھے۔ ان کی اولادیں تھیں۔ اچھی خاصی وسیع برادری تھی۔ وہ ان میں محو ہو کر رہ گیا۔ صبح گھر سے نکلتا تو شام تک ایک ایک کر کے برادری کے سبھی گھر گھوم آتا تھا اور گویا نئے سرے سے برادری میں داخل ہو کر ایک اہم فرد بن چکا تھا۔ بیاہ

شادی اور مرنے کی رسموں میں پوری تندہی دکھاتا۔ زندگی بتیس برسوں بعد ملی تھی تو وہ اس میں پوری طرح شامل ہونے کی خواہش بھی رکھتا تھا۔ جو آگے تھوڑے سے دن اس کے پاس رہ گئے تھے، ان میں پچھلے برسوں کی کمی بھی پوری کرنا چاہتا تھا۔

یہ سب لطف اپنی جگہ لیکن چار مہینے رہنے کے بعد اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اُس کی اپنی خوشی درست مگر گھر والوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی آمدنی ختم ہونے سے گھر کے حالات پر واضح اثر پڑا ہے۔ گھر میں سب کو اپنی ضروریات محدود کرنی پڑ رہی تھیں۔ بیوی ہر معاملے میں کفایت کا سوچتی تھی۔ کھانے اور کپڑوں کے ہر خرچ پر احتیاط کی نظر ہوتی تھی۔ کتنے دنوں سے گھر میں دال سبزی کے علاوہ کچھ ڈھنگ کا نہیں بنا تھا۔ یاسر بھی ہر ہفتے آنے کے بجائے دو تین ہفتے بعد آنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ چھوٹی رامین کے لیے بھی کپڑے خریدتے وقت سستے کپڑوں کی تلاش رہتی تھی۔ ایک دن اس نے رامین کو وہی جوتے پہنے دیکھا جو وہ ابوظہبی سے آتے وقت چار ماہ پہلے لایا تھا۔ وہ پوری طرح گھس چکے تھے لیکن وہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ یاسر پر بہت نازاں تھا، اس کی پڑھائی اور انجینئر کی نوکری پر اتراتا تھا لیکن ابھی اس پر منحصر رہ کر اسے نظر آیا تھا کہ اس کی نوکری کچھ خاص نہ تھی۔ نجی کمپنی میں سب انجینئر کی ملازمت۔ برائے نام تنخواہ۔ اس نے حساب لگا کر دیکھا۔ وہ خود ایک ان پڑھ مزدور تھا لیکن یو۔ اے۔ ای میں اس کی تنخواہ یاسر سے تین چار گنا زیادہ ہی رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں پڑھے لکھے کی اتنی بھی قدر نہیں جتنی ابوظہبی میں ان پڑھ کی ہوتی ہے۔ اب اسے سمجھ بھی آ گیا کہ کیوں بھی پڑھے لکھے نوجوان یو۔ اے۔ ای میں نوکری کرنے چلے جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ بیٹے کو تمام عمر کیوں پڑھایا تھا۔ آخر اس نے اتنی محنت کیوں کی تھی۔ تاکہ بیٹے کی زندگی بہتر ہو جائے اور اگر بیٹے کو سوکھی روٹی کے ٹکڑے ہی ملتے ہیں تو اس کی محنت اور بیٹے کی پڑھائی کا کیا فائدہ۔

ایک دن اس نے یاسر سے کھل کر بات کی۔

”یاسر بیٹا! تمھیں اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہیے۔ تمھارے پیسوں سے تمھارا گھر نہیں چل سکتا۔ آخر تم انجینئر ہو۔ وہ تو اتنا کماتے ہیں۔“

”ابا جی! آپ کو پاکستان کے حالات کی خبر نہیں۔ میں تو شکر گزار رہوں کہ یہ نوکری بھی ملی ہوئی ہے ورنہ ہمارے ہاں انجینئر تو اس طرح رُل رہے ہیں جیسے ٹافیوں کے ریپر۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں۔“

”لیکن یوں گھر کا نظام کیسے چلے گا۔“

”ابا جی! پاکستان میں رہ کر تو یہی نوکری ہے۔ اسی میں آہستہ آہستہ ترقی ہو گی تو شاید کچھ بہتر ہو جائے۔ انجینئر اگر حرام نہ کھائے تو اتنا کچھ ہی کما سکتا ہے۔“

”لیکن پُتر! انجینئر لوگ تو بہت زیادہ کماتے ہیں۔“ اس نے حیران ہوکر پوچھا۔

”ابا جی! وہ آپ نے یو۔ اے۔ ای میں دیکھا ہوگا۔ یہاں وہ حساب نہیں۔ جس کسی کا ڈائریکٹ چھکا لگ گیا، کسی بڑی کمپنی میں، تو اس نے چوپڑ کے کھائی ہیں، نہیں تو ہماری طرح سوکھی پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اب باہر جانے کی ٹرائی کروں۔“

”نہیں۔ تم باہر ہرگز نہ جاؤ گے۔ ہم سوکھی کھالیں گے۔ آدھی کھالیں گے مگر تمھیں باہر جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ پردیس کا دوزخ میں نے ساری زندگی کاٹا ہے۔ میرا بیٹا بھی اسی سے گزرے، یہ میں دیکھ نہ پاؤں گا۔“

اس تصور سے ہی اس کا وجود کپکپا گیا تھا کہ بیٹا وہی زندگی گزارے گا جو اس نے گزاری ہے۔ گو کہ وہ جانتا تھا کہ ایک انجینئر کو بہت سی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور وہ مزدور کی سی مشکل زندگی نہیں گزارے گا لیکن پھر بھی پردیس، پردیس ہی ہے۔ تمام عمر اس نے سُکھ اور دکھ کے معانی یہی متعین کیے تھے کہ سُکھ دیس ہوتا ہے اور دُکھ پردیس۔ تو اپنے بیٹے کے کندھوں پر دُکھ کی گٹھڑی لادنے کا وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

بیٹا پنڈی واپس چلا گیا تو اس نے خود کچھ کرنے کا سوچا۔ مزدوری وہ کر نہ سکتا تھا۔ اتنی مدت باہر رہنے کی وجہ سے اس کی خاصی عزت بنی ہوئی تھی۔ جب بھی چھٹی آتا، جھک سفید کپڑوں میں دن گزارتا تھا اور گردن خم رکھ کر بات کرتا تھا۔ اب وہی آدمی سب کے سامنے گردن جھکا کر اور گندے کپڑوں میں جانے کا کیسے سوچتا۔ اپنا کھیتی کا کام البتہ ایسا تھا جسے کرنے میں کوئی توہین نہ تھی۔ سو اس نے کھیتی باڑی پر محنت کرنے کی ٹھان لی۔ ٹھیکیداروں سے زمین واپس لے لی اور خود کام کرنا شروع کردیا۔ اب کون سا بیلوں سے ہل چلانا تھا۔ سارا کام مشینوں نے کرنا تھا۔ زمینداری کو ہاتھ لگائے مدتوں گزر گئی تھیں لیکن جٹ پُتر ہونے کی وجہ سے کھیتی کا کام اس کے خون میں تھا۔ دس بیگھے زمین تھی اور بارانی علاقے کی عام زمینوں کی طرح یہ چھ مختلف جگہوں پر تھی۔ اتنی سی زمین کے لیے اپنا ٹریکٹر کون خریدتا اور خریدتا بھی کہاں سے۔ دوسرے ٹریکٹر والوں کو کرایہ دے کر ان سے کھیت تیار کیے۔ جب اسوج کے آخر پر کھیتوں کی مٹی نرم ہوگئی تو اس نے خود ان میں کھاد ڈالی۔ یہ عمل خاصا خوشگوار رہا۔ چون سال پرانے پاؤں جب صبح صبح کھیتوں کی مٹی سے مس ہوتے تو ٹھنڈک کی تازگی اس کے پورے وجود میں اتر جاتی اور اس کے بدن کی تمام حسیات جوان لگتیں۔ ممتا سے بھری ایسی ٹھنڈک تو ان صحراؤں میں کبھی نصیب نہ ہوئی تھی جہاں اس نے زندگی گزار دی تھی۔ کھاد ڈالنے کے تین دنوں میں اس کے حوصلے پھر سے ہرے ہوگئے۔

اس کی بیوی نے اس دوران اسے سمجھایا تھا کہ کھیتی کا کوئی فائدہ نہیں۔ اتنی محنت کے بعد جو کچھ ہاتھ

آئے گا۔ اسے دیکھ کر الٹا رونا ہی آئے گا لیکن اس پر جنون سوار تھا گھر کے حالات سنوارنے کا۔ فارغ بیٹھنا اسے گوارا ہی نہ تھا، سو کھیتی میں ہی جتا رہا۔ بیوی چار و نا چار مدد کر دیتی اور ماں دعائیں۔ جب بھی کھیتوں میں گندم کاشت کر دی تو بھی کھیتوں کا خیال رکھتا۔ ضروری کام کوئی نہ ہوتا تھا، صرف فصل دیکھنے کے لیے کھیتوں کا چکر ضرور لگاتا۔ چھوٹی رامین کو کندھوں پر بٹھاتا اور کسی نہ کسی کھیت کا چکر لگا آتا۔ وقت گزاری کے لیے کبھی کسی کھیت سے جڑی بوٹیاں نکالنی شروع کر دیں۔ کبھی کسی سے کسی کا کونہ درست کیا، کبھی منڈیر سیدھی کر دی۔ رامین کو منڈیر پر بٹھا دیتا اور کام کے ساتھ ساتھ دنیا جہان کی کہانیاں سنائے رکھتا۔ ان کہانیوں میں سب سے حاوی رنگ اپنی مٹی سے محبت کا ہوتا۔ اپنی دھرتی کا حسن بتاتا اور اسے بتاتا کہ اپنی زمین ہو تو آسمان بھی مہربان ہوتا ہے ورنہ دونوں ہی ظالم ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے رو رو کر وہ دُکھ سناتا جو شہزادے کو پردیس میں سہنے پڑتے تھے اور مسکراتی آنکھوں سے کہانی کو ختم کرتا جب شہزادہ اپنی سرزمین کی آغوش میں پہنچ جاتا۔ کہانیوں کے ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے خود اسے فصل کی ہری ہری خوشبو محسوس ہوتی تو وہ نشے سے لہک جاتا۔ جڑی بوٹیوں کے اکھیڑنے پر مٹی کی جو خوشبو پھوٹتی، ہاتھوں پر جڑی بوٹیوں کا رس مہکتا تو وہ خود بھی تازہ ہوا ٹھتا۔ شامہ کے اندر بھی مدتوں کی خشک بے حس ریت کی دھول نکلنے لگی تھی۔ اس کے حواس اپنی مٹی کی خوشبوؤں، لمس اور رنگت سے دوبارہ آشنا ہوتے جا رہے تھے اور وہ اپنی شہزادی پوتی کو سناتا کہ پردیس میں جانے والے شہزادے کو کیسی پھیکی مٹی پھانکنی پڑی تھی جب کہ اس کی اپنی سرزمین کی مٹی ایسی رنگ رنگیلی تھی کہ بھی حواس کی بھوک مٹاتی چلی جاتی تھی۔ وہ پوتی کو کھیتوں میں کھلا چھوڑ دیتا اور جب وہ مٹی سے رُبڑ جاتی تو اسے دیکھ دیکھ کر نہال ہوتا۔ اس کی پوتی اپنی مٹی کے حسن سے آشنا تھی۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار تھی۔

جب گھر آتا تو آنے والی فصل کی امیدوں سے اس کا چہرہ لشک رہا ہوتا تھا۔ اپنی بوڑھی ماں سے اچھی فصل کے لیے دعا کرواتا اور بیوی سے فصل کی آمدنی پر کچھ نیا دلوانے کا وعدہ کرتا۔ بہو کھانا سامنے رکھتی تو اس پر واری صدقے ہو جاتا۔ گھر کے حالات خاصے سخت تھے اور وہ دیکھتا رہتا کہ بھی لوگوں کو اپنی ضرورتوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے لیکن وہ آنے والی فصل سے پرامید تھا۔ فصل توقع کے مطابق ہوئی اور قدرت مہربان رہی تو اتنا کچھ مل جائے گا کہ سال بھر آرام رہے گا۔ خود نہ سہی تو کم از کم بہو اور پوتی کو تو اچھا کھلا پہنا سکیں گے۔

کھیتوں میں کام کے دنوں میں اس نے دیکھا کہ لوگوں کی نظروں میں اس کی تکریم کم ہونے لگی تھی۔ وہ اس کے کام کی وجہ سے اسے کم تر سمجھا جاتا تھا۔ کوئی ہمدرد ہوتا تو اسے رستہ چلتے روک لیتا اور جتاتا کہ عمر بھر کام کرنے کے بعد اب آرام تمھارا حق ہے۔ چھوڑ دو یہ کام اور بیٹھ کر زندگی کا مزا لو۔ کچھ اس کے گندے کپڑوں پر جملہ کس دیتے اور کوئی اس کے تھکے ہوئے بدن پر۔ کھیت میں کام کے دوران کئی دفعہ دوسرے

کسانوں نے اسے ہانک لگائی کہ دبئی کا شہزادہ یہاں کھیتوں میں کام کرتا اچھا نہیں لگتا۔

جس برادری کے ہر گھر سے ایک دو افراد باہر کے ملکوں میں سیٹل ہوں، اُن کا رہن سہن اور طرح کا ہوگا۔ وہاں ایک غریب کسان جو دن بھر اپنی زمینوں پر کَسّی چلاتا ہو، مٹی سے لتھڑا رہتا ہو، اس کی کیا عزت ہو گی۔ کہیں آنا جانا تو پہلے سی آؤ بھگت نہ ہوتی۔ برادری کے معاملات میں اس کی رائے کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ وہ جان گیا کہ لوگ منہ کا لحاظ رکھتے ہیں ورنہ دل سے چاہتے ہی نہیں کہ یہ ان کے ساتھ بیٹھے۔ خیر اسے ان کی پروا بھی اتنی نہ تھی۔ اتنی مدت باہر رہنے کی وجہ سے اکیلے رہنے اور اکیلے کام کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اسے تو غرض تھی اپنے گھر کے حالات سنوارنے سے۔ گھر کا بوجھ بانٹنے سے۔ اس کا دھیان کہیں اور کیسے جاتا۔

اپریل میں جب اسے گھر آئے پورا سال بیت چکا تھا، گندم پک کر تیار تھی۔ اس نے مزدوروں کو پیسے دے کر فصل کٹوائی، پھر اکٹھی کر کے گہوائی۔ جب گندم کا ڈھیر اس کے صحن میں آ لگا تو گندم کی کلٹر سے اتا ہوا اُس کا وجود سرشار ہو رہا تھا۔ یہ گندم نہ تھی، سونا تھا جو اس کے اپنے کھیتوں نے اُگلا تھا اور اس کی چمک سے اس کے اہلِ خانہ کے چہرے روشن ہونے تھے۔ وہ کتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ رامین عادت کے مطابق اس میں دھمال ڈالتی رہی اور خوب کلٹر تی رہی۔ اس کی خوشی دیکھ دیکھ وہ بھی خوش ہوتا رہا۔ اس کی بیوی اور بہو خالی توڑے لے آئیں اور انہوں نے گندم اُن میں بھرنی شروع کر دی۔ وہ بھی ساتھ لگ گیا اور گھر کی سالانہ ضرورت کے مطابق پندرہ توڑے بھر کے ایک طرف رکھ دیے گئے۔ اب باقی گندم فروخت کرنا تھی۔ گاہک پہلے سے نمبر لگا گئے تھے۔ دو ہی دنوں میں ساری گندم نکل گئی۔ تقریباً ایک سو دو من ہوئی تھی۔ اس نے حساب لگایا۔ کل ملا کر ایک لاکھ دو ہزار روپے کی گندم فروخت ہوئی تھی۔ یہ تو اس کی ضرورت سے بہت کم تھی۔ بارانی زمین میں دوسری فصل ہونی بھی نہ تھی۔ یہ سال بھر کا حاصل تھا۔ پانچ دفعہ ہل چلوانے کے بیس ہزار۔ کھاد کے پندرہ ہزار۔ بجائی کے پانچ ہزار۔ کٹوائی کے بیس ہزار۔ گہوائی کے پانچ ہزار۔ کل ملا پینسٹھ ہزار کا خرچ۔ یعنی سال بھر کی بچت چالیس ہزار۔ اور اس میں اپنی چھ مہینے کی بھاگم بھاگ، یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد چالیس ہزار۔ یعنی مہینے کے تین ہزار۔ اُدھر یو۔ اے۔ ای میں وہ بھلے مزدور تھا، برے حالوں رہتا تھا، چالیس ہزار تو ہر مہینے گھر بھجوا دیتا تھا۔ زمین کی یہ آمدنی تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس پر کون گزر کر سکتا تھا۔ اس نے زمین داری سے ہاتھ اٹھا لیا۔

آنے والے دن اس کے لیے کچھ زیادہ تشویش کے تھے۔ بیٹے کی آمدنی اکیس ہزار تھی۔ جب وہ یو۔ اے۔ ای میں تھا تو گھر میں کل ساٹھ ہزار آتے تھے اور ان کے گھر والے آرام کی زندگی گزارتے تھے۔ اب صرف یاسر کے اکیس ہزار پر انھیں گزارا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی لیے تو سال بھر میں ان سب کے چہرے مرجھا گئے

تھے۔ اوپر سے وہ خود ایک بوجھ کی صورت گھر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ کچھ تو اُس پر خرچ ہو ہی جاتا ہوگا۔ آمدنی کا اچھا خاصا حصہ ایک بے کار آدمی پر لگ رہا تھا۔ ماں مستقل بیمار تھی۔ اس کی دوا کا خرچ لازمی ہوتا تھا۔ اُس میں تخفیف نہ ہو سکتی تھی۔ وہ کس دل سے کہہ پاتا کہ ماں کی دوا بھی گھر پر ایک بوجھ تھی۔

کتنے دن گزر گئے تھے، گھر میں نہ کسی کو اچھا کھاتے دیکھا تھا نہ کسی کو اچھا پہنتے۔ ماں اور بیوی تو خیر عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں نیا پہننے کی خواہش کنارے لگ چکی تھی لیکن شنطیہ جسے بیٹا بڑے چاؤ سے بیاہ کر لایا تھا اور رامین جو پورے گھر کا واحد بچہ تھا، دونوں گھسے ہوئے کپڑوں میں پڑی ہوں تو ترس کیوں نہ آئے۔ رامین کو الم بلم کھانے کا بہت شوق تھا۔ دکان پر جاتی تو اس کی خواہش ہوتی کہ کھانے کے قابل ہر چیز اس کی جھولی میں آ جائے جب کہ گنجائش محض کسی ایک چیز کے خریدنے کی ہوتی۔ وہ بے چاری کیا سمجھتی کہ اب دادا ابو کی آمدنی نہیں رہی۔ وہ تو دادا ابو کو پاس دیکھ کر اور مچل جاتی تھی۔ ایک دو دفعہ اس نے رامین کو من پسند چیزیں خرید بھی دیں مگر اس فضول خرچی پر اس کی بیوی نے ہی اس کی سرزنش کی۔ دادا نے عذر پیش کیا کہ بچی رو رہی تھی لیکن دادی نے یہ کہہ کر عذر ایک طرف بٹھا دیا کہ بچوں کا کیا ہے، وہ تو کسی بھی چیز کے لیے مچل جاتے ہیں۔ اپنی جیب دیکھ کر ہی بچے کی فرمائش پوری کرتے ہیں ورنہ بچے خود بھی خراب ہوتے ہیں، گھر والوں کو بھی خراب کرتے ہیں۔' اس پر دادا مسوس کر رہ گیا تھا لیکن بول نہ سکتا تھا کہ بات اس کی درست تھی۔ اس کے بعد کئی دفعہ ایسا ہوا کہ اس نے اپنی شہزادی پوتی کو کسی چیز کے لیے روتے اور ماں اور دادی کی ڈانٹ کھاتے سنا۔ لیکن وہ اپنے کان بند کر لیتا اور گھر سے باہر نکل جاتا۔

پہلے پہلے وہ رامین کو لے کر گھماتا تھا۔ اپنی برادری کے کبھی گھروں میں لیکن آہستہ آہستہ اس نے اسے کہیں بھی لے جانا چھوڑ دیا۔ وہ جہاں بھی جاتی، وہاں کے بچوں کے کھلونے یا کپڑے دیکھ کر مچل جاتی۔ انھیں کوئی چیز کھاتے دیکھتی تو ندیدوں کی طرح پیچھے پڑ جاتی۔ رشتے دار اس کی طرف کبھی سوالیہ اور کبھی ترس آمیز نگاہوں سے دیکھتے اور وہ شرمندہ ہاتھوں سے اُسے اٹھائے واپس آ جاتا۔ بھوک اپنے گھر میں آ رہی تھی مگر عزت سب کے گھر سے جا رہی تھی۔ اوپر سے اپنی پوتی کو یوں دیکھنے کا یارا اُس کی آنکھوں میں نہ تھا۔ عمر یو۔ اے۔ ای میں اس لیے گزار دی تھی کہ اپنے گھر کے حالات بہتر ہو جائیں لیکن اب بھی اس کی پوتی پسند کا کھلونا نہ لے سکے، مرضی کے کپڑے نہ پہن سکے، حتیٰ کہ ٹافی تک نہ خرید سکے تو خاک حاصل ہوا اس محنت سے۔

انھی دنوں رامین کے سکول جانے کی عمر ہو گئی۔ سکول بھیجنے کی تیاری ہونے لگی۔ اس نے کافی سارے سکول خود جا کر دیکھے۔ ایک اپنے گاؤں کا سرکاری سکول تھا۔ دو پرائیویٹ۔ گورنمنٹ سکول کا حال ہی

بالکل پتلا تھا۔ پرائیویٹ بھی کچھ خاص نہ تھے۔ دو گاؤں آگے قصبے میں ایک اچھا اسکول ملا۔ اس کا ماحول دیکھ کر اس کی خواہش ہوئی کہ رامین یہیں پڑھے۔ مگر وہاں کی فیس اور آنے جانے کے اخراجات ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ وہ بجھ کر رہ گیا۔ آخر کار دادی نے ایک دن رامین کو سرکاری سکول میں داخل کروا دیا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح سینکڑوں بچوں کے درمیان برے حالوں میں ٹھنسی اپنی پوتی کا سوچ کر اس کے سینے میں کچھ پگھلنے لگا مگر وہ کچھ کر نہ سکتا تھا البتہ اتنا اس کے جی میں ضرور آیا کہ یاسر سے کہوں گا، کچھ کرے۔ اگر اس نے ایک مزدور ہو کر اپنے بیٹے کو اچھے سے اچھا پڑھایا تو ایک انجینئر کی اولادیں سسک کر کیوں پڑھے گی۔

برادری میں ایک شادی آ گئی تھی۔ اس پر کچھ خرچ کرنا تھا۔ ان کے پاس تھا کیا جو خرچ کرتے۔ بمشکل کسی سے قرض مانگ کر شادی میں شرکت کی۔ وہ بھی اس حال میں کہ بیوی اور بہو دونوں نے پرانے کپڑوں میں گزارا کیا۔ شادی میں شرکت کی خوشی کے بجائے محض اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کی خواہش غالب رہی۔ سب ایک دوسرے کی طرف شرم سے دیکھتے رہے لیکن اپنے گھر کی عزت رکھنی تھی اس لیے کوئی کچھ بولا نہیں۔

شادی ہفتہ اتوار کو تھی۔ یاسر بھی آیا ہوا تھا۔ ہفتے کی رات یاسر اور باپ اکٹھے بیٹھے تو باپ نے اسے کسی اور نوکری کی تلاش کی تلقین کی۔ یاسر نے مطلع کیا کہ 'مسقط کی ایک فرم میں نوکری کا چانس بنا ہے۔ وہ اس نوکری کے لیے اپلائی کر رہا ہے۔' بیٹے کے باہر جانے کی بات سن کر وہ ٹوٹ سا گیا۔ حالات وہ دیکھ چکا تھا۔ کچھ بولنا بنتا ہی نہ تھا۔

اتوار کی شام یاسر نے واپس پنڈی جانا تھا۔ وہ واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔ اور اپنا سامان تقریباً پیک کر چکا تھا جب اندر سے باپ باہر آیا اور بولا:

"یاسر پتر! پاسپورٹ کدھر ہے تمھارا؟"

"یہ میرے پاس۔"

"ذرا دکھانا مجھے۔"

"کیوں ابا جی؟ آپ نے دیکھ کے کیا کرنا ہے۔" یاسر تھوڑا جھجکا۔

"دکھاؤ تو سہی۔ کچھ کرنا ہے تو کہہ رہا ہوں نا۔"

یاسر نے پاسپورٹ جیب سے نکال کر اسے تھما دیا۔ باپ نے پاسپورٹ اپنی بیوی کے حوالے کر دیا اور بولا:

"ایسا کر، یہ پاسپورٹ سنبھال کر اندر رکھ دے۔ میرا پاسپورٹ میرے اٹیچی کیس سے نکال کر مجھے لا دے۔"

بیوی اندر چلی گئی جب کہ یاسر اور بہو دونوں حیران وہیں کھڑے تھے۔

"جب باہر جانا ہی ہے تو وہ جائے جسے یہ دُکھ سہنے کی عادت ہے۔"

"مگر ابا جی! آپ کی عمر......"

"کچھ نہیں میری عمر کو۔ جب تک کام کر سکتا ہوں، کرتا رہوں گا۔ ابھی کون سا مرنے والا ہوں۔"

"مگر ابا جی جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے آپ کام کیوں کریں گے؟ لوگ کیا کہیں گے؟"

"میں اس لیے کروں گا کہ میں ابھی کر سکتا ہوں۔ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہو۔ تمھیں نہیں پتا کہ پردیس کتنی ظالم چیز ہے۔"

اندر سے بیوی پاسپورٹ لے کر آ گئی۔ اس نے پاسپورٹ تھاما اور بیٹے کو دکھایا۔

"دیکھو! ابھی میرا پاسپورٹ ایکسپائر نہیں ہوا۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں اور یو۔ اے۔ ای کے لیے ویزا ڈھونڈتا ہوں۔ امید ہے کہ اپنی ہی کمپنی میں دوبارہ رکھ لیں گے۔"

"ابا جی! آپ کیوں جا رہے ہیں؟" بہو کی نظروں میں شکایت تھی۔

"ابا جی! آپ مجھے ہی جانے دیں۔ آپ اب گھر میں بیٹھ کر آرام کریں۔ آپ کی عمر کام کرنے کی نہیں ہے۔" یاسر نے باصرار کہا۔

"تمھیں کس نے کہا کہ میری عمر ایسی نہیں ہے۔ جٹ پتر ہوں۔ آخری سانس تک کام کر سکتا ہوں۔ اور اب تو جینا مرنا ہی ادھر ہے۔ جب تک زندہ رہا......اور مر گیا تو......"

یاسر چپ رہا۔ اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

"او کملیا! بول نا کہ زندہ ہاتھی لاکھ کا مردہ ہاتھی تیں لاکھ کا۔"

یہ کہہ کر اس نے بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ بہو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ماں سے ہاتھ چھڑوایا اور رامین کے دونوں گالوں کو چومنے کے بعد بیٹے کا بیگ اٹھائے اس کے آگے آگے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆

منیر احمد فردوس

ہارے ہوئے میچ کی جیت

ٹیم کے دیگر کھلاڑیوں کے ہمراہ سٹیڈیم میں قدم رکھتے ہی وہ ایک پل کے لیے تو دنگ رہ گیا۔ اتنا خوبصورت فٹ بال سٹیڈیم اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ چاروں طرف رکھی رنگ برنگی منقش کرسیوں سے ایسا منظر تخلیق کیا گیا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے سٹیڈیم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ مختلف رنگوں کے شیشوں والے کیبن اور دودھیا قمقموں کی لہراتی روشنیوں میں گیلریاں دور سے ہیروں کی مانند چمکتی نظر آتیں۔ وی آئی پی انکلوژرز پر تو آنکھیں ہی نہیں ٹک پاتی تھیں جن کے ماتھے پر رنگ بدلتی دوڑتی ہوئی روشنیاں ایک الگ ہی منظر پیش کر رہی تھیں اور ہر طرف لگی ہوئی قدِ آدم سکرینیں سٹیڈیم کے چپے چپے کی اتنی بڑی بڑی ویڈیوز دکھا رہی تھیں کہ دیکھنے والا حیرت کی بارشوں میں بھیگ جائے۔

اس نے اوپر نگاہ ڈالی تو جگنوؤں کی طرح جگمگ کرتی چھت دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یہ پہلا اِن ڈور فٹ بال سٹیڈیم تھا جس کی چھت درمیان سے شق ہو کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی اور اوپر سے نیلگوں آسمان جھانکنے لگتا تھا۔ جدید ترین سٹیڈیم کا بیرونی منظر بھی کسی عجوبے سے کم نہ تھا کہ دور سے یوں لگتا جیسے سڑک کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی فٹبال پڑی ہو۔ وہ ایک مایہ ناز کھلاڑی تھا اور دنیا کے کئی ملکوں میں کھیل چکا تھا مگر ایسا خوبصورت سٹیڈیم اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

وہ بطور کپتان اپنی ٹیم کے ساتھ اس نئے فٹ بال سٹیڈیم میں ہونے والا پہلا میچ کھیلنے آیا تھا اور اس وقت ٹیم کے دیگر کھلاڑیوں کے ساتھ مل کر پریکٹس کرنے میں مصروف تھا۔ اُسے اس بات پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ اتنے شاندار اور جدید ترین سٹیڈیم کے افتتاحی میچ کے لیے ان کی ٹیم کا انتخاب کیا گیا تھا۔ وہ ہر صورت یہ میچ جیت کر اپنے لوگوں کے چہروں پر ایک تاریخی خوشی لکھنے کا خواہشمند تھا۔

ٹیم کے فزیو اور کوچ کی مدد سے شام تک پریکٹس کے دو تین سیشن چلتے رہے۔ اس نے اپنے ساتھی کھلاڑیوں سے مل کر ونگ تکنیک کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ان تھک محنت کرتے ہوئے خوب پریکٹس کی۔ اپنی ٹیم کی کڑی محنت پر اس کا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ مضبوط حریف کو شکست کے جال میں بآسانی پھنسایا جا سکتا ہے۔

رات کو کھلاڑیوں اور ٹیم انتظامیہ کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ سونے سے پہلے حسب معمول اس نے ٹی وی لگا لیا۔ اپنے پسندیدہ سپورٹس چینل پر ایک پرانے فٹ بال میچ کی جھلکیاں دیکھنے کے بعد وہ ریموٹ کا بٹن دباتا چلا گیا۔ چینل تیزی کے ساتھ سرکتے جا رہے تھے کہ اچانک اس کی انگلیاں جم سی گئیں۔ کسی چینل پر اس نئے سٹیڈیم کے بارے میں ایک رپورٹ دکھائی جا رہی تھی، جہاں اس نے کل افتتاحی میچ کھیلنا تھا۔ جگمگاتے اور انوکھے سٹیڈیم کو ٹی وی سکرین پر دیکھ کر اس کی دلچسپی بڑھ گئی اور وہ نظریں گاڑے رپورٹ دیکھنے لگا۔ منفرد سہولتوں سے آراستہ سٹیڈیم کے مختلف جادوئی مناظر نے اُسے مزید حیران کر دیا۔

جی ناظرین... آپ نے اس جدید ترین فٹبال گراؤنڈ کے حیران کر دینے والے مختلف حصے دیکھے جہاں کل پہلا میچ کھیل کر ایک تاریخ رقم کی جا رہی ہے۔ یقیناً اس پر بہت خرچ کیا گیا ہے۔ ساری دنیا کی نظریں اس چمکتے دمکتے گراؤنڈ پر لگی ہوئی ہیں اور اسے دیکھ کر دنیا حیران ہو رہی ہے مگر اس چکا چوند میں کوئی نہیں جانتا یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے، چمکتا ہوا رخ۔ اور اس کے دوسرے رخ سے دنیا والے مکمل طور پر بے خبر ہیں مگر اس کا دوسرا رخ ہم آپ کو دکھائیں گے بھی اور بتائیں گے بھی۔

ناظرین...! اتنا جدید سٹیڈیم دیکھنے کے بعد کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ جس جگہ پر یہ شاندار فٹ بال گراؤنڈ تعمیر کیا گیا ہے وہ پہلے کس کی ملکیت تھی اور مالکان اس وقت کس حال میں ہیں؟ آیئے اس روشن تصویر کا دوسرا رخ ہم آپ کو دکھاتے ہیں۔"

حجاب اوڑھے پروگرام کی میزبان نے کہا اور اس کے بعد اچانک سٹیڈیم کی جگہ ایک عجیب سا منظر سکرین پر جھلملانے لگا۔

وہ کوئی خیمہ بستی تھی جہاں حدِ نگاہ تک خیمے ہی خیمے نصب تھے جو موسلا دھار بارش میں بری طرح سے بھیگ رہے تھے۔ خیموں کے اندر کے دل خراش منظر دیکھ کر وہ بے چینی سے پہلو بدل کر اٹھ بیٹھا۔ سردی سے ٹھٹھرے ہوئے معصوم بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے چمٹے ہوئے تھے اور بوڑھے جوان مرد و عورتیں کمبلوں چادروں میں دبکے رستے ہوئے خیموں میں بے یار و مددگار پڑے سردی کا مقابلہ کر رہے تھے جن کے اترے ہوئے چہروں پر دکھوں کی بارش ہو رہی تھی۔

وہ یہ المناک منظر دیکھ کر تڑپ اٹھا اور جلدی سے موبائل پر اپنے سبھی ساتھیوں کو میسج کر کے رپورٹ دیکھنے کو کہہ دیا۔ یہ خیمے نہیں بلکہ زمین کے سینے پر اگی ہوئی وہ المناک کہانیاں تھیں جن کے سسکتے کرداروں سے دنیا بے خبر تھی۔ خیموں کے اندر دکھوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ کہیں سوکھے سڑے وجود بھوک کی خوراک بنے

ہوئے تھے تو کہیں جھانکتی ہوئی موت کے سامنے لاغر بیمار جسموں کو ڈرپیں لگی ہوئی تھیں۔ کسی خیمے میں چپکے سے آنسو بہاتی ویران آنکھیں تھیں تو کہیں کسی لاش کے گرد بین کرتے ہوئے بے بس و لاچار لوگ تھے۔ یہ مناظر دیکھ کر وہ ایک دکھ بھری بے چینی میں مبتلا ہوگیا۔

جی ناظرین...! آپ نے دیکھا ان نہتے اور بے گھر لوگوں کو جو اس جگہ کے مالک ہیں جہاں اس وقت دنیا کا جدید ترین سٹیڈیم کھڑا کر کے اس کے کرتا دھرتا خود کو تہذیب یافتہ قوم کہتے نہیں تھکتے۔ مگر دنیا خاموش ہے اور وہ خاموش ہی رہے گی کیوں کہ خیموں میں سسکتے بلکتے ان مظلوم لوگوں کو اس حال میں پہنچانے والی وہی نام نہاد مہذب قوم ہے جس کے حکمران دنیا میں امن کے نام پر بار رو د بو رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ دنیا ان کے مکر و فریب کے جال میں جکڑی ہوئی ہے اور وہ صرف وہی دیکھتی ہے جو اسے دکھایا جاتا ہے، اس لیے اِن بے سہارا لوگوں سے ان کی زمین، ان کی ماں دھرتی چھین کر اور انھیں اس ابتر حالت میں قید کرنے کے باوجود ہر طرف سکھ چین کے ڈھنڈورے پیٹے جا رہے ہیں مگر سچ ہم جانتے ہیں اور ہم یہ کڑوا سچ کل عالم میں پھیلا کر رہیں گے۔ ہم تبھی قوموں کی ہمدردی حاصل کر کے ان مظلوموں کی آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچائیں گے تا کہ انھیں انصاف مل سکے۔

ناظرین...! ابھی تک آپ نے تصویر کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے، اس کے بہت سے پہلو دکھانا ابھی باقی ہیں، جن سے آپ پوری طرح واقف نہیں ہوں گے۔ میزبان نے بارش سے بچنے کے لیے بڑی سی کالی چھتری تھامے مائیک ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا جو رستے ہوئے خیموں کے آگے ہی کھڑی تھی۔ اس کے بعد خیمہ بستی معدوم ہونے لگا اور اس کی جگہ ایک اور منظر سکرین پر جاگ اٹھا۔

وہ قریبی ملک کا ایک بہت بڑا سرحدی علاقہ تھا جہاں ایک پورا شہر آباد تھا۔ ہر طرف چھوٹی بڑی عمارتیں گنجان آبادی کا اعلان کر رہی تھیں۔ لوگ مختلف بینر اٹھائے نعرہ بازی کر رہے تھے جن میں مرد، عورتیں، بچے، نوجوان لڑکے لڑکیاں، معصوم بچیاں اور بوڑھے تک شامل تھے۔ سڑک پر ٹینکوں، فوجی ٹرکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں اور مکینوں کو علاقہ چھوڑنے کی بار بار تنبیہہ کی جا رہی تھی مگر وہ کسی بھی اعلان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ جوں جوں اعلانات میں سختی آتی جا رہی تھی، پتھراؤ کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک اعلان فضا میں لہرایا اور اگلے ہی لمحے ٹرکوں سے سبز وردیوں میں ملبوس تازہ دم فورس اتری اور احتجاج کرتے ہجوم پر اندھا دھند لاٹھی چارج کر دیا۔

وہ سکرین پر نظریں جمائے یہ الم ناک مناظر دیکھنے میں پوری طرح منہمک تھا اور اس کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔

لاٹھی چارج کی زد میں آئے بچوں بوڑھوں جوانوں نے بھرپور مزاحمت شروع کر دی جنھیں گھونسوں لاتوں اور ڈنڈوں سے مارتے ہوئے گریبانوں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹا جانے لگا جن میں مرد عورت کی تمیز نہیں کی گئی اور ہر طرف گونجتی چیخ و پکار نے علاقے کو میدانِ جنگ میں بدل دیا۔ جب مزاحمت زور پکڑ گئی تو اچانک ان نہتے لوگوں پر فائر کھول دیا گیا اور پلک جھپکتے میں کئی وجود خون میں لت پت گرتے چلے گئے۔ اس کے بعد تڑتڑ کی آوازوں اور دلدوز انسانی چیخوں سے پورا علاقہ لرز گیا۔

وہ یہ سب دیکھ کر کانپ اٹھا۔ منظر ایک بار پھر بدل گیا اور اب پورا علاقہ کالے دھوئیں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اور اجڑی ہوئی عمارتوں میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ہر طرف عمارتیں ملبہ بن کر بکھری ہوئی تھیں۔ گلی کوچوں میں اڑتے گرد و غبار کے بادلوں میں معصوم بچوں مردوں اور عورتوں کی چیری پھاڑی ہوئی بے گور و کفن لاشیں پڑی تھیں۔ دیواروں میں چھید ہی چھید تھے۔ فضاؤں میں تیرتے جنگی جہاز چاروں طرف میزائل برساتے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ پورا علاقہ دھوئیں کی سیاہ چادر اوڑھ چکا تھا اور اس گاڑھے دھوئیں نے نہتے بے قصور لوگوں پر موت برسانے والوں کے اصل چہرے چھپا دیے تھے۔

سکرین نے ایک اور منظر اگلا۔ پورا علاقہ اجڑ چکا تھا۔ بچے کھچے رہائشی اپنی جانیں بچاتے ہوئے وہاں سے جا چکے تھے۔ ویران گلیاں ادھڑی ہوئی عمارتوں کے ملبے سے بھری پڑی تھیں اور بڑی بڑی کرینوں کی مدد سے ملبہ ہٹایا جا رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں جدید مشینیں آ کھڑی ہوئیں۔ بنیادیں کھودی جانے لگیں اور تعمیر و مرمت کا کام شروع ہو گیا۔ دن رات کی کوششوں سے دنیا نے دیکھا کہ ایک اجڑے ہوئے خطے پر فٹبال کی شکل والا دنیا کا جدید ترین فٹبال سٹیڈیم بن گیا جو اپنے اندر چمک دمک لیے نہ جانے کتنی لاشوں پر کھڑا لوگوں میں حیرتیں بانٹ رہا تھا۔

خونی رپورٹ کب کی ختم ہو چکی تھی اور وہ ٹی وی بند کر کے افسردگی میں لپٹا اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا مگر اس کے اندر ہر طرف کالے دھوئیں کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے۔

☆☆

سٹیڈیم میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سما چکا تھا۔ چاروں جانب خوش و خرم دمکتے ہوئے چہروں کی بہار تھی اور ایک شور شرابے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ منچلوں کے گروپ گالوں پر اپنے ملک کا جھنڈا بنوائے جوش و خروش میں پرندوں کی طرح سے چہک رہے تھے۔ کہیں بینڈ بجائے جا رہے تھے، کہیں سیٹیاں بج رہی تھیں اور کہیں موسیقی کے ساتھ گانے گونج رہے تھے۔ گول سٹیڈیم میں ہر طرف میزبان ملک کے جھنڈے ہی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جھلملاتی ہوئی بڑی بڑی سکرینوں پر گراؤنڈ کے مختلف حصوں کی فوٹیج دکھا کر پوری دنیا کو امن

محبت کا پیغام دیا جا رہا تھا۔

جوش سے لبالب بھرے لوگ میچ شروع ہونے کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ میزبان ٹیم پہنچی ہوئی تھی اور مہمان کھلاڑیوں کا استقبال کرنے کی تیاریاں تقریباً مکمل کی جا چکی تھیں۔ شائقین مہمان ٹیم کے گراؤنڈ میں داخل ہونے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ وقت گزر رہا تھا اور لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ میچ شروع ہونے کا مقررہ وقت بھی ہو گیا مگر مہمان کھلاڑی ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ میزبان ٹیم، اس کی انتظامیہ اور گراؤنڈ انتظامیہ کے چہروں سے پریشانی ٹپکنے لگی تھی، لوگوں کی بے چینی بھی اب آہستہ آہستہ پریشانی میں تبدیل ہو رہی تھی کہ جانے مہمان ٹیم کہاں رہ گئی؟ میچ شروع ہونے کا وقت گزر کر اُس سے آدھا گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا اور سب کی نظریں عین اس جگہ پر گڑی ہوئی تھیں جہاں سے کھلاڑیوں نے سٹیڈیم میں داخل ہونا تھا مگر ان کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ شائقین نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ میزبان ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے تعجب کا اظہار کر رہے تھے۔ انتظامیہ نے جب ہوٹل سے رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ ٹیم وہاں سے کب کی روانہ ہو چکی ہے مگر کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ابھی تک پہنچی کیوں نہیں؟

پورا گراؤنڈ تذبذب کی زد میں آیا ہوا تھا کہ اچانک تمام سکرینیں ایک ساتھ جھلکیں اور ہر طرف ایئر پورٹ کا ایک جیسا منظر بیدار ہو گیا۔ نشستوں پر بیٹھے لوگوں کی حیرت زدہ نظریں سکرینوں پر جم سی گئیں جہاں مہمان ٹیم کے کھلاڑی اپنے اپنے بیگ اٹھائے ایئر پورٹ پر کھڑے نظر آ رہے تھے اور میڈیا والوں نے انھیں گھیرا ہوا تھا۔ دفعتاً کپتان کا چہرہ بڑی بڑی سکرینوں پر ابھرا جو کسی نیوز چینل کے نمائندہ سے بات کر رہا تھا۔ اس کی آواز پورے سٹیڈیم میں گونج رہی تھی۔

میں جانتا ہوں کہ لوگ ہمارے فیصلے سے خوش نہیں ہوں گے اور انھیں مایوسی ہو گی مگر یہ تمام کھلاڑیوں اور ٹیم مینجمنٹ کا فیصلہ ہے کہ ہم ایسے گراؤنڈ پر ہرگز میچ نہیں کھیل سکتے جو معصوم بچوں بوڑھوں اور عورتوں کی لاشوں پر بنایا گیا ہو۔ ہم انھیں اپنے بوٹوں سے کچل کچل کر ان کی مزید بے حرمتی نہیں کر سکتے۔ ہم امن کے لیے کھیلنے آئے تھے مگر اب ہم امن کے لیے ہی احتجاج کرتے ہوئے یہ میچ چھوڑ کر واپس اپنے ملک جا رہے ہیں۔ اگر سپورٹس ہمیں انسانیت نہیں سکھا سکتی تو پھر اس کھیل کا کوئی فائدہ نہیں۔ امید ہے لوگ ہمیں معاف کر دیں گے۔

کپتان کی گونجتی آواز خاموش ہوئی تو سٹیڈیم میں موجود کئی چہرے ایک دم سے راکھ میں تبدیل ہو گئے اور ہر طرف یوں سناٹا چھا گیا جیسے وہ سٹیڈیم نہیں قبرستان ہو۔

ڈاکٹر احمد حسن رانجھا

خودکشی

اس نے چنبیلی کا گجرا بالوں میں درست کیا۔ چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ انگشت شہادت سے اپنا پراندہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں گھماتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دیوار پہ لگا بٹن دبایا تو جلیبی کی طرح بل کھایا ہوا انرجی سیور دیوار پہ روشن ہو گیا۔ اس کی دودھیا روشنی میں کمرہ جگمگ کر اٹھا۔ دروازے کی مخالف سمت دیوار سے پشت ٹکائے ایک سستی سی پرانی سنگھار میز پڑی تھی۔ سنگھار میز پر سستا قسم کا میک اپ کا سامان پڑا تھا۔ گلابو شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے شیشے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ اپنی آنکھیں، اپنے ہونٹ، اپنے گال اور اپنا خوبصورت چہرہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خود ہی اپنی تعریف کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ گلابو نے غازے کی تہہ جما کر اپنے گال گلابی کیے اور سرخی سے لب سرخ۔ ناخنوں پہ نیل پالش لگا کر شیشے میں منہ کے مختلف ڈیزائن بنا کر دیکھنے لگی۔ اپنی دیوار پر اس کی تصویر آویزاں تھی۔ سرخ پھولوں کے درمیان وہ گلاب کا پھول لگ رہی تھی۔ وہ تصویر دیکھنے میں محو ہو گئی۔ اچانک اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کسی نے پیچھے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے تھے۔ گھپ اندھیرا وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھی۔

”ہائے اللہ! اتنے زور سے تو نہ دباؤ... کیا اندھا کرنے کا ارادہ ہے؟“ اس کے منہ سے اچانک نکلا۔ جو کوئی بھی اس کے عقب میں تھا۔ اس نے بدستور آنکھیں بند کیے رکھیں۔

”اُف یہ اندھیرا تو قبر کا اندھیرا لگ رہا ہے اور ہاتھ ملک الموت کے ہاتھ لگ رہے ہیں۔“ گلابو نے کلائیوں سے پکڑ کر ہاتھ پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔

”صفو! یہ بدمعاشی ختم بھی کر دے۔“ جوں ہی پتلی نرم کلائیاں اس کے ہاتھ میں آئیں، اُسے بوجھنے میں بس ایک لمحہ لگا کہ کس نے اس کی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

”نہ پہلے وعدہ کرو میرا سو روپے کا لوڈ واپس میرے موبائل پہ کرواؤ گی، تب آنکھیں کھولنے دوں گی۔“ صفو نے اس کی آنکھوں پہ ہتھیلیوں کا بوجھ بڑھا دیا۔

”اُف اللہ تم سا یہودی دوست کسی کا نہ ہو، سو روپے کے ادھار پہ کیا اب میری جان لے کر رہو گی۔“ گلابو کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"ہائے نی گلابو! تُو تو میری بچپن کی سہیلی ہے۔ تجھ میں تو میری جان ہے۔ اب میں اپنے ہاتھوں سے تو اپنا قتل نہیں کروں گی۔ میرے بس میں ہو تو تجھ پہ لاکھوں کروڑوں واروں، بس فی الحال مجھے یہ سو روپیہ واپس کر دے۔ ابھی مجھے اس کی اشد ضرورت ہے۔" صفو کے لہجے میں شرارت تھی۔ اس نے گلابو کی آنکھوں سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ کچھ لمحے تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا لہراتا رہا، پھر اسے صفو کا چہرہ نظر آنے لگا۔ اس کے لبوں پہ شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ گلابو نے پرس میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے ادھار واپس کر دیا۔ وہ دونوں محلے دار تھیں۔ بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ سکول میں اکٹھے پڑھتی رہی تھیں۔ گلابو بیوہ ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ باپ کا سایہ اس وقت سر سے اٹھ گیا جب وہ ابھی ماں کی گود میں تھی۔ غریب گھرانہ تھا۔ وسائل کچھ تھے نہیں۔ اس کی ماں، بختے نے شہر میں تین چار کوٹھیوں کا کام پکڑ لیا۔ وہ ان کوٹھیوں میں برتن مانجھتی، صفائی کرتی، کپڑے دھوتی اور اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالتی۔ میٹرک تک پڑھ کر گلابو گھر بیٹھ گئی آگے پڑھنے کے وسائل نہیں تھے۔ کالج کی فیسوں کے خرچے اس کی پہنچ سے دور تھے۔ اب وہ دن رات عورتوں کے رومانوی رسالے پڑھتی یا فون پر سہیلیوں کو میسج یا باتیں کرتی رہتی۔ بختے کو جوان بیٹی اب بوجھ محسوس ہونے لگی تھی وہ جلد از جلد اس کے ہاتھ پیلے کرنا چاہتی تھی۔ اس نے برابر کے دو چار خاندانوں میں بات چلائی پر گلابو کو تو کسی راج کمار کا انتظار تھا۔ وہ تو کوٹھیوں اور کاروں کے خواب دیکھتی تھی۔ چاند سا چہرہ، جھیل سی آنکھیں اس کی ڈولی جس آنگن میں بھی اترتی اس گھر کو چار چاند لگ جاتے۔ تمام تر خوابوں اور خواہشوں کے باوجود وہ ایک شرمیلی مشرقی لڑکی تھی۔ محلے کے کئی لڑکوں نے اس پہ ڈورے ڈالنے کی کوشش کی مگر اس نے آج تک کسی لڑکے سے راہ و رسم نہیں بڑھائی تھی۔ گلابو نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اگر بے تکلف ہوگی اور بات چیت کرے گی تو صرف اس لڑکے سے جو اس کے سپنوں کا راج کمار ہوگا۔ وہ دونوں پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

صفو نے پرس میں سے اپنا نیا آئی فون نکالا اور اس پہ فیس بک کھول کر اپنی تصویریں دکھانے لگی۔ گلابو بڑی حسرت سے اُس کی تصویروں کو دیکھنے لگی۔ یہ صفو کی خالہ زاد کی شادی کی تصویریں تھیں، رنگ برنگی تصویریں، ویڈیوز، ایک پوری دنیا تھی جو اس فون کے اندر آباد تھی۔ قوس قزح کے رنگ تھے جو رنگین وال پیپر پہ ناچ رہے تھے۔ گلابو نے حسرت بھری نگاہوں سے آئی فون کو دیکھا، جیسے ہی اس کی نظر سنگھار میز پہ پڑے اپنے دس سال پرانے ماڈل کے فون پر پڑی، اس کی آنکھوں میں افسردگی سی تیرنے لگی۔

صفو نے فیس بک پہ اپنی ایک بڑی خوبصورت تصویر ڈی پی کے طور پر لگا رکھی تھی۔ گلاب کا سرخ رنگ کا پھول اس نے اپنی ناک سے لگا رکھا تھا۔ عجیب سرمستی کے عالم میں گلاب کی خوشبو سونگھ رہی تھی۔ بیک گراؤنڈ میں کالج کا باغیچہ تھا جس میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ صفو دن رات فیس بک میں مگن

رہتی۔ ایک لڑکے سے اس کی فیس بک پہ علیک سلیک ہوئی، بات دوستی تک جا پہنچی۔ دوستی پیار میں بدل گئی۔ صفو کے ابا معمولی سکول ٹیچر تھے۔ محدود تنخواہ، لامحدود خرچے، وسائل کم، کنبہ بڑا، سات بہن بھائیوں میں صفو سب سے بڑی تھی۔ لڑکا امیر گھرانے کا تھا، پر وہ اس کے پیار میں ایسا گم ہوا کہ امیری غریبی کے فرق کو لات مار کر اپنے امیر ماں باپ کو صفو کے غریب خانے پہ رشتے کا سوالی بنا کر بھیج دیا۔ اتنے بڑے گھر کا رشتہ!!! اماں ابا نے سوچ بچار میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ہاں کر دی۔ منگنی ہوئی دو ماہ بعد رخصتی کی تاریخ طے ہوئی۔ خوشیوں کے پھول اس پر یوں اچانک نچھاور ہوئے تھے کہ صفو پھولی نہ سما رہی تھی، ہواؤں میں اڑتی پھرتی تھی۔ گلابو رشک بھری نظروں سے اُسے دیکھتی۔

"صفو! مجھے بھی یہ آئی فون لے دوے" گلابو نے اس کی ڈی پی کو رشک آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"پورے پچیس ہزار کا ہے، ہیں تیرے پاس اتنے پیسے؟"

"ابھی تو نہیں۔۔۔ پر ہو جائیں گے۔" گلابو نے اپنے پرانے فون کو بجھی بجھی نظروں سے دیکھا۔

"کہاں سے ہو جائیں گے؟" صفو کی آنکھوں میں غیر یقینی کیفیت تھی۔

"میں نے محلے میں کمیٹی ڈال رکھی ہے تیس ہزار کی۔ دو ہفتے تک میری کمیٹی نکل آئے گی، پھر مجھے لے دینا تم آئی فون اور مجھے تم نے یہ فیس بک پر پیج بھی بنا کر دینا ہے اور اسے چلاتے کیسے ہیں، یہ بھی سکھانا ہے!!"

گلابو کی آنکھوں میں کہیں سے ایک انوکھی قسم کی چمک آ گئی تھی۔

"سب سکھا دوں گی اپنی جان کو۔" صفو نے لاڈ سے اس کا کان کھینچا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

گلابو بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوابوں کا ایک نگر اس کی بند پلکوں کے کواڑوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں آباد ہو گیا۔

دو ہفتے کے بعد سیکنڈ ہینڈ آئی فون کی رنگین سکرین اس کی انگلیوں کی پوروں کے نیچے تھی۔ سوشل میڈیا کی وسیع دنیا اس کی انگشت شہادت کی زد پہ تھی۔ صفو نے اسے فیس بک پیج بنا کر دیا اور اسے آپریٹ کرنا سکھایا۔ گلابو اپنی تصویر عام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ڈی پی کے طور پہ ایک مخملی سفید بالوں والی بلی کی تصویر لگائی جس کی چمکدار سیاہ آنکھیں تھیں اور اس کے داہنے پنجے کے نیچے ایک رنگین فٹ بال تھا۔ وہ دو تین دفعہ اماں کے ساتھ ان کوٹھیوں میں گئی جہاں پہ اس کی اماں کام کرتی تھی۔ اس نے اپنے آئی فون کے ساتھ اُن کوٹھیوں میں اپنی سیلفیاں بنائیں۔ بڑے بڑے عالی شان روم میں، چمکتی دمکتی قیمتی کار کے ساتھ۔ آرام کرسی پہ بیٹھ کر ایک بہت بڑی کوٹھی کے وسیع وعریض لان میں۔

فیس بک پہ اب اسے اپنے سپنوں کے راج کمار کی تلاش تھی۔ وہ دن رات لڑکوں کی ڈی پیاں

کھنگالتی، اس نے صرف اور صرف ایک لڑکے کو فرینڈ ریکویسٹ بھیجی تھی جو اس کے خوابوں کا شہزادہ ہوتا۔ کافی دنوں کی تلاش کے بعد اسے عرفان پسند آ گیا۔ وہ خوبرو تھا۔ شکل سے پڑھا لکھا اور ذہین لگتا تھا اور اس کی تصویریں دیکھ کے محسوس ہوتا تھا کہ کافی امیر کبیر گھرانے کا ہے۔ بہت ہچکچاہٹ کے بعد گلابو نے خود کو آمادہ کر لیا کہ وہ عرفان کو فرینڈ ریکوئیسٹ بھیج دے۔ بالآخر اس نے عرفان کو فرینڈ ریکوئیسٹ بھیج ہی دی۔ اب وہ روزانہ ہر گھنٹے کے بعد اپنا موبائل چیک کرتی کہ عرفان نے اس کی دوستی کی درخواست قبول کی ہے یا نہیں۔ روزانہ وہ اس کی ٹائم لائن دیکھتی اور اپنی فرینڈ ریکوئیسٹ پینڈنگ دیکھ کر مایوس ہو جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کی مایوسی بڑھنے لگی۔ بڑھتی ہوئی مایوسی نے جھنجھلاہٹ کی صورت اختیار کر لی۔ ایک دن اس نے اپنی کچھ تصویریں عرفان کو ان باکس کیں۔ اگلے دن وہ دونوں فیس بک پر دوست بن چکے تھے۔ ان دونوں کی آپس میں بات چیت شروع ہو گئی۔ گلابو نے خود کو بڑی امیر زادی ظاہر کیا۔ کوٹھیوں، کاروں کی مالکن قرار دیا۔

عرفان نے اسے بتایا کہ وہ متوسط گھرانے سے ہے۔ اُس نے جو تصویریں لگائی ہوئی تھیں وہ اس کے دوستوں کی کاروں اور گھروں میں کھینچی ہوئی تھیں۔

وہ درمیانے طبقے سے تعلق رکھتا تھا، پر اس کے دل میں آگے ہی آگے بڑھنے کا عزم تھا۔ وہ اپنی محنت اور زورِ بازو سے اس دنیا میں اپنا ایک مقام بنانا چاہتا تھا۔ گلابو کی دولت سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔

گلابو دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ اس نے عرفان سے جھوٹ کیوں بولا؟ اسے شروع میں ہی اپنی اصلیت بتا دینی چاہیے تھی، پھر اس نے سوچا کہ امید ہے کہ وہ اس بات کا برا نہیں منائے گا کیوں کہ اسے تو گلابو سے پیار تھا اس کی دولت سے نہیں۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملیں گے پھر اپنے والدین کو شادی کے لیے راضی کر لیں گے۔

وہ رات کو سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ فیس بک پر عرفان کا میسج آیا۔ ''ڈارلنگ کیا کر رہی ہو؟''

''سونے کی تیاری۔''

''کل مجھ سے ملو۔'' موبائل کی سکرین پر میسج چمکا، ساتھ ہی گلابو کی آنکھوں میں بھی چمک تیرنے لگی۔

''کہاں پر ملوں؟'' گلابو کی انگلیوں کی حرکت سے موبائل سکرین پر لفظ بولے۔

''یہ میں کل بتاؤں گا۔'' عرفان کا جواب آیا۔

''عرفان ڈارلنگ تمھیں ایک بات بتاؤں برا تو نہیں مناؤ گے؟'' ناراض تو نہیں ہو جاؤ گے؟''

''جس دن میں تم سے ناراض ہوا وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔'' عرفان نے فلمی ڈائیلاگ نما جوابی میسج کیا۔

"عرفان تم نے اگر مجھ سے دھوکہ کیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ "

"پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔ " عرفان بولا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میں امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہم جب ملیں تو ایک دھوکے کا پردہ ہمارے بیچ حائل ہو۔ میں ایک بیوہ ماں کی بیٹی ہوں اور ہم لوگ انتہائی غریب ہیں۔ گلابو نے بڑی ہچکچاہٹ کے بعد یہ میسج بھیجا اور اُسے لگا جیسے اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم امیر ہو یا غریب۔ میری چاہت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ صبح میں تمھیں ان باکس کرکے بتا دوں گا کہ ہم کس جگہ پر ملیں گے۔ شاباش اب تم سو جاؤ تا کہ ہم صبح مل سکیں۔ " عرفان نے آخری میسج کیا۔

گلابو کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے۔ وہ بار بار عرفان کے میسج پڑھتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ زیادہ خوشی یا زیادہ غم دونوں کیفیات نیند چھین لیتی ہیں۔ یہ بے پناہ مسرت تھی کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جانے رات کا کونسا پہر تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح بہت دیر سے اس کی آنکھ کھلی۔ اگلی صبح اٹھتے ہی گلابو نے موبائل فون سرہانے کے نیچے سے نکالا تا کہ ان باکس میں عرفان کا میسج پڑھ سکے کہ وہ کہاں پر ملیں گے۔

فیس بک سے عرفان کا پیج غائب تھا۔ اس نے گلابو کو بلاک کر دیا تھا۔ گلابو نے اس کے فون پر بار بار کال کی پر اس کا نمبر بھی بند تھا۔ سارا دن وہ اس کے فون نمبر پہ کالیں کرتی رہی یوں لگتا تھا جیسے عرفان نے نمبر بھی تبدیل کر لیا ہے۔

"عرفان اگر تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ " گلابو کے اپنے الفاظ بار بار اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

گلابو نے کچن میں جا کر تیل کی بوتل اٹھائی، پورے جسم پر مٹی کا تیل چھڑکا، ماچس اٹھا کر دیا سلائی نکالی۔ دیا سلائی جلا کر وہ اس کے شعلے کو گھورتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ اس نے پھونک مار کر شعلہ بجھا دیا ماچس اور دیا سلائی جو بجھ چکی تھی، نیچے پھینک دی۔

جیب سے آئی فون نکالا، اُسے گھورتی رہی، اس نے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ غازے کی تہہ جما کر گال گلابی کیے اور سرخی سے ہونٹ لال کر کے سیلفی لی۔ ڈی پی اب بلی کی بجائے اس کی اپنی تصویر تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بے شمار لڑکوں کو فرینڈ ریکوئیسٹ بھیج دی۔ اس کے اندر کہیں ایک معصوم لڑکی کا وجود شعلوں کی زد پہ تھا۔ اسے لگا جیسے اس نے واقعی خودکشی کر لی ہے۔

☆☆☆☆

عطاء الرحمٰن خاکی

سنہرا پرندہ

وہ اگر چاہتا تو بہت آسان موت مر سکتا تھا۔۔۔ ہاتھ کی رگ کاٹ کر دھیرے دھیرے موت کو محسوس کر سکتا تھا یا پھر پسٹل کی ایک گولی یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام دیتی۔۔۔ لیکن خودکشی کے یہ طریقے اسے بالکل پسند نہیں آئے، نشہ آور ادویات میں امکانات کم تھے، عین ممکن تھا کہ جب وہ کمرے میں موت کی پوری تیاری سے بیٹھا ہو، ایک عدد نوٹ بھی تحریر کر چکا ہو جو اس کی جان سوزی کے حوالے سے ہو اور کچھ اس طرح سے ہو کہ میں اس لیے خودکشی کر رہا ہوں کیوں کہ اس بھیڑ بھاڑ والی دنیا میں بھی تنہائی محسوس کرتا ہوں اور اس تنہائی بھری اداسی میں مجھے اپنا پالتو کتا شیری یاد آتا ہے جو پچھلے ہفتے پڑنے والی سخت سردی سے بیمار ہو کر مر گیا اور یہ نوٹ لکھتے وقت وہ ہنسی سے دوہرا ہو جائے کہ اس جیسا انسان جو تدفین میں محض اس لیے نہیں جاتا کہ اس سے مسکین سا منہ نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی آنکھ میں آنسو آتے ہیں، ایک عام سے بات ہوتی تھی اس کے لیے کہ فلاں راہی عدم گیا، جیسے روز صبح کی واک کرنے یا شیو کرنے، ناشتے کے بعد دن کی پہلی سگریٹ جلاتے ہوئے اخبار کی شہ سرخیوں پر تبصرہ کرنے جتنی عام سی بات۔۔۔ بھلا ایسے انسان کو ایک کتے کی موت سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ اسٹریو پر جگجیت سنگھ کی پرسوز اور ٹھہری ہوئی آواز میں غالب کی کوئی غزل ہوتی جو مرنا آسان کر دیتی۔ بیڈ کے سرہانے پڑی میز پر مختلف خواب آور گولیاں سجانے کے بعد ایک کے بعد ایک نگل کر اب موت کے انتظار میں ہوتا۔ دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوتی اور موت بس آنا ہی چاہتی ہوتی اور ٹھیک اسی وقت آ کر کوئی اسے بچا لیتا تو اس کو یہ طریقہ کار بھی پسند نہیں آیا تھا۔

ہاتھ کی رگ کاٹ کر یا خود کو شوٹ کرنے میں بھی ایک مسئلہ تھا، وہ بہت نفاست پسند انسان تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ جب کوئی پولیس کو اطلاع دے کہ پوش علاقے میں بنے ایک فلیٹ سے شدید ناگوار بو اٹھ رہی ہے۔۔۔ جو بے شک ایک ٹھنڈے اور سڑتے ہوئے جسم سے ہی اٹھ سکتی ہے، جو کبھی حیات تھا اور سانس لیتا اور دنیا کی رنگینیاں دیکھتا تھا لیکن اب اس کا جوان اور سرخ خون جو کئی دن گزر جانے کے بعد سیاہ مائل ہو کر جم چکا ہو، جس پر مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔۔۔۔ اور وہ مرنے کے بعد بھی مکھیوں کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ اور پولیس والے کمرے کا دروازہ توڑ کر جب فلیٹ میں داخل ہوتے، وہ منہ پر رومال رکھ لیتے کہ

وہاں جو بو ہوتی تھی وہ نا قابلِ برداشت ہوتی تھی تو یہ سب طریقے اس کی نفیس طبیعت پر گراں گزرتے تھے۔

اُس کا نام ارمان تھا، اسے اونچائی سے ڈر نہیں لگتا تھا اور شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب وہ کسی اونچے درخت، کھمبے یا دیوار سے چھلانگ نہ لگا سکا ہو۔ وہ ہمیشہ بس چھلانگتا رہتا۔۔۔۔ وہ قوانینِ فطرت سے واقف تھا۔۔۔۔ اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کس اونچائی سے چھلانگ لگائے لیکن کشش ثقل اسے زمین پر پٹخ ہی دے گی۔۔۔۔ کشش ثقل ہمیشہ اسے پرندے کی طرح اڑنے سے روک کر زمین کی جانب کھینچ لیتی تھی۔

اُسے ہر کوئی سنہرا پرندہ کہتا تھا۔ ایک ایسا پرندہ نما انسان جو بس اڑنے کی خواہش رکھتا ہے۔۔۔۔ شاید وہ اڑنا نہیں چاہتا بلکہ وہ بس کسی اونچے درخت یا دیوار سے چھلانگ لگا کر اپنی حد جاننا چاہتا ہے۔۔۔۔ وہ ایک اونچے درخت پر چڑھ کر ایک پرندے کی طرح زمین کی جانب دیکھتا ہے۔ اور اونچائی سے دنیا زیادہ بہتر اور وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جسم میں کچھ تو ہڈیاں، پٹھے، خون اور رگیں تھیں اور اس کے ساتھ کچھ تھا تو دھاتوں کے ٹکڑے تھے جو ہر چھلانگ کے بعد اس کے جسم کا حصہ بن جاتے تھے۔۔۔۔۔ اگر اس کا ایکسرے لیا جاتا تو اس کا پنجر ایک ایسا خالی پنجرہ محسوس ہوتا جس میں کوئی قید ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ "یہ ایک بے چارہ سنہرا پرندہ ہے"۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اسے حادثات اور چوٹ کے نشانات پسند ہیں۔۔۔۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک کر رہا تھا اور نیوٹن بھی صحیح تھا اور وہ ننھا بچہ کسی شاخ سے ٹوٹے سیب کی طرح ہمیشہ گرتا رہے گا۔

بائبل میں فرشتوں کی کہانیاں اُسے بچپن سے مسحور کرتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ خود بھی کوئی دھتکارا ہوا فرشتہ ہے جسے کسی جرم کی پاداش میں آسمان سے زمین کی جانب پھینک دیا گیا ہے۔۔۔ یہ سوچ کر اُسے اردگرد کی چیزیں ہلکی اور سطحی محسوس ہونے لگتیں۔۔۔ پھر ایک وقت آیا کہ اُسے انسانوں سے زیادہ پرندے دلچسپ اور حیرت انگیز معلوم ہونے لگے۔ وہ انھیں گھنٹوں فضا میں پرواز کرتے۔۔۔ گاتے۔۔۔ دانا چگتے۔۔۔ بیٹ کرتے اور ملن کرتے دیکھتا رہتا۔

یہ انھی دنوں کی بات ہے جب وہ سمجھتا تھا کہ اپنی نوعیت کا واحد انسان ہے۔ پھر اس نے غور سے آس پاس رہنے والے لوگوں کا مشاہدہ کیا اور یہ جانا کہ ان کے بھی نادیدہ پنکھ ہیں۔۔۔ لیکن وہ اس حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔۔۔ شاید ان کے اندر اڑنے کی خواہش جنم نہیں لیتی اور وہ اسی بدقسمتی کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔۔۔ وہ اکثر بڑبڑاتا "پروں کے ہوتے ہوئے اڑنے کی خواہش نہ ہونے سے بڑی بدنصیبی کوئی اور نہیں ہے۔"

ہر چیز جس کو اوپر کی جانب اچھالا جائے، وہ واپس پلٹتی ہے، جیسے ایک سکہ، غبارہ، انسان، جانور یا

پرندہ ۔۔۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس حجم، ماہیت یا وزن کی شے ہے ۔ لیکن وہ واپس دھرتی کی جانب لوٹ آتی ہے ۔۔۔ کششِ ثقل اسے مجبور کر دیتی ہے ۔ وہ اکارس ہو، انسان ہو یا شیطان، اپنے اصل کی جانب لوٹتے ہیں ۔۔۔ آسمان سے دھرتی پر اور پھر دھرتی سے اور نیچے اور وہ یہ بات بخوبی سمجھ گیا تھا کہ عظیم واقعات چھوٹی اور معمولی چیزوں سے جنم لیتے ہیں ۔ اس ادراک کے بعد چھلانگ لگانے اور اڑنے کے جنون میں مزید پختگی اور عزم پیدا ہو گیا ۔ وہ چھلانگ لگاتا رہا ۔ یہ دیکھے بغیر کہ روشندانوں، ٹہنیوں اور تاروں پر بیٹھے پرندے اسے تعجب سے دیکھتے ہیں ۔ اس عجیب عادت سے مجبور ہو کر ایک دن اس کے والدین نے اسے کمرے میں بند کر دیا ۔ جہاں سے وہ نکل نہیں سکتا تھا ۔ اس نے کمپیوٹر ٹیبل کو کتابوں کی الماری کے ساتھ جوڑ کر چھلانگ لگانے کی جگہ پیدا کر لی اور تب اس نے چھلانگ لگائی اور اپنا سر فرش سے ٹکرا کر زخمی کر لیا ۔ پورے کمرے میں پاگلوں کی طرح دوڑتا رہا ۔ جب آزادی کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو غصے میں آ کر لکڑی کے فریموں سے سر کو ٹکرا کو زخمی کر لیا ۔ اصل میں وہ آزادی چاہتا تھا ۔ ماں باپ کو مجبوراً اس جبری قید سے آزاد کرنا پڑا ۔۔۔ شاید وہ بھی یہ جان گئے تھے کہ وہ ایک ایسا آزاد پرندہ ہے جس کو قید نہیں کیا جا سکتا اور جو یہ کر رہا ہے اسے کرنے دیا جائے ۔

جب وہ تیرہ برس کا ہو چکا تو اس نے بہت اونچے درخت سے چھلانگ لگائی جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کافی نقصان پہنچا ۔ اب وہ ایک ٹوٹا ہوا سنہرا پرندہ تھا ۔ ایک ایسا پرندہ جس نے اپنی محدود پرواز اور حوصلے سے زیادہ اڑان بھری اور زخمی ہو گیا ۔ انھوں نے اسے اٹھایا اور اس کے اکھڑے ہوئے پروں کو ٹھیک کرنے کی پوری کوشش کی ۔۔۔ نازک پرندوں کی مانند ہڈیوں کو جوڑنے کے بڑے جتن کیے اور پھر تھک ہار کر اسے ایک وہیل چیئر دے دی ۔ اب وہ دھات اور پہیوں کا مجموعہ بن چکا تھا، کبھی نہ اڑنے کے قابل لیکن لامحدود ۔

انھوں نے اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور آرزوؤں کو ایسے ہی بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا ۔۔۔ اب وہ کمرے کی کھڑکی سے اڑتے ہوئے آزاد پرندوں کو حسرت سے دیکھتا رہتا ۔ اسے لگتا کہ درخت پر بیٹھے پرندے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ہنس رہے ہیں اور ایسے میں وہ اپنا چہرہ نیچے کر لیتا ۔۔۔ ان کو اپنے اوپر ہنسنے دیتا ۔۔۔ شاید اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ کبھی بھی اڑ نہیں سکے گا ۔

اب وہ ۴۲ فیصد دھات ۔۔۔ ۴۷ فیصد ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا مجموعہ اور ۷ فیصد ہیرا لانز تھا ۔۔۔ وہ ۱۰۰ فیصد عزم اور ایک نا بھولنے والا خواب بن چکا تھا ۔۔۔ درحقیقت وہ کبھی بھی دوڑنا یا اڑنا نہیں چاہتا تھا اس نے یہ کبھی چاہا ہی نہیں تھا ۔۔۔ حقیقت میں ۔۔۔ حقیقت میں وہ ہوائی موت سے ڈرتا تھا ۔۔۔ اونچا نیلا آسمان اور کوئی بھی چیز اس کو مار نہیں سکتی تھی ۔۔۔ اگر وہ دور آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گیا تو وہ نیچے کیسے اترے

گا۔ یہی ڈر تھا جو اسے اندر ہی اندر مارے ڈال رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسانوں کو پرندوں کی طرح پرواز کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔۔۔ مگر شاید وہ قانونِ فطرت کو للکارنے اور اونچائی سے نیچے گرتے رہنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔

وہ اپنے ستائیسویں جنم دن پر شہر کی سب سے بلند عمارت کی چھت تک پہنچا۔۔۔۔ ہزاروں عمارتوں میں سے ایک شہر کی بلندترین عمارت اور وہ وہاں محض ایک منظر دیکھنے کے لیے پہنچا تھا، دنیا پر زیادہ اونچائی سے اور بہتر طریقے سے نظر ڈالنے کے لیے۔۔۔۔ وہ کہتے تھے "یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔۔۔ کبھی چل نہیں سکے گا"۔ اسے صرف ایک قدم اٹھانا تھا ان کی بات کو غلط ثابت کرنے کے لیے اور تب اس نے قدم بڑھایا اور اپنے نادیدہ پروں کو تولتے ہوئے چھلانگ لگا دی اور نیچے گرتے وقت اس نے اپنی آنکھیں بند نہیں کیں اور اپنے ہاتھوں کو ایک آزاد پرندے کی طرح پھیلا کر خود کو ہواؤں کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆☆

محمد حنیف بیگ

لکیر

''ہم پاکستان نہیں جائیں گے''۔ منور خان نے دوٹوک اعلان کیا۔ ''لیکن کیوں، ابا میاں''۔ فرزانہ نے دھیرے سے احتجاج کیا۔ ''ابھی تک تو آپ پاکستان کی حمایت میں بول رہے تھے''۔ ''ہاں'' ابا میاں نے کہا۔ ''لیکن اب میں نے اپنی سوچ بدل لی ہے۔ پاکستان میں قتل وخون ہو رہا ہے''۔ ''تو یہاں کون سی خون کی ہولی نہیں کھیلی جا رہی ہے''۔ ان کی بیوی زبیدہ نے پان کو چونا لگاتے ہوئے کہا۔ یہاں بھی ہر طرف کشت وخون جاری ہے۔ عرفان بھائی نے کہا۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اور ہمارا خاندان کہیں نہیں جائیں گے۔ فرزانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی خالہ زاد ہارون سے منگنی ہو چکی تھی اور سب نے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی شادی کر دیں گے۔ لیکن ہارون کا خاندان تو کراچی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ ہارون رک گیا تھا کہ وہ خالہ کے خاندان کے ساتھ ہی جائے گا۔ لیکن اب اگر منور خان نہیں جاتے تو کیا ہوگا۔ کیوں نہیں جاتے۔ زبیدہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بات کچھ ایسی ہے کہ ہم یہاں کے رہنے والے ہیں۔ خدا جانے وہ جگہ کیسی ہوگی۔ ہم بے سروسامان ہونگے۔ کوئی جان نہ پہچان۔ یہاں کے ہندو ہوں یا سکھ ہمیں جانتے تو ہیں نا۔ صدیاں بیت گئیں یہیں رہتے رہتے، اب ہم کسی جگہ جائیں گے تو ہمارے ساتھ کیا بیتے گی۔

ابا میاں، فرزانہ نے صبر سے کام لیتے ہوئے کہا، یہاں ہم صدیوں سے رہ رہے ہیں، اب یہی ہمارا گھر ہمیں کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ یہی ہندو اور سکھ جو کبھی ہمارے ساتھی ہوا کرتے تھے اب ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ روزانہ ہی کہیں نہ کہیں سے خبر ملتی ہے کہ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ منور خان اپنی ضد کے پکے تھے، ہار ماننے کو تیار نہ تھے۔ کچھ بھی ہو جائے، یہیں مر گئے تو اسلاف کی سرزمین میں دفن تو ہونگے۔ آپ کو کون سمجھائے، زبیدہ نے سروتے سے چھالیہ کاٹتے ہوئے کہا۔ تم سمجھ نہیں رہی ہو زبیدہ، منور خان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا، یہ گلیاں، یہ محلّہ، یہ شہر ہمارا ہی تو ہے۔ ہم نے اسی شہر کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ہمارا گھر اتنا بڑا ہے، ہماری جائیداد ہے، ہمارا رہن سہن ہے، ہماری طرز معاشرت ہے، میں یہ سب کچھ کیسے چھوڑ دوں؟ میں نے اس بات پر بہت غور وخوض کیا ہے اور اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمیں نہیں جانا چاہیے۔

انھوں نے بیوقوفی کی ہے، منور خان بولے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ انور بھائی سے کوئی رابطہ ہو جائے لیکن فسادات کا زمانہ ہے۔ امرتسر اور دہلی بلوائیوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ جہاں کہیں مسلمانوں کو بیوی بچوں سمیت دیکھتے ہیں، حملہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ دیکھو، منور خان پھر بولے، یہ جگہ بلوائیوں کی دسترس سے بہت دور ہے۔ منور خان کو ماننا تھا، نہ مانے اور زبیدہ، عرفان اور فرزانہ نے خاموشی اختیار کر لی۔

ہارون، ابا میاں تو جانے کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہیں۔ فرزانہ نے بے چارگی سے کہا۔ لیکن فرزانہ تم جانتی ہو کہ میرے گھر والے جا چکے ہیں اور مجھے بھی بہر حال پاکستان ہی جانا ہوگا۔ خالو، پتہ نہیں اس بات کا ادراک کیوں نہیں کر رہے کہ یہی جگہ جہاں ہم صدیوں سے رہ رہے ہیں، اب ہماری نہیں ہے۔ پاکستان ہمارا وطن ہوگا۔ وہاں ہم آزادی سے سانس لیں گے۔ ہمارا جینا مرنا ہمارے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہوگا۔ یہاں کی زمین ہمارے لیے تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ ہر جگہ فسادات ہو رہے ہیں۔ میں نے تو اپنی سی کوشش کر لی۔ فرزانہ بولی لیکن ابا میاں کسی طرح بھی راضی نہیں ہو رہے۔ اگر ہم نہ گئے تو میری زندگی تمھارے بغیر کیسے گزرے گی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں کہ تمھارے بغیر زندگی گزاروں گی۔ جب سے ہماری منگنی ہوئی ہے، مجھے تم سے پردہ کرنا چاہیے تھا لیکن میں اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ کاش ابا میاں ان باتوں کو سمجھ سکتے۔

اسی شام فرزانہ نے اپنی امی سے پھر کہا کہ وہ ابا میاں کو سمجھانے کی کوشش کریں کہ بچوں کا مستقبل پاکستان سے ہوگا لیکن زبیدہ کا کہنا تھا کہ جس بات پر منور خان ڈٹ چکے ہیں، وہ اس سے قطعی طور پر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ فرزانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ منور خان بھی اس بات کو سمجھتے تھے لیکن ان کے نزدیک ان کی جاگیریں زیادہ اہمیت کی حامل تھیں بہ نسبت پاکستان کے۔ ہارون کا خیال تھا کہ وہ خالو سے بات کر کے انھیں اپنے نقطۂ نظر پر لانے کی کوشش کرے گا۔ خالو جان، لوگ پاکستان کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمیں بھی چلنا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ بات صرف جگہ کی تبدیلی کی نہیں ہے، بلکہ اس سے دو خاندانوں کا مستقبل بھی وابستہ ہے۔ میں تمھاری بات کو سمجھ رہا ہوں۔ منور خان بولے، لیکن دیکھو، یہ محض ایک لکیر ہے۔ یہ لکیر کچھ ہی دنوں میں مٹ جائے گی۔ پھر ہم سب ایک دوسرے سے آن ملیں گے۔ جہاں تک تمھاری بات کا تعلق ہے تو مجھے پتہ ہے کہ تمھاری اور فرزانہ کی منگنی ہو چکی ہے۔ ذرا یہ فسادات کی گرد بیٹھ جائے تو تم لوگ یہاں چلے آنا اور اپنی منگیتر کو دلہن بنا کر لے جانا۔ تقسیم کی یہ لکیر ہمارے دلوں کو تقسیم نہیں کر سکتی۔ جب آزادی کا جن تمھارے سروں سے اتر جائے گا تو پھر تم ہم سے ملو گے۔ میں تو جانے کا نہیں ہوں۔ فرزانہ تمھاری امانت ہے۔ جب بھی

تمھارا خاندان چاہے گا ہم اپنی بیٹی کو بیاہ دیں گے۔

مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔ فسادات پھیلتے جا رہے تھے۔ کبھی امرتسر میں تو کبھی جالندھر میں۔ مشرقی پنجاب کی حالت بہت بری تھی۔ ادھر دلی بھی بلوائیوں کے قبضے میں تھا۔ بجنور، رامپور، سہارن پور، لکھنؤ، شاہجہاں پور، بھوپال میں بھی فسادات ہو رہے تھے۔ لوگ سراسیمگی کے عالم میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ وہی گھر جہاں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں، اب ان کے لیے اجنبی ہو چلا تھا۔

اسی شام کو جب منور خان نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے تو محلے کے رام چند نے کہا، خان صاحب مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر آپ جانا چاہیں تو میں بحفاظت آپ کو تقسیم کی لکیر تک چھوڑ آؤں گا۔ بھائی رام چند، منور خان بولے، اگر مجھے جانا ہوتا تو میں انور بھائی کے ساتھ ہی چلا گیا ہوتا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ دھرتی میری دھرتی ہے، میرا جینا مرنا اسی کے سنگ ہے۔ بات تو آپ کی ٹھیک ہے، رام چند نے کہا، لیکن میں نے تو آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔ رام چند، میں اکیلا نہیں ہوں۔ اسی ہندوستان میں اور بھی بہت سارے مسلمان ہیں جو جانے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ کی مرضی، رام چند نے خاموشی اختیار کر لی۔

اگلے دن ہارون نے رختِ سفر باندھا اور شہر اور ملک چھوڑ کر ایک اجنبی جگہ پر اپنی قسمت کی لکیر تلاش کرنے چلا گیا۔ فرزانہ اکیلی روتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی لیکن منور خان کے دل پر ان آنسوؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے جو سوچ رکھا تھا، اسی پر کاربند رہے۔ ہارون نے چلنے سے پہلے اپنی خالہ سے کہا، میں اپنی امانت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جیسے ہی مجھے حالات نے اجازت دی، میں اپنی امانت لینے آؤں گا۔ ہارون تو چلا گیا لیکن فرزانہ کی آنکھوں کی رم جھم جو ایک مرتبہ شروع ہوئی تھی کبھی نہ رکی۔

اگلی صبح رام چند، موتی لعل، ہربنس سنگھ اور کرن سنگھ، منور خان سے ملے اور ایک مرتبہ پھر انھیں بتانے کی کوشش کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حالات بے قابو ہو جائیں اور وہ کچھ بھی نہ کر پائیں لیکن خان صاحب نے جو ضد پکڑی تھی، اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ایک دن دوپہر کو جب خان صاحب کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے کہ بلوائیوں نے دھاوا بول دیا اور اس سے پہلے کہ خان صاحب اپنی حفاظت کے لیے کچھ کرتے، ایک نوجوان سکھ نے کرپان سے حملہ کیا اور خان صاحب آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بلوائیوں نے کہلا بھیجا کہ ہماری دشمنی صرف خان صاحب سے ہی تھی، ہم کسی اور سے کچھ نہیں کہیں گے۔

پہلے تو فرزانہ ہی رو رہی تھی اب سارا خاندان ہی رو رہا تھا۔ عرفان چھوٹا تو نہیں تھا لیکن اس قابل بھی نہیں تھا کہ گھر کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہو سکے۔ اب گھر تھا لیکن منور خان نہیں تھے، زبیدہ تھیں، ان کے

شوہر نہیں تھے فرزانہ تھی لیکن اس کے والد اور منگیتر نہیں تھے۔ شاید کبھی ہارون آ جائے۔ وہ راہ تکتی رہتی۔ کسی خط کا انتظار کرتی۔ شاید کوئی پیغام آ جائے۔ منور خان صاحب کی جائیداد کافی ساری تھی۔ کچھ تو مکانات تھے جو انھوں نے کرائے پر دے رکھے تھے۔ کچھ جاگیروں سے آمدنی حاصل ہو جاتی تھی۔ اس لیے نان نفقہ کی فکر تو نہیں تھی لیکن فکر یہ تھی کہ جیون کیسے بیتے گا۔ فرزانہ کی شادی کہاں ہوگی؟ کیا ہارون لوٹ کر آئے گا؟ کیا یہ تقسیم کی لکیر مٹ جائے گی؟ ایسا کیسے ہوگا؟ کیا وقت کا پہیہ واپس چلے گا؟ نہیں، یہ ممکن نہیں تھا تو کیا ہوگا؟

دن گزرتے جا رہے تھے۔ امید کی روشنی دھندلا رہی تھی۔ نجانے کیوں ایک انجانے خوف سے فرزانہ کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ کیا ہوگا؟ فسادات کی گرد بیٹھتی جا رہی تھی۔ اب فسادات میں وہ شدت نہیں رہی تھی جو ابتدائی دنوں میں تھی۔ اب بھی ہندو اور سکھ مسلمانوں کی جانوں کے درپے تھے۔ عرفان کا دن بھی رونے میں گزر جاتا تھا۔ زبیدہ روتی رہتی اور اب تو اس کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ فرزانہ کو امید تھی کہ ہارون لوٹ آئے گا۔ وہ دولہا بن کر آئے گا اور اپنی دلہن کو لے جائے گا۔ زبیدہ اب اپنے ملنے جلنے والوں سے بہت کم رابطہ رکھتی تھیں۔ کوشش یہی کرتی تھیں کہ کسی سے ملاقات نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ ان کا جسم مسلسل ڈھیلا ہو رہا تھا۔ انھیں بس یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ اب تو ہارون آ جائے تو وہ فرزانہ کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ یہ ان کی زندگی میں ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا لیکن کیا وہ واقعی لوٹ کر آئے گا؟ یہ اسے کون بتائے؟ بیتے دنوں کی یادیں ہی اب اس پورے خاندان کا سرمایہ تھیں۔

پاکستان بنے ہوئے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ زبیدہ کو اپنی بہن حمیدہ کے بارے میں صرف یہی پتہ چل سکا کہ وہ کراچی میں ہیں لیکن کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور ایک دن حمیدہ کا خط آ ہی گیا لیکن اس خط کے مندرجات ہی انھیں رلا دینے کے لیے کافی تھے۔ ہارون دہلی سے امرتسر پہنچ گیا تھا لیکن وہیں سکھوں کے ایک جتھے نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ وہیں ہارون کو قتل کر دیا گیا تھا۔

اب تو کچھ نہیں بچا تھا۔ زبیدہ اور فرزانہ رو رہی تھیں۔ رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔ اب تو کوئی نہیں آئے گا۔ دکھ، درد کی اس دنیا میں اب ماں بیٹی کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اب فرزانہ کے لیے کوئی کام نہ تھا سوائے اس کے کہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتی رہتی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆

سید کامی شاہ

عشا

سونے کے ٹھیکروں سے کھیلتے لڑکوں سے لڑائی کے بعد میں بھاگا تھا اور کسی سنگِ راہ سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل زمین پر آن گرا تھا۔

دھیان سے مُنا! کسی شفیق ہاتھ کا لمس میرے سر سے ہوتا ہوا چہرے اور شانے تک آیا تھا اور میں سسک کر رو پڑا۔

سونے کے ٹھیکروں سے کھیلنے والے لڑکوں سے پٹتے ہوئے مجھے رونا نہیں آیا تھا، غصہ آیا تھا۔ اور وہاں سے بھاگنے کی وجہ خوف نہیں تھا، کوئی احساسِ زیاں تھا کہ وقت کم تھا اس وقت میرے پاس۔ کوئی بہت قریب سے بار بار کان میں کہتا تھا: ”نکلو یہاں سے۔۔۔ تم یہاں کے نہیں ہو۔۔۔“

بہت دور کہیں، بڑے سے منقش تخت پر بیٹھا لمبے بالوں والا شاعر نہ جانے کس سے کہہ رہا تھا:

”تو جتنا ہو سکے جلدی چلا جا، نہیں جی چاہتا پھر بھی چلا جا!!!“

”کہاں چلا جاؤں۔۔۔؟“ میں سوچتا تھا اور وہ کہتی تھی۔

”تم سوچتے بہت ہو۔۔۔!!!“

اور وہ صرف کہتی نہیں تھی بلکہ ٹوکنے کے انداز میں کہتی تھی اور مجھے لگتا میں کوئی بہت بڑا کام کرتا ہوں۔

”تو سوچنا ایک بڑا کام ہے۔۔۔؟“

سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے میں نے اسی لمبے بالوں والے سے پوچھا تھا جو زمین کو ماں کہتا تھا اور پانی کو باپ۔

”آھو!“ وہ مسکراتا تھا اور مسکراتا ہی رہتا تھا۔۔۔ اسے کوئی بات نہ حیران کرتی تھی اور نا وہ کسی لمحے کے گزر جانے پر پچھتایا کرتا تھا۔۔۔ وہ کہتا تھا:

”سب گریزاں ہے، وہ سب گزر رہے ہیں، ایک دوسرے کے قریب سے، ایک دوسرے کے اندر سے، ایک دوسرے کی کیفیات پر بیت رہے ہیں، اور یہ سب ایسا ہی ہے، دائرہ دار قوسین در قوسین۔۔۔

سب کچھ ایک دوسرے میں شامل ہے اور اپنی جگہ مکمل ہے مگر ایک ادھورے پن میں لپٹا ہوا، سب اپنی جگہ مکمل ہیں مگر کوئی مکمل نہیں ہے، سب کے ہونے کی حالتیں مختلف ہیں، ہر کسی نے کسی دوسرے کے ساتھ مل کر مکمل ہونا ہے۔۔۔ سفر آگے کا ہے اور یہاں پڑاؤ کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔"

وہ بولتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔

"دھیان سے مُنا!!! لگی تو نہیں؟"

وہ کہتا تھا اور مسکراتا تھا۔۔۔ جیسے اسے یقین ہو کہ کہیں کوئی چوٹ نہیں لگی ہوگی۔

فوکس، بیلنس اور چینج۔۔۔!!! "دھیان کرو مُنا۔۔۔!!! فوکس کرو گے تو خود کو بیلنس کر سکو گے خود کو بیلنس کر لو گے تو اردگرد کی چیزوں کو چینج کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

"جی بابا! سب سے ضروری کیا ہے؟"

"فوکس! دھیان! اپنے رستے کا، اپنی منزل کا، اپنے اطراف کا، دھیان سب سے زیادہ ضروری ہے!!!"

وہ دور کہیں دیکھتے ہوئے بولتا تھا جو بالکل میرے جیسا تھا، اور میری ہی طرح بولتا تھا۔۔۔ اس کے کپڑے بھی میرے جیسے تھے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے شانے کو چھوا۔ اور وہ تحلیل ہو گیا۔ دھویں کی طرح، دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور میرا ہاتھ ہوا میں جھول کر میری برہنہ گود میں آ گرا۔

میرا بدن لباس سے محروم تھا۔۔۔ اور اطراف میں رات کی نیلگوں سیاہی پھیلی تھی۔ درختوں کے سانس لینے کی آواز چاروں طرف پھیلی تھی اور میں طویل قامت درختوں کے درمیان میں بچھے گھاس کے تختے پر برہنہ بیٹھا تھا۔ وہ بھی بے لباس تھی مگر اس کا بدن لباس کی زحمت سے ماورا تھا، وہ بظاہر ویسی تھی ہی تھی جن سے میں بے لباسی کی حالتوں میں ملتا رہا تھا مگر اپنے ہونے میں مختلف تھی۔ وہ کسی طرح بھی ان کے جیسی نہیں تھی۔ جو بولتی تھی اور مسکراتی تھی۔ درختوں کے سانس لینے سے اس کے سنہری بال ہوا میں لہراتے تھے۔۔۔ اور میں اس کے بدن میں اٹھتی قوسوں پر دھیان کرتا تھا۔

"میں عشا ہوں!!"

وہ درختوں کے سانسوں کے درمیان خوبصورتی سے گونجتی تھی اور اس کی آواز پر کسی رقص کرتے جھرنے کا گماں ہوتا تھا۔ وہ گھاس کے نرم تختے پر چلتی تو لگتا زمین سے دو انچ اوپر چل رہی ہے، نشے کی لہر کی طرح لہراتی ہوئی اس کی آواز میرے پورے جسم میں سنسنی بکھیر رہی تھی۔

''تم سوتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے، مجھے اچھا نہیں لگا کہ تمھیں جگاؤں!!!''

''اچھا!'' میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

وہ ایک رنگین لہر کی طرح میرے قریب چمکیلی گھاس پر بچھ گئی۔

''مجھ سے کچھ مت چھپاؤ، میں تم سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اور تمھارے ہونے کی متعدد حالتوں کو جانتی ہوں۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا اور میں اس کی نظر کی تاب نہیں لا سکا تھا، میں نے چہرہ نیچے کر لیا اور گھاس کے تنکے توڑنے لگا۔

یاد کسی لہر دار تصویر کی طرح میرے سامنے آتی تھی۔ بھاگتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گرا تھا تو اس نے سنبھالا تھا جو میرے جیسا تھا اور میرے جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ وہ بولتا بھی میری طرح تھا اور اس کے ہاتھ بھی میرے جیسے تھے۔

''دھیان، مَنا دھیان!!!'' میرا سارا دھیان اس ایک لفظ پر اٹک گیا تھا اور باقی سارے الفاظ کہیں کھو گئے تھے۔ سسکیاں تھیں کہ بڑھتی چلی جاتی تھیں۔

روتے روتے اُس کی گود میں سویا تو وہ اس وقت بھی میرے کپڑے پہنے ہوئے تھا مگر میں اس وقت برہنہ نہیں تھا۔ جب آنکھ کھلی تو اس باغ میں تھا جس کے درختوں میں روشنی کے پھول لگے تھے اور گھاس کے دبیز تختے بچھے تھے۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا ہر طرف ایک سکون تھا، چمکیلی گھاس کے دبیز تختوں سے بھی زیادہ دبیز سکون۔۔۔ جو شاید مجھ سے پہلے سے وہاں موجود تھا، اور اس نے میری موجودگی کا برا نہیں مانا تھا۔

یہاں اس وقت برہنگی کی حالت میں ہونا میری خواہش اور تمنا کے باعث نہیں تھا بلکہ یہ کوئی اور معاملہ تھا، اس سے پہلے ہو چکے بیشتر معاملات کی طرح یہ بھی کوئی اور راستہ تھا جو خود بخود میرے قدموں سے آلپٹا تھا۔

''ہم پانچ بہنیں ہیں، بڑی والی سب سے بڑی ہے اور چھوٹی والی سب سے چھوٹی۔!!!'' وہ شوخی سے مسکرائی تھی۔

''اور تم۔۔۔ تم کتنی بڑی ہو اور کتنی چھوٹی ہو؟'' میں بھی مسکرایا۔

''میں نہ بڑی ہوں نہ چھوٹی ہوں، میں بس ہوں۔۔۔ جیسے تم ہو۔ یہ درخت، پھول اور گھاس ہیں۔۔۔ یہ ہونا ہے اور ہونا ایسا ہی ہوتا ہے۔''

وہ دور کہیں دیکھتے ہوئے بولتی جاتی تھی۔

”تو وہ کون تھا جو سونے کے ٹھیکروں سے کھیلتے لڑکوں سے ڈر کے بھاگا تھا؟“

”نہیں، وہ ڈر کے نہیں بھاگا تھا۔ اسے اپنے ہونے کی طرف جانا تھا، اس وقت اسے وہاں نہیں ہونا تھا اس لیے اسے وہاں سے بھگا دیا گیا۔“

”کس نے بھگایا تھا، کون تھا وہ؟“

”تم ہی تھے اور تم ہی ہو، سب تمھارا ہونا ہے!!“ وہ کہتی تھی۔

”تو پھر تمھارا ہونا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی تمھارا ہی ہونا ہے، تم ہو اس لیے میں ہوں!!“

”مگر میں یہاں کیسے آیا؟“

”کہاں؟“

”یہ، یہاں اس جگہ؟“

”کون سی جگہ ہے یہ؟“

وہ میری حیرت کا مزہ لے رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم!!“ میں نے سر جھکا لیا۔

”یہ میرا باغ ہے اور تم یہاں ہو!!!“

وہ کھلکھلاتی تھی جیسے نیلمیں ہرے درختوں کی ٹہنیوں پہ لگے پھول چمکتے تھے، اس کی ہنسی کے ننھے ننھے کوندے سارے میں لپکتے تھے اور وہ میری آنکھ کے احاطے میں نہیں سماتی تھی۔

”ہم سب بہنوں کے اپنے اپنے باغات ہیں اور ہم سب کا اپنا اپنا ہونا ہے۔ ہم سب کے اپنے دائرے ہیں جسے تم وقت کہتے ہو!!!“

”مگر میں تو کہیں ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔“ میں نے کہنا چاہا۔

”گرے کب تھے؟“ اس نے مجھے ٹوکا۔

”تم نے گرنے نہیں دیا تھا خود کو۔“

”میں نے؟“

”ہاں تم نے!!“

”تو وہ جو میرے جیسے کپڑے پہنتا تھا اور میری طرح بولتا تھا وہ میں ہی تھا؟“

”ہاں وہ تم ہی ہو!!!“

"مگر وہ تو میرے بیٹے جیسا ہے!!!"

"وہ بھی تو تم ہی ہو!!!"

"اور تم؟

میں نے آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے پر رکھ دیں۔ "میں بھی تم ہی ہوں!!!

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

"ہو سکتا ہے، سب ہو سکتا ہے، اس عالمِ امکان میں سب ممکن ہے، اگر یقین نہیں ہے تو مجھے چھو کر دیکھ لو!!"

وہ میرے قریب ہوئی اور میں یک دم پیچھے ہٹ گیا۔۔۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ بھی اس کی طرح تحلیل نہ ہو جائے۔

"نہیں، میں جسے چھوتا ہوں وہ دھواں بن کر تحلیل ہو جاتا ہے، مجھ سے دور رہو!!!" میں نے کہا اور مزید پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہو سکتا ہے اس بار ایسا نہ ہو!" اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کیے بغیر کہا۔

"وقت کتنا بھی نا قابلِ اعتبار سہی، اس کے کسی نہ کسی لمحے پر تو اعتبار کرنا پڑتا ہے!!!" اُس نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔" میں نے سر جھکا لیا اور گھاس کے تنکے توڑنے لگا۔

"ناں مُنا بری بات، گھاس کے تنکے نہیں توڑتے۔"

اُس نے میرا سر سہلاتے ہوئے کہا تھا جو میرے جیسا تھا اور میری طرح کے کپڑے پہنتا تھا اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک شفیق سی مسکراہٹ رہا کرتی وہ نہ کسی بات پر حیران ہوتا تھا اور نہ اُسے کسی لمحے کے گزر جانے پر پچھتاوا ہوتا تھا۔۔۔ وہ کہتا تھا۔

"سب گریزاں ہے اور سب گزر جائے گا، ہم سب گریز کی حالتوں میں ہیں ہمارا ہونا ہمارے ہونے کی اصل حالت کی طرف ایک سفر ہے اور ایک دن یہ سفر تمام ہو جائے گا اور ہم اپنی اصل حالتوں میں لوٹ آئیں گے۔"

"ہم۔۔۔ ہم سب؟" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا اور وہ پیار سے میرا سر سہلاتا۔

"ہاں ہم سب۔۔۔!!!"

"یہ گھاس بھی؟" میں نے میدان میں پھیلی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں یہ گھاس بھی۔۔۔" اس نے کہا۔

”اسی لیے منع کیا کہ گھاس کے تنکے نہیں توڑتے اس سے انسان کا ذہن بکھرتا ہے اور وہ اپنے دھیان سے ہٹنے لگتا ہے۔ دھیان میں رہنا بہت ضروری ہے۔“

وہ میدان کوئی اور تھا مگر بات ایک ہی تھی۔

اُس نے بھی محبت سے ایک بات سمجھائی تھی اور اس نے بھی۔

”تمھیں پتہ ہے ان لڑکوں نے تمھیں کیوں مارا؟“ اُس نے پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے نہیں معلوم!!!“ میں نے اسی طرح جھکے سر کے ساتھ کہا۔

”کیوں کہ تم نے اس میدان میں پھیلی ان تمام بلاؤں کو دیکھ لیا تھا جسے وہ سونے کے ٹھیکروں سے کھیلنے والے لڑکے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ بلائیں ان کے دھیان پر حاوی تھیں اور وہ لڑکے ان بلاؤں کے معمول بنے ہوئے تھے۔ بڑے میدان میں ایک دوسرے کا ٹھٹھہ کرتے اور تمسخر اڑاتے وہ تمام لڑکے ان بلاؤں کے اسیر تھے اور اپنے اصل سے واقف نہیں تھے۔ تم نے انھیں دیکھ لیا تھا۔“

”مگر۔۔۔ مجھے تو ایسا کچھ بھی یاد نہیں؟“ میں نے کہا۔

”بس مجھے وہ اچھے نہیں لگے تھے اور وہ کھیل بھی بہت فضول سا تھا سونے کے ٹھیکروں کا ڈھیر لگانا اور پھر اسے بکھرا دینا اور ایک دوسرے پر ٹھٹھے کرنا۔۔۔ بہت فضول سا لگا تھا مجھے ان کا کھیل سو میں نے ان کے ساتھ کھیلنے سے انکار کر دیا جس پر ان سب نے مل کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے میں وہاں سے بھاگا اور پتہ نہیں کہاں جا کے گرا تھا مجھے ٹھیک سے سب کچھ یاد نہیں۔۔۔“ میں انگلیوں سے اپنا ماتھا سہلانے لگا۔

”مجھے سب یاد ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور درختوں سے بہت سارے سفید اور بنفشی پرندے ایک ساتھ اڑے تھے اور باغ میں کئی رنگین لہریں پھیل گئی تھیں۔

مجھے شدید سردی محسوس ہونے لگی، میں اپنے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر مزید اپنے اندر سمٹ گیا۔

”سردی لگ رہی ہے؟“ اس نے پوچھا اور میرے بالکل سامنے آ کر بیٹھ گئی بالکل میری طرح۔

”لو اب نہیں لگے گی۔“

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے وجود کے گرد ایک سفید ہالہ بنا ہوا تھا جس نے ہم دونوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ سردی کا احساس یک دم ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ایک راحت بخش حرارت نے لے لی۔

”اب تو نہیں لگ رہی سردی۔“ اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنسی۔

درختوں سے مزید سفید اور بنفشی پرندے اڑے اور باغ میں کئی رنگین لہریں کوند گئیں۔

''میں یہاں کیسے آیا؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتہ۔''

اس نے کندھے اچکا کر کہا اور پھر وہی ہنسی۔۔۔پرندے اڑانے اور رنگین لہریے پھیلانے والی انوکھی ہنسی۔۔۔جیسے اکسا رہی ہو، اپنے طرف بلا رہی ہو، اس کے چہرے سے نکلتی شعاعیں سارے میں ایک عجیب سا ہالہ بنا رہی تھیں، میں خود کو اس کی طرف زیادہ دیر تک دیکھتے رہنے سے قاصر پاتا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے بار بار اپنی طرف دیکھنے کا خیال آتا تھا اور اپنی برہنگی کا احساس شدت سے ہوتا تھا۔ اس کے جیسی بہت ساری جو ملی تھیں وقت کے دائروں میں اور ہونے کے مداروں سے باہر لے گئی تھیں وہ اسی کے جیسی تھیں جو ہنستی بھی تھیں، روتی بھی تھیں اور رلاتی بھی تھیں مگر ان میں سے کسی کی ہنسی ایسی نہیں تھی پرندے اڑانے اور رنگین لہریے بنانے والی انوکھی ہنسی، اور ایسے کسی باغ میں بھی نہیں ملی تھیں جس کے درختوں کی چوٹیاں نظر نہیں آتی تھیں اور نہ گھاس ایسی رنگین تھی اور نہ ایسے بے تحاشہ رنگوں سے لبریز پھول۔۔۔

''تم کون ہو اور یہ کون سی جگہ ہے؟''میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ پھر ہنسی اور پھر ویسے ہی بہت سے سفید اور بنفشی پرندے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر آسمان کی طرف پرواز کرتے دکھائی دیے۔ اور رنگین لہریے جو فضا میں بل کھاتے اور ہمارے اطراف گھاس کے تختوں پہ گر کر تحلیل ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

''بتایا تو ہے میں عشا ہوں اور یہ میرا باغ ہے۔ اور اب یہ باغ بس تھوڑی ہی دیر ہے پھر نہ یہاں میں ہوں گی اور نہ یہ باغ۔''

''اور میں؟''میں نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں، تم بھی۔''اس نے کہا۔

''تم کہاں جاؤ گی؟''میں نے پوچھا۔

''جہاں مجھے ہونا چاہیے۔''اس نے کہا۔

''کہاں ہونا چاہیے تمھیں؟''میں نے پوچھا۔

''یہ تمھارا مسئلہ نہیں ہے، میں بس ابھی ہوں یہاں اور تھوڑی دیر بعد نہیں ہوؤں گی، تم چاہو تو مجھے چھو کے دیکھ سکتے ہو۔''اس نے کہا۔

''نہیں۔''میں نے کہا اور گھٹنوں پر اپنے ہاتھ مزید مضبوط کر لیے۔

وہ بغیر کچھ کہے میری طرف دیکھتی رہی۔

مجھے لگا کہ میں کچھ مضحکہ خیز سا نظر آ رہا ہوں، میں نے اپنی پشت کو ذرا سا ڈھیلا کیا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ کر، گھٹنوں کے گرد لپٹے اپنے ہاتھ کھول کر میں نے گود میں رکھ لیے۔

”میں جسے بھی چھوتا ہوں وہ دھویں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر چہرہ نیچے کر لیا۔

”میں نے تو پہلے بھی کہا کہ اگر یقین نہیں ہے تو چھو کے دیکھ لو۔“ اس نے ہوا میں اپنا ہاتھ لہرایا۔

پھر وہی ہنسی، اکسانے والی اور اپنی طرف بلانے والی عجیب گنگناتی ہوئی ہنسی۔

میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے چھونے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ سے ٹکراتے ہی وہ دھواں بن کر تحلیل ہونے لگی۔۔۔ میرا ہاتھ ہوا میں جھول کر رہ گیا۔

☆☆☆☆

وقار احمد ملک

سکیسر کی بتیاں

میرا نام بلقیس ہے۔ صرف بلقیس، آگے پیچھے کچھ نہیں۔ ہاں بچپن میں مَیں بلقیس زماں ہوا کرتی تھی جو نام میرے باپ کی دین تھا اور شادی تک میرے ساتھ لگا رہا۔ بعد میں مَیں بلقیس زماں سے بلقیس ستار بن گئی۔ یہ نام میرے شوہر کی وجہ سے میرے ساتھ لگا جو تیس سال میرے ساتھ چمٹا رہا۔ ستار نمایاں رہا اور بلقیس معدوم۔ پھر ستار بھی غائب ہو گیا ایسے جیسے زماں غائب ہوا تھا اور بلقیس کا نام ابھرتا چلا گیا۔ اب صرف بلقیس ہے۔ کسی لاحقہ کے بغیر، کسی سابقہ کے سوا۔ آزاد فضا میں سانس لیتا ہوا یہ نام بادِ بہاری میں لرزاں کمزور گلِ داؤدی کی طرح اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بچپن میں جب بابا میری چپلوں اور مکوں سے پٹائی کیا کرتے تھے تو میری جان بچانے کے لیے ماں قریب نہ آتی۔ کیسے آتی، اسے مجھ سے زیادہ مار پڑتی۔ بابا مار مار کے تھک جاتے تو کھٹے پسینے میں بھیگی لمبی چوڑی مونچھ کو اپنے پیلے رومال کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتے۔ چولھے میں لکڑیاں پھونکتی ماں کنکھیوں سے اسے باہر جاتا دیکھتی۔ جب دروازے کا پٹ زور سے بند ہوتا تو وہ اُٹھ کر میرے پاس آتی اور میرے زخموں کو سہلا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیتیں۔ حالاں کہ میں اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ ماں کی گود میں بیٹھنا معیوب نہیں تو عجیب ضرور محسوس ہوتا تھا۔ میرے بابا کا نام شیر زماں تھا۔ وہ تعلیم خاص کر لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف تھا۔ لیکن ماں مجھے پڑھانا چاہتی تھی اور مجھے چوری چھپے گھر کے ساتھ والی دوکان سے کاپی، قلم دوات، تختی اور کتاب لا کر گھر پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ خود آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی اور مجھے دس تک پڑھانے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ جب کبھی بابا میرے ہاتھ میں قلم کتاب دیکھ لیتا تو میری شامت آ جاتی اور میری ٹھیک ٹھاک درگت بنتی۔

میری ایک خالہ سون کی وادی میں رہتی تھی جس کا شوہر یعنی میرا خالو سکیسر کی چھاؤنی میں افسر لگا ہوا تھا۔ ایک دفعہ سخت گرمیوں میں بابا بیمار ہوا تو خالو اور خالہ تیمارداری کے لیے آئے اور چند دن ہمارے پاس رہے۔ بابا ٹھیک نہ ہوا، الٹا بیماری نے زور پکڑ لیا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کو ٹی بی تھی جس کے لیے پرفضا مقام پر ہی وہ ٹھیک ہو سکتے تھے۔ خالو کے کہنے پر ہم سب ان کے ساتھ سکیسر چلے گئے جہاں انھوں نے بابا کو سرکاری ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ جولائی اگست کو دو مہینے ہم نے سکیسر میں گزارے جہاں ان گرم مہینوں میں بھی موسم

خوشگوار تھا۔ سکیسر میں خالہ کا گھرانہ ایک کوارٹر میں رہائش پذیر تھا جس کے دو بڑے بڑے بلند چھتوں والے کمرے ہم دو خاندانوں کے لیے کافی تھے۔ میرا خالہ زاد جس کو سارے تارا تارا کہتے تھے اس وقت دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بابا ہسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔ خالہ نے تارے بھائی کو کہا کہ مجھے لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ میری عمر اس وقت کوئی دس بارہ سال ہوگی۔ دو مہینوں میں مَیں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں پڑھنے کے قابل ہو گئی۔ خالہ کے گھر میں شہتوت کے دو درخت ہوا کرتے تھے۔ ایک پر کالے اور دوسرے پر سفید توت لگتے۔ تارا اور میں ان درختوں کی چھاؤں میں پڑھا کرتے۔ مجھے کالے توت کا درخت پسند تھا اور اس کے نیچے دری بچھا کر بیٹھ جاتی۔ تاری آتا تو وہ دری گھسیٹ کر سفید توت والے درخت کے نیچے لے جاتا۔ اس کے مطابق کالے توت اس کے سفید لباس کو خراب کر دیتے ہیں۔ میں خاموشی سے درختوں کی چھاؤں تبدیل کر کے اس کے پاس بیٹھ کر پڑھنا شروع کر دیتی۔ تاری اور میں شام کو بابا کا کھانا ہسپتال دے کر واپس آ رہے ہوتے تو خالہ کے کوارٹر کے چھجوں پر لگے دو بلب دور سے ہی نظر آنا شروع ہو جاتے۔ تاری اور میں ہسپتال میں کھانا دے کر جلدی ہی باہر نکل آتے اور پھر سکیسر کی گلیاں ماپا کرتے۔ یہ علاقہ اردگرد کے میدانی علاقوں سے بہت بلندی پر قائم ہے۔ چاروں طرف گہرائیوں میں پھیلی ہوئی زمین گھاٹیوں کی شکل میں دکھائی دیتی۔ مشرق کی طرف نوشہرہ، خوشاب، جوہر آباد اور دور سرگودھا کی روشنیاں تاریکی میں جھلملاتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ مغرب میں کوسوں دور میانوالی اور مضافات، شمال میں لاوہ، چکڑالہ، رکھی اور جنوب میں قائد آباد، واں بھچراں اور بندیال کے شہر ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دیتے۔ میں اپنے آپ کو نیچے میدانی علاقوں میں رہنے والے لوگوں سے بہت ارفع اور اعلیٰ محسوس کرتی۔ سکیسر کی ٹھنڈ میں میدانی گرمی کا احساس جاتا رہا تھا۔ تاری اور میں شام کو چادریں لپیٹ کے گھوما کرتے تھے۔ نیچے جب ہم گھر میں تھے تو بڑے سے صحن میں پنکھے کے آگے بھی پسینے میں شرابور ہانپتے کانپتے راتیں گزارا کرتیں۔ اگست کے مہینے میں ساون کی گھٹائیں اُٹھنا شروع ہوئیں تو یہاں کا حسن اور بھی نکھر گیا۔ جانے کہاں سے سلیٹی، سفید، نیلے اور کالے کالے بادل بجلی کی سی تیزی سے اُمڈ آتے اور منٹوں میں چھما چھم بارش برسنا شروع ہو جاتی۔ پھر اچانک بارش یوں رکتی جیسے باتھ روم کا شاور کسی نے بند کر دیا ہو۔ اور پھر بادل بھی اپنا بوریا بستر لپیٹ کر دور بھاگ جاتے۔ برسات میں یوں لگتا تھا کہ جیسے دسمبر کا مہینہ آ گیا ہے۔ رات کو کمروں میں بند کمبل اوڑھ کر سوتے اور صبح کی دھوپ میں گیلے گیلے جسموں کو سینکا کرتے۔

میری پڑھائی جاری تھی۔ برسوں کے سبق چند دنوں میں یاد کرنے کی سعی میں مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں نے اچھا خاصا پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے۔ اب میں نے خالہ کے گھر پڑے پرانے ٹوٹ بٹوٹ اور جگنو

نامی بچوں کے رسالے پڑھنا شروع کر دیے۔ اماں مجھے پڑھتا دیکھتی تو خوشی سے مسکرانا شروع کر دیتیں۔ جب میں اور تاری سفید توت کے درخت کے نیچے دنیا مافیہا سے بے نیاز پڑھائی میں مصروف ہوتے تو اماں اور خالہ تھوڑی دور برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی خاندانی لوگوں کی برائیاں کرنے میں محو ہوتیں۔ پھر اچانک کبھی کبھار ان کی آوازیں پست ہو کر سرگوشیوں میں بدل جاتیں اور نظروں کے عدسے ہمیں گھورنا شروع کر دیتے۔ دونوں بہنوں کے ہونٹوں پر میلی سی مسکراہٹ بھی کھیلتی رہتی۔ خالو کے آنے کا وقت ہوتا تو خالہ پڑھائی ختم کر کے چٹائی لپیٹنے کا کہہ کر باورچی خانے میں چلی جاتیں۔ میں ماں کے ساتھ بائیں جانب کے کمرے میں جا بیٹھتی جہاں ہمارا سامان پڑا رہتا تھا۔ ہمیں جو کمرہ دیا گیا تھا اس کے سامنے تھوڑا فاصلے پر ریسٹ ہاؤس کی پرانی عمارت موجود تھی۔ اس کے بائیں جانب گہری وادی اور پھر دور میدانی آبادیاں اپنی موہوم سی موجودگی کا احساس دلوا رہی ہوتیں۔ توت کے دونوں درخت سبز کچور پتوں سے بھر چکے تھے۔ فرش کالے اور سفید توتوں سے بلیک اینڈ وائٹ فلم جیسا ماحول پیدا کر رہا ہوتا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوائیں آ آ کر ہمارے سینے سے لگ کر جسموں کو گدگداتیں۔ مجھے پہلی دفعہ جسم میں گدگدی کا احساس ہوا لیکن وہ دن ہمارے وہاں قیام کا آخری دن تھا۔ بابا اب ٹھیک ہو گئے تھے لیکن بیماری نے ان کو دو مہینوں میں بوڑھا کر دیا تھا۔ سکیسر میں ہمارے قیام کے آخری دن زوروں کی بارش ہوئی تھی۔ کالے بادلوں سے گرتے ہوئے سفید موتیوں جیسے قطرے دھلے ہوئے پہاڑ کو دوبارہ نہلا رہے تھے۔ ہر طرف ساون کی ہریالی شاخوں، پتوں، ٹہنیوں اور پھلوں پھولوں کی شکل میں رقص کناں تھی۔ تاری نے آخری سبق برآمدے کی سرخ ٹائلوں پر دیا۔ جب ہم نکلنے لگے تو اس نے اندر سے ایک سکول بیگ لا کر مجھے دیا جس میں کتابیں، کاپیاں اور کہانیوں پر مشتمل رسالے موجود تھے۔ بیگ کو دیکھ کر میں ڈر گئی کیوں کہ بابا ٹھیک ہو چکے تھے اور بابا کے ہوتے ہوئے سکول بیگ کی موجودگی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ لیکن جب بابا کو ہسپتال سے گھر لایا گیا تو وہ سویا سویا اور خاموش تھا۔ اسے ہم لوگوں یا اس خوبصورت موسم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جب سکیسر سے بس چلی تو ٹھنڈ کی وجہ سے ہمیں بس کی کھڑکیوں کے شیشے بند کرنے پڑے۔ لیکن جوں جوں بس پہاڑوں سے نیچے اترتی گئی موسم بدلتا گیا۔ آدھے گھنٹے میں ہی گرمی کا احساس ہونے لگا اور ہم نے کھڑکیوں کے شیشے کھول دیے۔ جب گھر پہنچے تو شام کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی دیواروں سے جلتے ہوئے تنوروں کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گرمی زوروں پر تھی۔ پورا گاؤں اپنے صحنوں میں چارپائیاں بچھائے شام کے گرم اور حبس بھرے لمحات گزارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہاڑوں پر ہونے والی بارش میدانی علاقوں کی گرمی میں حبس کا اضافہ کر دیتی ہے۔ رات گئے گرمی اور حبس کی شدت میں کمی ہوئی تو مچھروں

نے حملہ کر دیا۔ رات اُٹھتے بیٹھتے کٹی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم اسی گاؤں کے باسی تھے اور اسی ماحول میں ساری زندگیاں گزاری تھیں۔ رات دو بجے بابا نلکے کے نیچے نہا رہے تھے اور میں نلکا چلا رہی تھی۔ نلکے کی ہتھی چلاتے ہوئے پورا جسم پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ اچانک میری نگاہیں دور شمال کے آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ اماوس کی اندھی رات میں سکیسر کے پہاڑ پر روشنیاں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ سکیسر کی بتیوں کو دیکھتے ہی میرے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ نلکے کی ہتھی کے چلنے کی رفتار میں اچانک اضافہ ہوا تو بابا نے زور سے گالی دی۔ ماں مری ہولے گیڑ نلکا۔

بابا کے مرنے کے بعد میری شادی عبدالستار سے کر دی گئی۔ وہ عمر میں مجھ سے پندرہ برس بڑا تھا۔ گھر اتنا بڑا کہ چار دیواری کی دیواریں ہی نہ تھیں۔ ساری دھرتی اپنی معلوم ہوتی۔ اس گھر میں دن کے وقت عورت اور مرد میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ زمینوں کی مشقت ہو یا جانوروں اور مویشیوں کے کام، سب ایک ساتھ کیا کرتے۔ صبح تڑکے کام میں جوتا جاتا اور رات گئے گردن سے پٹا اترتا۔ ستار کا سلوک میرے ساتھ عجیب انداز کا تھا۔ وہ مجھے کچھ نہ کہا کرتا۔ نہ زیادہ کام پر خوش ہو کر شاباش دیتا نہ کام نہ کرنے پر توقّم کرتا۔ بس اُسے خود کام کرنے کا شوق تھا اور وہ جانوروں سے بڑھ کر کام کیا کرتا۔ میری باگیں میری ساس چاچی شیموں کے ہاتھوں میں تھیں۔ اماں اب گاؤں چھوڑ گئی تھی اور میانوالی میں اپنی بیوہ ماں کی خدمت کر رہی تھی۔ میں کبھی کبھی اس کو ملنے جاتی لیکن جلد ہی اپنے گھر کے کام کاج کے باعث مجھے لوٹنا پڑتا۔ میرے معمول میں دو بھینسوں کی دیکھ بھال اور باورچی خانے کا کام تھا۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے۔ جب رات کو تھک کر چارپائی پر گرتی تو سونے سے پہلے شمالی آسمان کو ایک نظر لازمی دیکھا کرتی جہاں سکیسر کی بتیاں جھلملاتی ہوئی خاموشی کے ساتھ مجھے اپنی طرف بلا رہی ہوتیں۔ میں دیر تک ان بتیوں کو دیکھتی رہتی۔ کبھی خوابوں اور خیالوں میں یوں لگتا کہ میں توت کے درختوں تلے تاری کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں اور وہ مجھے سبق پڑھا رہا ہے۔ برآمدے میں خالہ اور اماں ہمیں دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ خالہ کے گھر کی کیاری میں سے اٹھتی ہوئی موتیے اور چنبیلی کی خوشبو سکیسر کو جنتِ ارضی بنا رہی ہے۔ لیکن اس جنت میں قیام عارضی ثابت ہوتا۔ بھینسوں کے باڑے سے اُٹھنے والی بدبو کے بھبھوکے زیادہ دیر میرے خیالستان کو معطر نہ رہنے دیتے۔

تین دہائیاں بھینسوں، زمینوں، صحن اور کچے کوٹھوں کے ساتھ ساتھ عبدالستار کی خدمت پوری ہوئی تو اچانک سب کچھ تیزی سے بدلنے لگا۔ ٹی بی نے ایک دفعہ پھر سر اُٹھا لیا تھا۔ اس مرتبہ اس کا نشانہ میرا خاوند تھا۔ وہ سال سے زیادہ بستر پہ پڑا تھوکتا رہا۔ اب کے کسی نے پہاڑوں پہ جانے کا مشورہ نہ دیا۔ بیماری لمبی ہوئی تو بھینسیں بھی بیچنا پڑیں۔ زمین خاندانی وارثوں میں تقسیم در تقسیم ہوتی ہوئی محدود ہو چکی تھی۔ عبدالستار کے

آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ اس کی بہنوں اور بھائیوں نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تیسرے دن ہی مجھے گھر سے نکال دیا گیا اور میں ایک دفعہ پھر اپنی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی کیوں کہ وہ بھی ایک تنہا زندگی بسر کر رہی تھی۔ نانی کو فوت ہوئے تیسرا سال تھا۔

دو دم اکیلے اس بڑے سے مکان میں رہ رہے تھے۔ کبھی کبھی تو اس کشادگی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا۔ دن کو محلے کے بچے ہمارے گھر میں آجایا کرتے اور خوب چھپن چھوت، پٹھو گرم، اخروٹ، بنٹے اور چم چڑیا کوڑا کوڑا کھیلا کرتے۔ اماں جو اب شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ بن چکی تھی آہستہ آہستہ خاموش ہوتی چلی گئی۔ میں نے محلے کے چھوٹے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ صبح سے شام کرنا پھر بھی مشکل بنا رہا۔ زندگی مال گاڑی کی طرح دھیرے دھیرے آگے کی طرف بڑھنے لگی۔

سخت گرمیوں میں اماں فوت ہوئیں تو میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ محلے کی ایک بے سہارا بوڑھی خاتون نے اب میرے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس خاموش طبع عورت کی موجودگی برائے نام تھی۔ ماسی نوراں بہت کم بولا کرتی۔ زیادہ وقت وہ جائے نماز پر نماز تسبیح میں گزار دیتی۔ گرما زوروں پر تھا۔ دن گیارہ بجے گلی محلے خاموش ہو جاتے۔ دوکانیں بند ہو جاتیں۔ لوگ رات کی طرح آرام کرنے لگتے۔ بچے بھی اپنے گھروں میں واپس چلے جاتے۔ گرمی جتنی بھی شدید کیوں نہ ہوتی ماسی تین چار گھنٹے دن کو لازمی سویا کرتی۔ جولائی اگست کے مہینے میں رات حبس ہوا کرتا تھا اور پنکھے کے باوجود نیند نہ آتی۔ ایک رات ماسی نوراں اور میں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ نوراں اپنی زندگی کا نچوڑ پیش کر رہی تھی۔ اس کے مطابق عورت کی زندگی سہاگ اور بچوں تک ہی ہوتی ہے۔ ورنہ زمین کے نیچے اور اوپر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے محلے دار عورتوں سے سن رکھا تھا کہ نوراں کا شوہر اس بیچاری پر بڑا ظلم کیا کرتا تھا۔ اس کا کام رنڈیوں کے پیچھے بھاگنا اور چرس کے سوٹے لگا کر گلیوں میں گھومتے ہوئے لوگوں کے گھروں میں جھانکنا ہوتا۔ نوراں کے دو بیٹے تھے۔ دونوں نشئی بن گئے اور گھر کی ہر چیز بیچ کر نشے میں پھونک دی۔ باپ کی طرح بیٹے بھی نوراں کو پیسوں کی طلب میں گالیاں دیا کرتے اور کبھی کبھی تو مارا بھی کرتے تھے۔ لیکن مجال ہے کہ نوراں نے کبھی کسی کے سامنے ان تین مَردوں کے خلاف کبھی زبان بھی کھولی ہو۔ آج بھی وہ عورت کے لیے مَردوں کا حصار ضروری قرار دے رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے نوراں کی منافقت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں بلقیس زماں سے بلقیس ستار بن گئی لیکن زندگی کا جو مزہ اکیلی بلقیس میں تھا وہ لمبے ناموں والی بلقیس میں کہاں۔

گرمی اور حبس کے باوجود نوراں سو گئی۔ میں چھت پر آ گئی کہ شاید ہوا کا کوئی جھونکا تپتے ہوئے جسم میں ٹھنڈک کا احساس پیدا کر جائے۔ چھت پر چاروں طرف سناٹا تھا۔ اندھیرے، خاموشی اور خوف کی ملی جلی

بے کیف فضا میں میری نظریں مشرق کی طرف اُٹھ گئیں۔ دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سکیسر کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ سکیسر کے باسی کمروں میں کمبل اوڑھے مطالعہ میں مصروف تھے یا پھر سکیسر کی خاموش گلیوں میں چپکے چپکے چہل قدمی میں مصروف تھے۔ خالہ کے کوارٹر کے چھجوں پر لگے دو بلب سکیسر کی روشنیوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

☆☆☆☆

صوفیہ راحیل

کیکر کے دو پیڑ

وہ آج تقریباً دس سال کے بعد گاؤں آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا، اسکی والدہ، بھائی، چھوٹی بہن اور اس کے بچے بھی آئے تھے۔ اپنے گاؤں آخری دفعہ وہ اپنی نانی اماں کے انتقال اور چہلم پر آئی تھی۔ اُسے یاد تھا ک اس کے گاؤں کا پہلا بیرونی منظر کیکر کے وہ دو پیڑ تھے۔ جو جڑواں تھے وہ بہت موٹے تنے والے اور چھتری کی طرح پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے نیچے، کسی زمانے میں ہری ہری گھاس ہوا کرتی تھی جس پر وہ اپنے خالہ، ماموں اور چچازاد بچوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

وہ کیکر کے دو پیڑ اس کے گاؤں کی نشانی تھے۔ اس کو یہ پیڑ دو مسلح پہریدار نظر آتے۔ اُن پیڑوں سے اُسے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے نیچے اُس کے بڑے ماموں اپنا ٹریکٹر ٹرالی ٹھہرایا کرتے تھے، جس میں وہ اور اس کے ساتھی سب بچے بچیاں چھپن چھپائی اور دوسرے مختلف کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اُنھی پیڑوں کے نیچے گاؤں کی عورتیں گندم اور چاول صاف کیا کرتی تھیں۔ یہ پیڑ گاؤں کی سرگرمیوں کا مرکز تھے۔ اُسے یاد آیا ایک بار کچھ بازی گر لوگ بھی اپنے کرتب دکھانے آئے تھے تو اُنھی پیڑوں کے نیچے گاؤں کے سب لوگ کرتب دیکھا کرتے تھے اُنھی پیڑوں کے بڑے اور موٹے ٹہنوں پر وہ اور اس کی خالہ زاد بہنیں پینگ ڈلوایا کرتی تھیں جس پر وہ گھنٹوں اُن کے ساتھ جھولتی اور ساون میں بارش کا منظر بھی دیکھتی۔

وہ اکثر کھانے کی چیزیں بھی ساتھ ہی لے جاتی اور پینگ پر بیٹھ کر کھاتی رہتی۔ اُن پیڑوں پر طرح طرح کے پرندوں کو دیکھنا بھی اُسے اچھا لگتا۔ جب اُن پیڑوں پر پیلے پیلے پھول لگتے تو بہار اسے اور بھی پیاری لگتی۔ ان پھولوں کی مہک اسے خاص طور پر بہت اچھی لگتی۔ اس کے اپنے کان تو چھدے ہوئے نہیں تھے لیکن وہ اپنی چھوٹی خالہ اور اپنی کزن کو ضرور کہتی ک وہ اُسے کیکر کے پھول کانوں میں پہن کر دکھائیں۔

اُسے یاد تھا ک اس کے نانا ابو کی حویلی کچی تھی۔ نانا ابو کو جب کوئی پکی حویلی بنانے کا مشورہ دیتا تو وہ جواب دیتے ک انسان جب خود کچا ہے اور کبھی بھی ٹوٹ کے بکھر سکتا ہے تو پھر پکے مکان کس کام کے۔

اس حویلی میں چھ کمرے، دو باورچی خانے، دو غسل خانے اور باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ کئی اور بڑے پیڑ بھی تھے۔ صحن میں، دو شیشم، دو کچنار، دو دھریک، تین توت اور ایک بیری کا درخت، باغیچے میں جامن، امرود،

انار، موتیا، گلاب، اور ہار سنگھار کے پودے تھے۔

دس سال پہلے جب اُس کی نانی اماں کا چہلم تھا تو وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ گاؤں آئی تھی۔ تب تک نانا ابو کی حویلی کے ایک کمرے کی چھت تقریباً گرنے والی تھی۔ باقی تمام حویلی ویسی کی ویسی موجود تھی لیکن آج جب وہ وہاں آئی تو اُس نے عجیب منظر دیکھا۔ گاؤں کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

کیکر کے وہ دو پیڑ وہاں موجود نہیں تھے۔ اُسے لگا کہ وہ شاید کسی اور گاؤں میں آ گئی ہے۔ اس کے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ نہیں۔ یہ تو اُسی کا گاؤں تھا۔ مگر کیکر کے اُن پیڑوں کے بغیر۔۔۔۔ کتنا ویران، بے رونق، بے رمق، بے جان۔ اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ اُس کے نانا کی حویلی بھی وہاں موجود نہ تھی۔

حویلی کے بجائے وہاں خالی زمین تھی، گڑھوں سے پٹی ہوئی۔ لوگوں نے وہاں سے مٹی بھی نکال لی تھی۔ نہ کوئی پودا رہا نہ درخت، سب کچھ کاٹ ڈالا گیا تھا۔ کچنار کا بس ایک ٹھنٹھ باقی بچا تھا۔ وہ گاڑی سے اتری اور آہستہ سے چلتی ہوئی اُس ٹھنٹھ سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کو ہاتھوں سے چھونے لگی کہ شاید زندگی کی کوئی رمق باقی ہو مگر وہ تو مر چکا تھا۔

اس نے دور نظر دوڑائی۔ کیکر کے پیڑوں کے اس طرف گاؤں کا سکول ہوا کرتا تھا جو اب بھی وہیں تھا۔ ساتھ ہی اس کے نانا ابو، نانی اماں اور اس کے ماموں کے چھوٹے بیٹے کی آخری آرام گاہیں تھیں جو صاف نظر آ رہی تھیں۔ اُسے لگا کہ جیسے کیکر کے وہ دو پیڑ بھی اُنھی قبروں میں کہیں دفن ہو گئے ہوں۔

☆☆☆☆

اعظم سید

کونج

رات جب بیت جائے تو سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے آسمان پر آخری ستارہ کتنا تنہا نظر آتا ہے! ویسے ایک بات ہے، لوگ دن کی روشنی کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ تو کیا انھیں کالے آسمان پر ستاروں کا میلہ دکھائی نہیں دیتا؟ ہر طرف جب گھپ اندھیرا چھا جائے تو آسمان کتنا خوبصورت لگتا ہے۔ روشنی کے لیے اندھیرا بھی تو ضروری ہے نا! دن لاکھ اچھا سہی مگر کرن اندھیرے کے بطن سے ہی تو جنم لیتی ہے۔

بچپن میں ہمیں بھی راتیں اچھی لگتیں۔ چھوٹے بڑے سب صحن میں چارپائی پر لیٹے آسمان پر ستارے گن رہے ہوتے۔ دادی اماں آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہتیں:

''بیٹا۔ چندا ماموں اپنے بچوں کو لے کر آ گئے۔''

ہم بڑے اشتیاق سے دیکھتے۔ تا حدِ نگاہ کالے آسمان پر چاند ستاروں کے جھرمٹ میں گھرا ہوتا اور پھر ہم دادی اماں کو دیکھتے، ایک نظر پورے خاندان پر دوڑاتے۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے دادی چاند ہو اور باقی سب ستارے۔ ہمارا صحن ایک کالا آسمان لگتا۔

گرمیوں میں تو صحن میں ہی سو جاتے۔ پاس ہی مرغیوں کا ڈربہ ہوتا۔ ساری رات پھڑ پھڑاہٹ کی آواز کانوں سے ٹکراتی رہتی۔ کبھی کبھی کوئی بلی چھلانگ مار کر چارپائی کو عبور کرتی تو ہمارے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھنے سے چارپائی چرچرا اٹھتی۔

''سو جاؤ بچو۔ ابھی فجر کی اذان بھی نہیں ہوئی۔'' اچانک دادی کی نحیف آواز بلند ہوتی۔ وہ نیند کی حالت میں بھی گرد و نواح سے باخبر رہتی تھیں۔ اور ہم اکثر ایک دوسرے سے کہتے: ''یہ دادی سوتی نہیں کیا۔''

سوتا تو چاند بھی نہیں۔ ساری رات سوئے ہوئے ستاروں کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔ روشنی بھی کرتا ہے۔ یہ روشنی شاید ہمارے لیے اہم نہ ہو لیکن اس کی قدر و قیمت وہ کونج ہی بتا سکتی ہے جو ڈار سے بچھڑی ہو۔

کونج سے یاد آیا، ہمارے گھر کے قریب ایک ندی تھی۔ اُس میں کونجیں آ کر نہاتیں۔ ہماری دیرینہ خواہش رہی کہ ان میں سے ایک کونج کو پکڑتے۔ لیکن یہ خواہش حقیقت کا رُوپ نہ دھار سکی۔ ہاں۔ ایک شام ایسا ہوا کہ کوئی کونج ڈار سے بچھڑ کر گرتی پڑتی ہمارے گاؤں کی عقبی جانب پگ ڈنڈی میں اُتر گئی۔ غالباً تھکن

سے نڈھال ہو چکی تھی۔ میں گھر کی چھت پہ کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے جوتی، کامی، نوری غرض جو جو زبان پر آیا، سب کو آواز دی۔

''کیا ہوا۔ کیا ہوا؟؟'' وہ پل بھر میں آ نمودار ہوئے۔

''کونج۔ کونج''۔۔۔۔ میں چلا رہا تھا۔

''کہاں ہے؟'' وہ یک زبان ہو کر بے قراری سے بولے۔ اور میرے اشارہ کرنے پر ایسے پگ ڈنڈی کی طرح دوڑے جیسے سکول میں سو میٹر ریس کے دوران بچے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر کونج نے سب کو دوڑایا۔ ایک درخت سے دوسرے درخت پہ جا بیٹھتی۔ بالآخر تھک ہار کر سب اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

میں واپس گھر کی چھت پر آ گیا اور رات گئے تک اس پگ ڈنڈی کو دیکھتا رہا۔ آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً مجھے آسمان پر کونجوں کی ڈار دکھائی دی۔ جب وہ پگ ڈنڈی عبور کرنے لگی تو ایک درخت سے وہی سفید کونج اڑی اور ڈار سے جا ملی۔

اُس رات کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ کونجیں ڈار کی شکل میں کیوں اُڑتی ہیں اور آسمان پر چاند کیوں چمکتا ہے۔

میں آج کل بلند و بالا عمارات سے مزین شہر میں رہتا ہوں۔ رات کو اتنی روشنی ہوتی ہے کہ اندھیرے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اکثر خیال آتا ہے کہ شہر دن کی روشنی کو دوام بخشنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ہر طرف ایک نہ ختم ہونے والی چہل پہل ہے۔ دمکتے چہرے ہیں۔ شہنائی ہے۔ گاؤں میں تو سہ پہر کے بعد چیزیں سمٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ گھنے برگد پر اُلو بولنے لگتے ہیں۔ مکئی کی سرسراتی ہوئی فصل ساکت ہو جاتی ہے۔ جھینگر ساز بجانے لگتا ہے۔ لوگ اذان سے پہلے گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ کچے راستوں پر چڑیلیں گشت کرنے لگتی ہیں اور درخت سو جاتے ہیں۔ کم از کم شہر اس ''نحوست'' سے پاک ہے۔ نہ یہاں جھینگر ہے نہ مکئی کی فصل۔ نہ آپ کو اُلو تنگ کر سکتا ہے نہ راستے میں کسی چڑیل سے سامنا ہو سکتا ہے۔

میری دادی کب کی جا چکیں۔ ان کی قبر پر جھاڑیاں اُگ چکی ہیں۔ والدہ کی ٹوٹی پھوٹی قبر بھی ان کے ساتھ ہے۔ والد بوڑھے ہو چکے، ٹانگیں کمزور ہو گئیں مگر لاٹھی سے آج بھی غیرت کھاتے ہیں۔ بھائی میری طرح شہروں کے ہو کر رہ گئے۔ کوئی دوبئی چلا گیا، کوئی امریکا کو مسکن بنا گیا۔ بہنوں کی شادی ہو گئی۔ ایک گھر سے کئی گھر بن گئے۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب میرا اپنی باجی سے جھگڑا ہوا۔ ہم چھپن چھپائی کھیل رہے اس

بات پر ہوا کہ میں نے بیس تک گنا ہی نہیں۔ دس، گیارہ، بارہ کر کے باجی کو ڈھونڈنے چلا۔ وہ ابھی چھپنے کی تیاری کر رہی تھی کہ میں نے ’’حملہ‘‘ کہہ کر فاتحانہ انداز میں شور مچا دیا۔

’’نہیں۔ نہیں۔ یہ فاول ہے۔ تم نے بیس تک گنا ہی نہیں‘‘۔۔۔ باجی احتجاج کرنے لگیں۔ ہم دونوں کا جھگڑا طول اختیار کرنے لگا تھا کہ امی نے بیچ بچاؤ کرایا۔

’’بیٹا۔ تم نے بیس تک کیوں نہیں گنا؟ ہمیشہ اصول رکھا کرو میرے بچے۔ بے اصول زندگی گزارو گے تو گئے دنوں پر پچھتاؤ گے۔۔۔‘‘ ان کا انداز ناصحانہ تھا۔

آخری عمر میں بیمار رہنے لگی تھیں۔

ایک رات میں امی کے ساتھ صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ایک خوشگوار رات تھی۔ سرد ہوا چلنے سے رُوح کے اندر شادیانے بج رہے تھے۔ امی ٹکٹکی باندھے ستاروں سے بھرے کالے آسمان کو دیکھتی رہیں۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں: ’’بیٹا! موت زندگی کی دشمن ہے۔‘‘

’’جی امی۔۔۔ تو‘‘ مجھے جیسے کچھ نہ سمجھ آیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر طویل سانس لے کر بولیں: ’’لیکن موت ہمارا ایک ایک سانس تحمل سے گنتی ہے، جلدی نہیں کرتی۔‘‘

’’جی امی۔‘‘ میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

صحن میں جیسے پراسرار خاموشی پھیل گئی۔ میں نے بے اختیار خالی چارپائی کی طرف دیکھا۔ یہ وہی چارپائی تھی جس پر رات کو دادی اماں بیٹھا کرتی اور پورے خاندان کے اجلاس کی صدارت کیا کرتی تھیں۔

واقعی موت نے امی کی زندگی کے پوری طرح گنے اور ایک دن وہ چپکے سے اس دنیا سے چلی گئیں۔ دادی اماں کے معاملے میں بھی موت نے اپنا اصول نہیں چھوڑا تھا۔

آج بیس سال بیت گئے۔ میری حالت پہلے سے زیادہ سُدھر چکی ہے۔ عالی شان بنگلے میں رہتا ہوں۔ مجھے اب صحن میں نہیں سونا پڑتا۔ میرا کمرا ایئر کنڈیشنڈ ہے، مچھروں میں اتنی جرات نہیں کہ وہ اندر آسکیں۔ میری میز پر اب ٹوٹی ہوئی صراحی کے بجائے منرل واٹر پڑا ہے۔ اور ہاں! اب میرا واسطہ مرغیوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور بلیوں کی سرگشت سے بھی نہیں۔ گداز بستر پر سکون کی نیند سوتا ہوں۔ پھر بھی کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں تحمل سے بیس تک نہیں گن رہا۔ میں ڈار سے بچھڑی ہوئی وہ کونج ہوں جسے ان بلند و بالا عمارات کی رنگ برنگی روشنیوں میں کالا آسمان دکھائی نہیں دیتا۔

☆☆☆☆

فرخندہ شمیم

زہر اور تریاق

منظر I

(بوائز کالج کے لان میں دو دوست گھاس پر بیٹھے ہیں۔ ساتھ ہی چند کتابیں گھاس پر ان کے پاس پڑی ہیں۔ ایک لڑکا امجد اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا اور ایک سگریٹ سلگاتا ہے۔ دوسرا لڑکا منصور اسے تشویشناک نظروں سے دیکھ رہا ہے۔)

منصور: امجد! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے سگریٹ پینے کی تعداد پہلے سے زیادہ کر دی ہے۔

امجد: ہاں کر تو دی ہے لیکن مجھے اس میں سکون بہت ملتا ہے۔ ہر ڈپریشن سے آزاد ہو جاتا ہوں میں۔ (وہ سگریٹ کا کش لیتا ہے)

منصور: (حیرت سے) ڈپریشن؟ تمھیں کس بات کا ڈپریشن ہے امجد؟ تم ایک امیر باپ کے اکلوتے بیٹے۔ دنیا کی ہر نعمت تمھارے قدموں میں ہے۔ کوئی دخل دینے والا نہیں ہے تمھاری زندگی میں۔ بالکل Independent لائف ہے تمھاری۔ اگر نہ بھی پڑھو لکھو تو نوکری تمھارا مسئلہ نہیں۔

امجد: (خلا میں گھورتے ہوئے) ڈپریشن صرف دولت نہ ہونے سے نہیں ہوتا منصور بھائی۔ جذباتی زندگی کی محرومیاں انسان کو زیادہ ڈپریس کرتی ہیں کیوں کہ اس ڈپریشن کی تلافی دنیا کی کوئی دولت نہیں کر سکتی ہے۔

منصور: (سنجیدگی سے) تم نے بتایا نہیں وہ کیا ڈپریشن ہے؟

امجد: میرے والدین ہائی کلاس سوسائٹی سے Belong کرتے ہیں۔ دوست، ایوننگ پارٹیز، ڈرنکس، کلبس اور ہائی فیشن اس کلاس کا Status Symbol ہوتا ہے۔ میرے والدین ہر وقت سوسائٹی میں اور اوپر اور اوپر جانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں اور اسی بھاگ دوڑ میں مجھے اور میری چھوٹی بہن کو بھول گئے ہیں۔ میری بہن یونیورسٹی سے فارغ ہو چکی ہے اور اب پورا دن گھر میں اکیلی پھرتی رہتی ہے۔ اس سے بات کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ممی نے اسے کبھی ٹائم نہیں دیا۔ وہ پورا دن میرا انتظار کرتی ہے۔۔۔۔ اور میں ہوں کہ اسے وقت ہی نہیں دے پاتا۔

منصور: کیوں یونیورسٹی کے بعد تم کہاں جاتے ہو؟

امجد: کسی ہوٹل میں کھانا کھاتا ہوں اور پھر شام کو کلب۔

منصور: کلب؟

امجد: ہاں یار۔ کہیں دل ہی نہیں لگتا ہے۔

(اتنے میں موبائل فون بجتا ہے اور امجد فون سنتا ہے۔ جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے ایک پیکٹ امجد کی جیب سے باہر گرتا ہے۔ منصور پیکٹ اٹھا کر اسے دیکھنے لگتا ہے۔ امجد دوسری طرف منہ کر کے فون سن رہا ہے۔ منصور پریشانی سے پیکٹ کو دیکھ رہا ہے۔ امجد فون سے فارغ ہو کر دوبارہ منصور کی طرف مڑتا ہے۔

امجد: (پریشانی سے) ارے یہ تمھارے ہاتھ میں کیا ہے۔ یہ تمھیں کہاں سے ملی؟

منصور: یہ جناب کی پاکٹ سے گری ہے۔ کیا تم سگریٹ کے ساتھ ساتھ ڈرگس بھی لیتے ہو؟

امجد: (جھنجھلاتے ہوئے) ہاں یار لیتا ہوں۔ اب تم بھی کہیں نصیحتیں نہ شروع کر دینا۔

منصور: (شانے تھامتے ہوئے) لیکن یہ کانٹوں سے بھرا ہوا رستہ ہے امجد۔ یقین کرو اس کا آخری انجام بہت عبرتناک ہے اور میں تم جیسا پیارا دوست کھونا نہیں چاہتا۔

امجد: (بے رحمی سے) یہ بات تو پاپا ممی کو سوچنی چاہیے تھی۔ تم کچھ بھی ہو آخر میرے ماں باپ کا رول تو Play نہیں کر سکتے۔

منصور: (خوشدلی سے) اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ اپنے دماغ پر زیادہ پریشر نہ لو۔ چلو کینٹیریا چلتے ہیں۔

(اور دونوں منظر نامے سے آؤٹ ہو جاتے ہیں)

منظر II

(پرنسپل صاحب کا آفس ہے۔ کمرے میں پرنسپل صاحب اور امجد موجود ہیں۔ تیسرا کوئی شخص نہیں ہے۔ پرنسپل صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں جبکہ امجد سامنے کھڑا ہے۔)

پرنسپل: امجد، مجھے خبر ملی ہے کہ ہمارے کالج میں منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے اور مختلف Years کے لڑکے نہ صرف ڈرگس لیتے ہیں بلکہ انہیں بیچتے بھی ہیں۔

امجد: معلوم نہیں سر۔

پرنسپل: (سختی سے) کیا آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا نام بھی اس لسٹ میں شامل ہے؟

امجد: (گھبرا کر) میرا سر۔۔۔؟ لیکن میں تو۔۔۔!

پرنسپل: (مضبوط لہجے میں) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ امیر خاندان کا فرد ہونے کے ناطے آپ کے ساتھ ریلیکس کیا جائے گا تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ سب کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھ جتنے بھی نام اس لسٹ میں ہیں انہیں وارننگ دی گئی ہے خواہ وہ بنگلوں میں رہنے والے سٹوڈنٹس ہوں یا محلوں میں رہنے والے۔

امجد: (آہستگی سے) سر میری خواہش ہے کہ آپ مجھے ان لڑکوں کے نام بتا دیں جو اس لسٹ میں شامل ہیں!!

پرنسپل: (سختی سے) نہیں مسٹر امجد۔ جس طرح ہم نے ان کے سامنے آپ کا سیکرٹ آؤٹ نہیں کیا ہے اسی طرح آپ کو بھی ان کے نام نہیں بتائے جائیں گے۔ یہ Self Respect کا ایشو ہے۔

امجد: (غرور سے) دراصل سر۔ میری نالج کے مطابق تو اس کالج کا کوئی لڑکا اتنی ہائی کلاس ڈرگس نہیں لے سکتا۔ ان کی تو پورے سال کی پاکٹ منی بھی میرے جیسی ایک وقت کی مہنگی ڈرگس افورڈ نہیں کر سکتی۔

پرنسپل: (غصے سے) آپ انتہائی گستاخ ہیں امجد۔ کالج ڈسپلن توڑنے کے ساتھ ساتھ آپ Non Ethical بھی ہیں۔ نشہ ہر حال میں زہر ہے چاہے وہ سستے داموں ملے یا مہنگے داموں۔ مہنگی ڈرگس بھی موت ہیں اور سستی ڈرگس بھی زندگی کا خاتمہ۔ میں آپ کو وارننگ دیتا ہوں۔ اگر آپ نے ڈرگس نہ چھوڑیں تو یاد رکھیں:

"You will have to leave college. Now you may go."

(امجد پاؤں پٹختا ہوا پرنسپل کے آفس سے باہر چلا جاتا ہے۔ پرنسپل پیچھے سے اسے گھور رہے ہیں)

منظر III

(امجد اپنے گھر کے اندر کمرے میں غصے کی حالت میں ٹہل رہا ہے۔ کبھی مٹھیاں بھینچتا ہے اور کبھی اپنے سر کے بال بار بار ہلاتا ہے وہ بے چینی کے عالم میں کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی ٹہلنے لگتا ہے۔ ساتھ ہی وہ زیر لب بڑبڑاتا ہے اور اس کی بات واضح نہیں ہے)

امجد (مٹھیاں بھینچتے ہوئے) میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اگر منصور پرنسپل کو شکایت لگا کر خود کو ہیرو ثابت کرنا چاہتا ہے تو میں اسے زیرو کر دوں گا۔۔۔۔ اس کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ میرا نام پرنسپل کو پہنچائے۔۔۔۔ میں اسے اپنا نام دوبارہ لینے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اس دنیا میں زندہ ہی نہیں رہے گا۔

امجد طیش کی حالت میں دراز کھولتا اور پستول نکالتا ہے۔ وہ غصے کی کیفیت میں پستول کو الٹتا پلٹتا ہے اور اسے لے کر باہر نکل جاتا ہے۔

منظر IV

(امجد غصے کی حالت میں منصور کے گھر داخل ہوتا ہے۔ ایک عام سا کمرہ جیسے متوسط گھرانوں کے ہوتے ہیں۔ ابھی امجد دروازے تک ہی پہنچتا ہے کہ اسے اوٹ سے اپنے والد اور منصور کے باتیں کرنے کی آواز آتی ہے۔ امجد وہیں ٹھٹھک کر باتیں سنتا ہے)

منصور: آپ کا بہت بہت شکریہ انکل کہ آپ ایک معمولی سے گھر میں آ گئے۔ اصل میں، میں خود آپ کے آفس آ جاتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ امجد نہایت غصے اور نفرت کے عالم میں مجھے تلاش کرتا یہاں تک آئے گا اور اس طرح میں اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا۔

امجد کا والد: منزل تک؟ میں کچھ سمجھ نہیں سکا!

منصور: انکل اپنے عزیز دوست امجد کو اس کے والدین سے ملانا میری بھی تو منزل ہے۔

امجد کا والد: (سوگواری سے) تم ٹھیک کہتے ہو منصور۔ میں مدت ہوئی اپنے بیٹے سے دور ہو گیا ہوں۔ بزنس اور سوشل Engagements پل بھر کی فرصت نہیں لینے دیتے مجھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ امجد تعلیم پوری کر کے میری فیکٹری سنبھال لے گا۔

منصور: لیکن انکل کیا تعلیم کا مقصد صرف فیکٹری سنبھالنا ہوتا ہے۔ تعلیم تو Merits اور Demarits کا فرق سکھاتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور جاہل میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ شخص اپنی فہم کی مدد سے بہتر راستوں کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اور انکل ۔۔۔ ایک بات اور (منصور امجد کے والد کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے) آپ کا بیٹا تو صرف اس وقت فیکٹری سنبھال سکے گا جب وہ زندہ رہے گا۔

امجد کا والد: (غصے اور پریشانی سے) کیا مطلب؟ کون ہے دشمن میرے بیٹے کی زندگی کا؟

منصور: ڈرگس ۔۔۔ ڈرگس دشمن ہیں امجد کی زندگی کے! وہ دن بدن نشے کا عادی ہو رہا ہے۔ کالج میں اسے بلیک لسٹ کیا جا رہا ہے۔ کئی Educated لڑکوں نے اس کا نام بھی پرنسپل کو دے دیا ہے۔ کالج کی خفیہ دیواروں اور واش رومز میں اس کا نام اس کے والد یعنی آپ کے نام کے ساتھ لکھا دیکھا گیا ہے۔ کتنی سبکی ہوئی ہے انکل یہ ۔۔۔ آپ کی ۔۔۔ آپ کے بیٹے کی ۔۔۔ آپ کے خاندان کی۔

(امجد کا والد ہکا بکا کھڑا ہے۔ منصور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے ہے۔ یہ سب باتیں

سن کر اوٹ میں کھڑے امجد کے ہاتھ سے پستول گر پڑتا ہے۔ آواز سن کر منصور اور امجد کے والد بھاگ کر امجد کے پاس جاتے ہیں۔ وہ بے دم ہو کر دہلیز پر ہی گر گیا ہے)

امجد کا والد: (بے قراری سے امجد کا ہاتھ سہلاتے ہوئے) مجھے معاف کر دو بیٹا۔ میں نے تمھارے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ جس عمر میں نوجوان بیٹے کو راہ نمائی اور بوڑھے والدین کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے میں تم سے الگ ہو گیا۔ میں بھول گیا تھا کہ میری پہلی مصروفیت تو تم ہو۔ (روتے ہوئے) آؤ امجد۔ رشتوں کی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ میں تمھیں زہر پینے نہیں دوں گا۔ میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔ میں تمھارے زہر کا تریاق ہوں۔ تمھارے بدن میں جانے والے زہر کا توڑ۔۔۔ اور دیکھو (خوشی خوشی) منصور بیٹا ہم سب کے لیے بہار بن کر آیا ہے۔ ایک نئی زندگی کی نوید لے کر آیا ہے۔ اسے گلے لگا لو بیٹا۔ یہ بھی ہمارا تریاق ہے۔

(امجد منصور کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور باپ کے گلے لگ جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے) تالیاں۔

رفاقت حیات

گل محمد گل فوٹرا

(ناول کا ایک باب)

رات کے اس پہر سرما کی وحشی ہوا، گل فوٹرا ماڑی کی پہلی منزل پر واقع صحن کے فرش پر بکھرے ہوئے تنکوں، پروں اور کاغذ کے ایک پرزے کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ کاغذ کا یہ پرزہ دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا ہوا جو شور پیدا کر رہا تھا، اسے سننے والا صحن میں کوئی نہیں تھا کیوں کہ گل محمد گل فوٹرا اس وقت اپنی خواب گاہ میں اپنے اُس پرانے دھرانے نواڑی پلنگ پر تنہا گہری نیند سو رہا تھا، ڈھائی تین دہائیاں پہلے جس پر اس نے اپنی بیوی کے ساتھ پہلی شب عروس گزاری تھی۔ اس کے خراٹوں کی آواز، اس کی رضائی سے نکل کر، جسے اس نے سر سے پاؤں تک اوڑھا ہوا تھا، سارے میں پھیل رہی تھی۔ اُس کا خاندانی ملازم جُمن برابر والے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔

کشادہ کمرے کے بیچوں بیچ سوتے ہوئے گل محمد کے خوابیدہ بدن نے ایک جھرجھری لی، پھر اس کا وجود کروٹ لے کر اچانک سیدھا ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک یوں ہی جھرجھریاں لے کر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے ذہن میں بہت دور کسی موہوم پردے پر سرکتا ہوا کوئی خیال یا اس کا کوئی عکس اسے تنگ کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی سانسیں پھولنے لگیں۔ نیند میں اس کے پاؤں خود بخود آہستہ سے ہلنے لگے۔ سر سے پیر تک رضائی لپیٹ کر سوتے ہوئے جب اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں تو اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے سے قطرے نمودار ہونے لگے۔ اس کے جسم کے مساموں سے پھوٹتے پسینے کے سبب اس کی بند آنکھیں دھیرے سے کھلتی چلی گئیں۔ رضائی میں تاریکی اور گھٹن محسوس کرتے ہوئے اس نے فوراً رضائی کو اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔

اس نے کھلی آنکھوں سے بستر پر لیٹے لیٹے چند نرم سانسیں لیں تو کشادہ کمرے کی خنکی سے بھری فضا کی وجہ سے اپنا پسینہ اسے ٹھنڈا محسوس ہونے لگا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے آس پاس دیکھنے کی کوشش کی تو وہاں پھیلی تاریکی میں اسے کچھ دکھائی نا دے سکا۔ وہ کچھ دیر تک باہر صحن سے آتی کاغذ کے ٹکڑے کے سرکنے کی آواز سنتا رہا۔

شاید وہ نیند میں کوئی خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں کھلتے ہی اس کا خواب ذہن کے کنوئیں میں گر کر کہیں کھو چکا تھا۔ اس نے اپنے دماغ پر دباؤ ڈال کر اسے یاد کرنے کا جتن کیا لیکن

وہ فوراً یاد نہ آ سکا۔ وہ صرف ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ اس نے اپنے بستر پر خود کو تھوڑا سا اوپر گھسیٹ کر اپنی کہنی تکیے پر ٹکا دی اور نیم دراز سا ہو کر تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور ماچس نکالنے لگا۔ اب اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے اندھیرے سے مانوس ہونے لگی تھیں اور اسے کمرے کی اشیا بھی اپنی جگہوں پر دکھائی دینی شروع ہو گئی تھیں۔

اس کے ساتھ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ اس کی نیند کے ساتھ ساتھ اس کا خواب بھی اُچٹ کر رہ جائے۔ وہ سگریٹ کا پہلا کش لے کر دیا سلائی بجھا کر زمین پر پھینکتے ہوئے ایک دفعہ پھر خواب کو یاد کرنے میں لگ گیا۔ جس نے اس کی نیند غارت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ہلکا سا جھٹکا بھی دیا تھا۔ وہ کیسا خواب تھا؟ اور اس نے کیا دیکھا تھا؟ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود اس کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ سکا۔

شب کا یہ کون سا پہر تھا اور کون سا وقت ہو رہا تھا، یہ جاننے کی اسے کوئی خواہش نہیں رہی تھی۔ گزشتہ کچھ برسوں سے اس نے اپنی پرانی گھڑیاں ٹھیک کروانی چھوڑ دی تھیں اور اس کے ساتھ ہی کیلنڈر رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ کون سے وقت کے کون سے عرصے میں اپنی زندگی جیتا رہا اب اس بات کی اہمیت ہی کیا رہ گئی تھی؟ اہمیت تھی تو صرف اس بات کی کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ سانسیں لے رہا ہے اور اس خواب کا تعاقب کر رہا ہے جو اس کے ذہن کی گکار سے پھسل کر کہیں کھو گیا ہے اور کوشش کے باوجود اسے نہیں مل رہا۔ وہ تکیے پر کہنی ٹکائے نیم دراز حالت میں سگریٹ کے کش لیتے ہوئے بار بار اپنی آنکھیں مچچاتا، ٹھنڈی سانسیں لیتا رہا۔

معاً اسے برابر والے کمرے سے ایک آہٹ سنائی دی، جو دھیرے دھیرے قریب آتی چلی گئی۔

ساتھ والے کمرے کا ایک دروازہ خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دروازہ چرچرا کر کھلا اور گل محمد گل فوڑا کا خاندانی ملازم جمن سر جھکائے اپنے پاؤں گھسیٹتا خواب گاہ میں داخل ہوا۔ وہ اپنے وڈیرے کے قریب آ کر استفسار کرنے لگا۔ ”بھوتارا کیا ہوا؟ سب خیر تو ہے؟“

گل محمد نے سگریٹ فرش پر پھینکتے ہوئے جمن کی طرف دیکھا۔ ”ہاوہاو، سب خیر آ ہے۔ بس خود ہی آنکھ کھل گئی۔“

جمن بُڑبڑایا۔ ”میری نیند تو ایک خواب نے بھگا دی۔ اتنا ڈراونا خواب تھا کہ خوف سے میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔“

گل محمد یہ سن کر حیران ہوا، کیوں کہ وہ بھی ایسا ہی خواب دیکھتا رہا تھا۔ وہ جمن سے اس بابت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنا سر جھکائے ہوئے پلٹ کر صحن کی طرف کھلنے والے مرکزی دروازے کی جانب چل پڑا۔

پہلے باہر واقع غسل خانے سے، پھر کچھ دیر بعد باورچی خانے سے، پانی گرنے کی آوازیں وقفے وقفے سے گل محمد کو سنائی دیتی رہیں۔ وہ اٹھنے کے بجائے رضائی اوڑھ کر ایک بار پھر پوری طرح لیٹ گیا۔ معاً

اس کے ذہن میں ایک جھپاکا سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اسے کچھ یاد آیا۔ ایک مبہم سا منظر ایک ثانیے کے نجانے کون سے لمحے کے لیے روشن ہوا اور اس کے ذہن کے پردے پر ابھر کر غائب ہوگیا۔ اس دوران وہ اس کی ایک جھلک یاد کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

کیا یہ اس کا پورا خواب تھا یا اس کا کوئی حصہ؟، اسے سمجھ نہیں آسکا۔ وہ اوپر آسمان کی جانب کسی چیز کو آنکھیں پھاڑ کر تکتے ہوئے کسی دیوانے کی طرح دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سڑک کون سی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ قصبے کی مرکزی سڑک تھی، جو ایک سمت سے قصبے میں داخل ہوکر دوسری طرف سے باہر نکل جاتی تھی۔ وہ کون سا وقت تھا، اسے یہ اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسے بس اتنا یاد رہ سکا کہ آسمان گہرے بادلوں سے بھرا ہوا تھا اور سرمئی سرمئی ہو رہا تھا۔ تیز ہوا آسمان پر پھیلے بادلوں اور سڑک کنارے بکھرے ہوئے سنگ و خشت کو اڑائے پھرتی تھی۔ گل محمد کے اپنے کپڑے تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ گردوپیش کی چیزوں اور عمارتوں پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اسی لیے قرب و جوار کی مانوس چیزیں اور جگہیں، نامانوسیت کی تہہ میں چھپی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ اپنا سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھتا، ہانپتا کانپتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا ایک پُل سے گزرا۔ آگے بڑھنے پر اسے محسوس ہونے لگا کہ ہوا کے تیز جھونکے اس کی پشت کو آگے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی رفتار دوچند ہوگئی تھی۔ اسے قصبے کی آبادی سے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور وہ کھیتوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی سڑک پر دور تک دوڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔

وہ اپنے گرم بستر پر لیٹے لیٹے اپنی پنڈلیوں میں کھنچاؤ اور پیروں میں درد سا محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ خواب میں آندھی نما تیز ہوا کہیں اسے بھی آسمان کی طرف اڑا کر تو نہیں لے گئی۔ شب کے اس پہر آسمان پر اڑنے کا خیال اس کے لیے کسی طرح دل خوش کن نہیں ہوسکتا تھا۔۔ وہ رضائی اوپر کھینچ کر غسل خانے جا کر منہ ہاتھ دھونے کے تقاضے کو ٹال کر سوچتا رہا۔ وہ کیوں ایک وحشت کے عالم میں اتنی تیزی سے دوڑتا چلا جا رہا تھا؟ اس کا سر اور اس کی نگاہیں اوپر کیوں اٹھی ہوئی تھیں؟ آسمان پر ایسی کون سی چیز اُڑ رہی تھی، وہ جسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا جا رہا تھا؟ وہ چند لمحوں تک اپنے ذہن پر دباؤ ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی یادداشت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بس اسے یہ احساس ہوتا رہا کہ آسمان پر ضرور کوئی ایسی اہم چیز موجود تھی، جو اڑتی جا رہی تھی اور وہ اس کا تعاقب کرتا ہوا قصبے کی آبادی سے باہر نکل گیا تھا؟

وہ اپنے خواب کی گتھی سلجھانے میں مصروف تھا کہ اسے صحن کی جانب سے ایک بار پھر جمن کے قدموں کی آہٹ سنائی دی، جسے سنتے ہی وہ سمجھ گیا کہ اب اس کے لیے اپنا بستر چھوڑنا لازم ہو چکا ہے، کیوں کہ جمن اس کے لیے چائے بنا کر لا رہا تھا۔ شدید سردی میں چائے پینے کا خوش گوار خیال آتے ہی وہ فوراً اپنی

رضائی ہٹاتا بستر سے اٹھا اور پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی چپل پہن کر صحن کی طرف چلا گیا۔

جب وہ خواب گاہ میں واپس آیا تو جمن اس کے پلنگ کے پائینتی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ پلنگ کا سرہانا ہٹا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ جمن نے جلدی سے ایک گھونٹ لے کر چائے ختم کی اور اپنے بھوتار کے لیے جھک کر چھوٹی میز پر رکھی کیتلی سے پیالی میں چائے انڈیلنے لگا۔ پھر اس نے بھری ہوئی گرم پیالی اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے پیش کی۔

گُل محمد نے پیالی تھامتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔ "ساجُھر ہونے میں کتنی دیر باقی ہے؟"

جمن نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "سائیں، میرے خیال میں پہلی اذان ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی ہے۔ اس کے بعد نماز ہوگی اور نماز کے بعد ساجُھر ہو جائے گی"۔

گل محمد نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "مطلب، میں کچھ اور آرام کر سکتا ہوں"۔

"جو سائیں کی مرضی۔ ویسے آپ کے لیے آج کا دن بہت مصروف ہوگا۔ آج میلے کا پہلا دن ہے"۔

"ہاؤ ہاؤ۔ اسی لیے تھوڑی سی نیند اور کرنا چاہتا ہوں۔ تم باقی چائے لے جاؤ۔ میں دوبارہ اٹھ کر پی لوں گا۔"

"جو حکم بھوتار کا"۔ جمن اپنی پیالی اور میز پر رکھی کیتلی اٹھا کر کمرے سے باہر جانے لگا تو گل محمد نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ وہ برتن ہاتھ میں اٹھائے جوتی گھسیٹتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ "حکم سائیں وڈا"۔ گل محمد سوچ رہا تھا کہ اس سے خواب کے متعلق بات کیسے شروع کی جائے۔ آخر کار سوچتے سوچتے اس نے پوچھ ہی لیا۔ "جمن! تم اٹھنے کے بعد کہہ رہے تھے کہ ایک ڈراؤنے خواب نے تمھاری نیند بھگا دی۔ دیکھو! میرے ساتھ بھی آج رات یہی کچھ ہوا۔"

"کیا ہوا سائیں؟"۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

گل محمد اس کی معصومانہ حیرانی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ "میں نے بھی تمھاری طرح ایک ڈراؤنا خواب دیکھا، جس نے میری بھی نیند بھگا دی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے خواب کے بارے میں کچھ بتاؤ، پھر میں بھی تمھیں سناؤں گا۔"

اس مرتبہ مسکرانے کی باری جمن کی تھی۔ وہ کھسیانی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہوئے گویا ہوا۔ "سائیں، آپ جانتے ہیں، میں خوابوں کے بارے میں بات کرنے کو بدشگونی سمجھتا ہوں۔ آپ مجھے معاف ہی رکھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ پر یا مجھ پر کوئی بلا نازل ہو"۔ جمن کا خیال تھا کہ اب اس کا وڈیرا اس بابت اُس سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ وہ یہ سوچ کر ایک بار پھر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

”تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ خوابوں کے بارے میں بات کرنے سے بلائیں نازل ہوتی ہیں؟“۔

اسے وڈیرے کی بات سن کر پھر رکنا پڑ گیا۔ ”بھوتار! یہ بات مجھے میری جیجل اَمڑ نے بچپن میں بتائی تھی، تب سے آج تک میں نے اسے یاد رکھا ہوا ہے۔ بس، اب ضد کر کے مجھ غریب کو گناہ گار نہ کروسائیں“۔

”تمھاری جیجل اَمڑ پرانے زمانے کی عورت تھی۔ اس لیے وہ اس بات پر یقین کرتی ہوگی۔ میرے خیال میں خوابوں کے بارے بات کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شاباش مجھے جلدی سے اپنا خواب سناؤ“۔

”کیسے کچھ نہیں ہوتا، بھوتار۔ میری اَمڑ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماسی نے ایک بہت خوف ناک خواب دیکھا تھا۔ ماسی کو پتا تھا کہ خواب سنانا نقصان دہ ہوتا ہے لیکن وہ اس خواب کا بوجھ اکیلی نہیں اٹھا سکتی تھی تو ناچار اس نے اپنا دل کڑا کر کے میرے ماسڑ کو وہ خواب سنا دیا۔ یہ اس کی فاش غلطی تھی۔ اس واقعے کے اگلے ہی دن وہ بیمار پڑ گئی، ایسی کہ پھر موت کے بعد ہی وہ اپنے بستر سے اٹھی۔ یہ کوئی بھوگ یا مذاق تھوڑا ہی ہے سائیں۔ خواب عام باتوں جیسے بالکل نہیں ہوتے کہ ہم انھیں آپس میں کرلیں یا ایک دوسرے کو سنا دیں۔“

اس کی باتیں سن کر گل محمد کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ وہ بے زاری سے بڑبڑایا۔ ”اچھا اچھا۔ اب تُو ٹُر“۔

جمن زیرِ لب مسکراتا، دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے انکار کر کے گل محمد کو چڑا دیا تھا، اسی لیے اس نے ”ٹُر“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ چار پانچ دہائیاں اپنے وڈیرے کے ساتھ گزارنے کی وجہ سے وہ اس کا مزاج بلکہ نبض آشنا بن چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گل محمد کچھ ہی دیر میں اس کی گستاخی فراموش کر دے گا۔ اس کے بعد وہ جب اس سے دوبارہ ملے گا تو اس کے چہرے پر اس چڑچڑاہٹ کا شائبہ تک نہ ہوگا۔ چائے کے برتن باورچی خانے میں رکھنے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں جانے کے لیے خواب گاہ کے دروازے کے بجائے بیرونی دروازہ استعمال کیا اور اپنی چارپائی پر بچھے ہوئے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ پرامید تھا کہ جو خواب اس کی اپنی نیند اڑانے کا سبب بنا تھا، اب وہ اسے دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔

جمن کے جانے کے بعد گل محمد نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لینے لگا۔ اس کا ذہن اسی دبدھا میں تھا کہ وہ خواب میں آسمان پر کیا دیکھتا ہوا سڑک پر کسی پاگل کی طرح دوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ یہی سوچتے سوچتے اس نے سگریٹ کے دو چار کش اور کھینچنے کے بعد اسے فرش پر پھینک کر، رضائی اوڑھ کر بستر پر دوبارہ لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں زور سے میچ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہونے لگا کہ اس کے لیے اب دوبارہ نیند کرنا محال ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ بستر میں ہی دُبکا رہا۔ تھوڑا سا وقت اور گزرنے کے بعد حسبِ معمول فجر کی سب سے پہلی اذان

قبرستان والی مسجد سے بلند ہوئی۔ اس کے بعد تو جیسے اذانوں کا تانتا ہی بندھ گیا۔ وقفے وقفے سے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، شیعہ، سمیت تمام اہم مسالک کی مساجد سے یکے بعد دیگرے مختلف اذانیں بلند ہوتی رہیں۔ ان کے تھمنے کے بعد صحن سے چڑیوں، لالویوں اور دیگر پرندوں کی خوش گوار چہکار، رضائی کے نیچے لیٹے ہونے کے باوجود اس کی سماعت پر دستک دیتی رہی۔ مگر وہ دم سادھے پڑا رہا۔

جب اس کا ذہن یہ سوچ سوچ کر تھک گیا کہ آسمان پر ایسی کون سی چیز اڑ رہی تھی، وہ جسے دیکھتا ہوا دیوانہ وار دوڑتا چلا جا رہا تھا، تو اس کی آنکھیں خود بخود مندتی چلی گئیں۔ اسی نیم غنودہ سی کیفیت میں اس نے اپنے ذہن کے پردے پر دیکھا کہ قصبے کے آسمان پر کوئی چیز اڑتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول کر اپنے چہرے سے رضائی ہٹا دی اور اوپر دیکھنے لگا، مگر اس کی نگاہیں خواب گاہ کی چھت سے ٹکرا کر رہ گئیں۔ اسے اپنی اس حماقت پر پشیمانی ہوئی۔ اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ اس وقت اپنی ابائی ماڑی کے بجائے قصبے سے باہر نکلنے والی سڑک پر موجود ہے اور اس کے سامنے خواب گاہ کی چھت کے بجائے کھلا ہوا آسمان ہے۔ اسے اپنی اس ذہنی کیفیت پر الجھن سی ہونے لگی۔ وہ اپنے نواڑی پلنگ سے فرش پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

اس نے جیسے ہی سگریٹ سلگا کر اپنے ذہن کو اس واہیات خواب کے اثر سے نکالنے کی شعوری کوشش کرنی چاہی، اس کے ذہن کے پردے پر گدلے اور مٹیالے سے آسمان کا منظر ابھرا، جس پر کوئی بڑی سی چیز ہوا میں اڑتی اور تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اس چیز پر غور کیا تو وہ خود ہی حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ ایک نواڑی پلنگ جیسی بڑی سی چارپائی تھی، جو آسمان پر اڑن کھٹولے کی طرح اڑتی جا رہی تھی اور وہ اسی کی جانب دیکھتا ہوا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ مگر یہ کیا؟ اس بڑی سی چارپائی پر کوئی سایہ سا بھی لہراتا ہوا اسے نظر آ رہا تھا۔ یہ کس کا سایہ تھا؟ اور وہ سایہ چارپائی پر کیا کر رہا تھا؟

یہ سوچتے ہی اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ ایک الجھن کے سلجھتے ہی اسے ایک نئی مشکل نے آ گھیرا تھا۔ یہ نئی مشکل دو جہتوں پر مشتمل تھی۔ پہلی جہت کا تعلق اس سائے سے تھا، جو اسے چارپائی پر لہراتا ہوا دکھائی دیا تھا اور دوسری جہت اس عجیب و غریب خواب کی تعبیر سے متعلق تھی۔ وہ خواب اور اس کی تعبیر کے دو پاٹوں کے بیچ دشواری سے سانس لیتا ہوا چپل پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازے کی دُرزوں سے چھن کر آتی روشنی کی وجہ سے اب خواب گاہ کی تاریکی قدرے کم ہو گئی تھی۔ اس نے کمرے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی تو اسے ایک کرسی پر پڑی ہوئی گرم چادر دکھائی دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس چادر کو اٹھا کر اپنے بدن کے گرد لپیٹ لیا اور دھیرے سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

صحن میں صبح کی سفید روشنی پھیل گئی تھی۔ سورج طلوع ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ صحن کے فرش

اور دیواروں پر پرندے پھدکتے پھرتے تھے۔ دسمبر کی یخ مگر دھیمی ہوا سارے میں سرسراتی پھر رہی تھی۔ وہ چادر اوڑھے ہوئے صحن میں چہل قدمی کرنے لگا۔

گُل محمد کو گھنٹہ بھر پہلے جمن سے کی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ ان سے چند ثانیے محظوظ ہوتا رہا، پھر حیرانی سے سوچنے لگا کہ جمن جیسے بہت سے سادہ لوح آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ نیند کے بعد ہماری روح ہمارے جسموں سے نکل کر جن مقامات پر جاتی ہے اور جن لوگوں سے ملتی ہے وہ ہمیں خوابوں کی صورت دکھائی دیتے ہیں۔ گُل محمد خود بھی زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا کیوں کہ اس نے رعایتی نمبروں سے بارہویں جماعت پاس کرنے کے بعد تعلیم کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس کے والدین نے بھی اس کے تعلیم چھوڑنے پر برا منایا تھا اور نہ ہی اسے جاری رکھنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالا تھا۔ البتہ اپنے آپ سے کچھ زیادہ پڑھے لکھوں، جیسے اسکول ماسٹر، ڈاکٹر، پوسٹ ماسٹر، آب پاشی کے محکمے سے تعلق رکھنے والے انجینیروں، مختیارکاروں وغیرہ سے اپنی صحبتوں کے دوران، ان سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے اسے اتنی سمجھ آ گئی تھی کہ نیند کے دوران دکھائی دینے والے سب خواب انسان کا اپنا ہی دماغ دیکھتا ہے۔ اس کی روح کہیں گھومنے پھرنے نہیں جاتی بلکہ اس کے ساتھ ہی رہتی ہے اور ان خوابوں کا ہمارے پرکھوں اور بزرگوں سے بھی کوئی خاص رشتہ نہیں ہوتا بلکہ ان کا خصوصی تعلق خواب دیکھنے والے کی اپنی زندگی کے ماضی، حال اور کسی حد مستقبل سے ہوتا ہے۔

یہ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ اسے دکھائی دیے خواب کا اس کی اپنی زندگی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے ذہن میں آتے ہی اچانک اس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ رک گیا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا جا کر برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا اور اپنے خواب کے اس پہلو پر غور کرنے لگا۔ اس نے نجانے کیوں خواب میں اپنے دوڑنے کے عمل کو کسی تلاش، کسی جستجو یا کسی اہم ترین چیز کی سرگردانی سے تعبیر کیا۔ مگر کس کی تلاش؟ کس چیز کی جستجو؟ کون سی اہم شے کی سرگردانی؟ اس نے ان سب کو جب اڑتی ہوئی چارپائی اور اس پر لہراتے سائے سے جوڑا تو اسے اپنے خواب کی تعبیر کا رشتہ، اپنے ماضی سے زیادہ اپنے حال یا مستقبل سے جڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اس کی دانست میں اڑتی ہوئی چارپائی ناگہاں موت کی علامت تھی اور اس پر لہراتا ہوا سایہ، اس سے گہری قربت رکھنے والے کسی شخص یا اس کی اپنی ذات کا اشارہ۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا معاملہ تھا تو اسے فوری طور پر اپنے بارے میں کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ اس نے سوچا۔ ”مجھے اپنی موت کا سامنا کرتے ہوئے کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ میں اسے کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہوں گا“۔ لیکن جہاں تک اس سے خصوصی مراسم رکھنے والے دیگر اشخاص کا معاملہ تھا، وہ فوری طور پر ان سب کے لیے فکر مند ہو گیا۔ اسے سب

سے پہلا خیال اپنے یار دیرینہ وڈیرے کھمبو خان کا آیا، جس سے آج صبح ناشتے پر اس کی ملاقات طے تھی اور اس کے بعد حسب معمول سارا دن انھوں نے ساتھ مل کر گزارنا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اسے کچھ ہوا ہو گا، تو سورج چڑھنے کے کچھ دیر بعد ہی کھمبو خان کے گاؤں سے بری خبر اس تک پہنچ جائے گی۔ اس کے علاوہ اسے جمن لوگوں کی فکر لاحق ہونے لگی تھی، ان میں اس کی بیوی اور دو بیٹے شامل تھے، بعض وجوہات کی بنا پر پچھلے کچھ عرصے سے وہ ان کے ساتھ بنگلے میں رہنے سے گریز کرتا آ رہا تھا۔ اس نے طے کیا کہ جمن نیند سے اٹھ جائے تو وہ اسے بنگلے بھیج کر ان کی خیر خبر معلوم کرے گا۔ ان کے بعد اسے یاد آیا کہ آج سہ پہر پیارو مسان میں لگنے والے میلے میں جو ریچھ بھگھڑ ہونے والی تھی، اس میں اس کے دو کتے بھی شریک ہونے والے تھے۔ کہیں اجل اُن دونوں پر یا ان میں سے کسی ایک پر آج سایہ فگن تو نہیں ہونے والی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری سی آ گئی کیوں کہ وہ اپنے سبھی جانوروں سے بہت پیار کرتا تھا۔ اس میں اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں ہلاک ہوتے ہوئے دیکھنے کی تاب بالکل نہیں تھی۔ تین برس پہلے ایک میلے میں اپنی نگاہوں کے سامنے جان لیوا زخموں سے لہولہان ہو کر، تڑپ تڑپ کر جان دینے والے اپنے اصیل نر مرغ ''مورڑو'' کی ہلاکت کو وہ ابھی تک فراموش نہیں کر سکا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں آج ریچھ جیسے عفریت کے مدِ مقابل ہونے والے کتوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔

سردیوں کی صبح کا سورج صحن کی دیواروں کے بالائی سروں پر اپنی زردی مائل دھوپ کی کرنیں پھینک کر اپنے طلوع کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سورج کی دھوپ جلدی سے پوری کی پوری صحن میں اتر آئے، تا کہ وہ اپنے رگ و پے میں دوڑنے والی سردی سے نجات حاصل کر سکے، مگر اسے معلوم تھا کہ دھوپ آدھا دن گزرنے سے پہلے اس کے صحن میں نہیں اترے گی۔

اسی دوران اسے اپنی پشت سے کمرے کا دروازہ چرچرا کر کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھانسی کی آواز سنتے ہی سمجھ گیا کہ کون ہے؟

جمن اپنی آنکھیں مچیا کر قدرے حیرت سے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے اپنے وڈیرے کی طرف دیکھتا اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور اپنا سر جھکا کر اسے صبح کا سلام کرنے لگا۔ ''وڈیرا سائیں، کیا آپ کو دوبارہ نیند نہیں آئی؟ مجھے جگا لیا ہوتا۔ ہاں، میں خوابوں پر تو نہیں، ہاں البتہ آپ کے بابا، چاچا، اور دادا کی مزےدار باتیں تو سنا ہی سکتا تھا۔''

گل محمد یہ سن کر کھلکھلاہٹ سے ہنسنے لگا۔ ''ہاں، ان کی وہ بے مزہ باتیں، تمھیں جنھیں بار بار سنانے کا بے کار چسکا پڑا ہوا ہے''۔

جمن اس کی بات میں طنز کو محسوس کرتے ہوئے خوش دلی سے اپنی بات کہنے لگا۔ ”چھوڑیں سائیں چھوڑیں۔ آپ خود بھی مجھ سے انہیں بار بار سننے کی فرمائش کرتے رہتے ہو، وہ بے مزہ کیسے ہو سکتی ہیں“۔

”اچھا اچھا! اپنے بڑوں کے بچھن۔ میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ وہ میں تم سے ہی کیوں سنوں، ہر بار! سمجھا جمن!“۔

وہ ملازم تھا۔ جھکنا اور دبنا مجبوری کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت بھی تھی۔ عاجزی سے کہنے لگا۔ ”سمجھ گیا سائیں ابیو کو حکم؟“

”سب سے پہلے چائے پلاؤ اور اس کے بعد نہانے کے لیے پانی گرم کر کے غسل خانے پہنچاؤ۔ اس کے بعد میرے لیے کپڑوں کا نیا جوڑا نکال کر شلوار میں اگٹ ڈالو اور پھر اس کے بعد بنگلے جا کر پہلے سب لوگوں کی فرداً فرداً خیریت معلوم کرو اور پھر ناشتہ تیار کروا کے لے آؤ۔ اگر کھمبو خان کے گوٹھ کا کوئی مل جائے تو اس سے وہاں کی خیر خبر پوچھ لینا۔ سمجھا!“۔ وہ ایک سانس میں یہ ساری باتیں کہہ گیا۔

جمن یہ سب سنتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے پہلے تو یہ لگا کہ اس کا مالک خواب کی تعبیر نہ سننے سنانے کی وجہ سے ابھی تک اس سے بگڑا ہوا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے اپنے خواب سے ہونے والی دہشت یاد آئی تو اس کا دل اپنے وڈیرے کی جانب سے پسیجنے لگا۔ وہ اپنا سر جھکا کر اپنی قدیم عاجزی سے اتنا ہی کہہ سکا۔ ”جو حکم بھوتار۔“

جمن بساط بھر تن دہی سے چلتا ہوا صحن کے کونے میں واقع باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔

گل محمد کا دل اایک طرف اپنے خواب کی خود ساختہ تعبیر کے اندیشے کے نیچے کچلا جا رہا تھا تو دوسری طرف وہ جمن سے اپنی اس فکر مندی کو چھپانا بھی چاہتا تھا۔ شاید اسے اپنے اس تضاد کا کوئی احساس نہیں تھا کہ وہ اپنے اسی خاندانی ملازم کے ذریعے اپنے تمام متعلقین کی خیریتِ نیک مطلوب کی خبر بھی سننا چاہتا تھا۔

جمن نے ایک چھوٹی کیتلی میں چائے اور تام چینی کی ایک پیالی چارپائی پر اس کے قریب رکھتے ہوئے اسے چائے پینے کے لیے کہا اور خود پانی گرم کرنے کا برتن چولہے پر چڑھانے کے لیے دوبارہ باورچی خانے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب گل محمد غسل کر کے باہر آیا تو اسے چارپائی پر قمیض کے برابر میں رکھی شلوار میں اگٹ ڈلا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ جمن اپنے کام نمٹانے کے بعد ماڑی سے باہر جا چکا ہے۔ وہ اپنی کمر تک تولیا باندھے ہوئے ٹھٹھرتا کانپتا ہوا بھاگ کر برآمدے تک آیا اور چارپائی پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر تیزی سے چلتا ہوا خواب گاہ میں چلا گیا۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے آئینہ، کنگھی اور کولڈ کریم کی شیشی ہاتھوں میں لیے ہوئے دوبارہ برآمدے میں

آ کر اسی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ کریم کی شیشی رکھ کر اس نے آئینے میں اپنے از کار رفتہ ہوتے چہرے کو دیکھا تو اس کے دل کو ذرا سی ٹھیس لگی۔ چہرے کی جلد کھردری ہونے کے ساتھ ساتھ کمھلائی ہوئی بھی لگ رہی تھی۔ اس کی گندمی رنگت سنولائی ہوئی لگ رہی تھی۔ گزرا ہوا وقت اپنے بے شمار سرد وگرم کے بہت سے نشانات وہاں چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے دنیا میں آئے ہوئے چھ دہائیاں بس پوری ہونے والی تھیں۔ اس تمام عرصے میں اس کی بے شمار صبحیں شاید اسی طرح نہا دھو کر آئینہ دیکھتے اور بال سنوارتے گزری تھیں۔ اس کی اپنی نظروں کے سامنے اس کا اپنا چہرہ کتنی ہی تبدیلیوں سے گزر کر زوالِ عمر کی جانب تیزی سے رواں تھا۔ اس زوال کو روکنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے وہ چند ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے اپنے خضاب لگے بے جان بالوں میں کنگھی کرتا رہا۔

چہرے پر کریم لگاتے ہوئے اس نے تین چار روز کی بڑھی ہوئی شیو کو ناگواری سے محسوس کیا۔ کچھ دیر پہلے کی اداس کیفیت سے نکلنے کے لیے اس نے خود کو یہ دلاسا دیا کہ شیو کروانے کے بعد وہ پہلے سے بہتر دکھائی دے گا۔

وہ کچھ دیر بعد اسی خیال کے ساتھ ماڑی کے زینے سے نیچے اتر کر بازار میں چلا گیا تاکہ منگی حجام کی دوکان سے شیو کروا کے اپنے چہرے کو ایک دو دن کے لیے ہی سہی، کم از کم قابلِ قبول تو بنا لے۔

منگی حجام سے شیو بنواتے اور بال کٹواتے ہوئے اسے تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ حجامت سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی ماڑی کی طرف آتے ہوئے شیخوں والی گلی سے گزر رہا تھا کہ اسے قطع کرنے والی ایک اور گلی، جوڑ وہی گلی کہلاتی تھی، کے سنگم پر اس کی مڈبھیڑ جمن کا ساتھ ہو گئی۔ وہ ایک بڑا سا ٹفن بکس اٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ گل محمد اسے دیکھتے ہی ٹھہر گیا۔

جمن کو اپنے مالک کی موجودہ ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا، اسی لیے وہ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی اسے بنگلے کے مکینوں کی خیریت سے آگاہ کرنے لگا۔ اس نے گل محمد تک چھوٹے سائیں اور بنگلے کی وڈیرنی کا خصوصی پیغام پہنچایا۔ جسے اس نے حسبِ معمول ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔ وہ اپنے گھر والوں کی جانب سے آنے والے ان پیغامات کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے ان میں چاہت اور اپنائیت سے زیادہ اپنے گھر والوں کی خود غرضی پنہاں محسوس ہوتی تھی۔ اسے اپنی بیوی اور بیٹوں سے بعض وجوہات کی بنا پر بدظن ہوئے، چند برس بیت چکے تھے۔

گھر والوں کی خیریت معلوم کرنے کے بعد اسے اپنے یار کھمو خان کی فکر لاحق ہوئی۔ اس کے پوچھنے پر جمن نے گلی میں چلتے ہوئے اسے بتایا کہ بنگلے آتے اور جاتے ہوئے راستے میں اسے وڈیرے کھمو کے گاؤں کا کوئی شخص نہیں ملا۔ اس کے بعد گل فوٹرا ماڑی پہنچنے تک انھوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔

ماڑی کی اوپری منزل کا زینہ چڑھتے ہوئے گل محمد گل فوٹرا نے جمن سے کہا کہ وہ کھانے کا ٹفن

باورچی خانے میں رکھنے کے بعد طویلے میں جا کر سب جانوروں کی خیریت معلوم کر کے اسے ان کی صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ اوپر پہنچ کر گل محمد برآمدے میں بچھی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ جمن نے نیچے اترنے سے پہلے اس کے پاس آ کر پوچھا کہ وہ ابھی ناشتہ کرنا چاہے گا یا صرف چائے پیے گا۔ اس نے کہا کہ وہ ناشتہ اپنے یار کی آمد پر اس کے ساتھ ہی کرے گا۔

وہ ماڑی کے برآمدے کی دیوار سے اپنا تکیہ ٹکائے چارپائی پر نیم دراز سوچنے لگا کہ اس کے گھر کے سب افراد بخیریت ہیں۔ ان سب سے ناخوش ہونے کے باوجود اسے ان کے بارے میں جان کر کچھ اطمینان سا ہوا تھا۔ وہ اپنے اس اطمینان کا اظہار جمن کے سامنے کھل کر نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ اسے اس بات کا اندیشہ رہتا تھا کہ وہ لازماً انہیں بھی اس کے بارے میں جھوٹی سچی اطلاعات فراہم کرتا ہوگا، اگرچہ دو تین مرتبہ اس کے بازپرس کرنے پر وہ ہر بار اس بات سے انکار کرتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جمن آ کر اسے طویلے کے سبھی جانوروں یعنی کتوں، مرغوں، بیلوں اور اکلوتے گھوڑے کے بارے میں علیحدہ علیحدہ بتا کر واپس چلا گیا کیوں کہ طویلے میں کام کرنے والے ملازمین نے اس کے لیے بھنگ تیار کی ہوئی تھی، جسے وہ ہر روز صبح سویرے چائے پینے کے بعد نوش کیا کرتا تھا۔ جسے نوش کرنے کے بعد اسے لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔

اپنے جانوروں کے بارے میں جان کر گل محمد نے طمانیت تو محسوس کی لیکن یار کھمبو خان کا خیال اب بھی ایک ہوک بن کر ہر کچھ دیر بعد اس کے دل سے دھوئیں کی طرح اٹھتا تھا اور وہ صرف ایک لمبی سانس لے کر رہ جاتا تھا۔ کاش اس کے گوٹھ سے بھی اس کی خیر کی خبر آ جاتی۔

وہ کئی گھنٹوں سے اپنے بے تکے خواب اور اس کی ماورائے عقل تعبیر کے دباؤ میں تھا۔ اس نے اپنے دوست کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے آپ کو تسلی دی کہ وہ اپنے گوٹھ میں اس وقت نیند سے بیدار ہو گیا ہوگا اور قصبے آنے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ یہ سوچتے ہی اس کے دل سے کچھ بوجھ ہٹنے لگا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ آج ہونے والی ریچھ کُچھّر کے لیے کھمبو خان کے بغیر کتے منتخب کرنا اس کے لیے سخت دشوار تھا۔

ان کے لیے دوستی ایک عام انسانی رشتے سے بڑھ کر ایک مقدس رسم کی طرح تھی، جس میں ایک دوست کے لیے اپنے دوسرے دوست کی ہر پکار، ہر آواز اور اس کی ہر پریشانی پر فوراً لبیک کہنا اور آن کی آن میں اس کی مدد کو پہنچنا لازمی ہی نہیں بلکہ ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تو پگڑی بدل یار بھی تھے۔ انھوں نے اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے سامنے اپنی پگ یعنی اپنی ناموس ایک دوسرے کے سر پر رکھا تھا اور اس کے بعد سے یہ دوست یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔

خواجہ رضی حیدر

عدم وجود کی تلاش

تب میں نے اپنی دونوں آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف خاموشی اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ نہ وہ آواز تھی اور نہ وہ نور کا ہالا۔ بس ایک مہیب تاریکی۔ ایسی تاریکی جو ذہن میں اندیشوں کے لاوٗ اور وجود میں خوف کے جہنم گرم دیتی ہے۔ اس خاموشی اور تاریکی میں قوّتِ فیصلہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں کس طرف سے اس طرف کو آیا تھا۔ جس طرف سے میں اس طرف آیا تھا وہاں کیا تھا اور اَب جہاں میں ہوں وہاں کیا ہے۔ ایسے میں اچانک وہ گمشدہ آواز پھر اُبھری۔ وہ آواز جس کے تعاقب میں بے خطر میں اس طرف آ گیا تھا۔ میری سماعت کے مقابل خوف اور اندیشوں کا جال تن گیا اور اس جال میں اُلجھ کر وہ آواز ایک تغیر سے ہمکنار ہوگئی۔ ایک نامانوس گونج میں ڈھل گئی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید یہ کوئی دوسری آواز ہے لیکن جب ذرا حواس بحال ہوئے تو احساس ہوا... نہیں... یہ دوسری نہیں پہلی ہی آواز ہے اور یہی آواز اس خاموشی اور تاریکی سے قبل مجھ سے ہمکلام تھی۔ یہی آواز مجھے اُس طرف سے اِس طرف لے آئی تھی۔

میں نے اپنے بدن کی تمام قوّت کو اپنے حلق میں سمیٹ کر اس آواز کو مخاطب کیا۔ آواز جو تجسیم سے محروم تھی۔ میرے تخاطب پر چُپ ہوگئی اور پھر میں بولنے لگا۔ میں جو اپنی عمر کے چالیس سال اُس طرف گنوا کر اس طرف آنے کی خواہش میں اسیر تھا۔ تخاطب کے اس لمحہ میں یہ بھول گیا کہ فحش گوئی میرا سرمایۂ نطق ہے، دروغ گوئی میری گفتگو کا حُسن ہے، مصلحت میرے لفظوں کا لباسِ فاخرہ ہے اور مکر میرے بیان کی اساس ہے۔ میں نے سچ سچ کہنا شروع کر دیا۔ صداقت کی کوکھ سے جنم لیتی ہوئی میری کہانی خود میرے لیے مختلف ہوگئی۔ میں نے کہا، میں ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ جب میں پیدا ہوا تو میرے والد کی پھوپھی کریم النساء بیگم نے اذانِ فجر سے قبل اپنے والد حضرت محدث سورتی کو خواب میں دیکھا۔ وہ میری ولادت پر بہت خوش تھے۔ پھوپھی نے میرے والد سے اپنے خواب کی تعبیر یوں بیان کی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر اپنے پَردادا کا نام روشن کرے گا۔ میرے والد نے جو اولادِ نرینہ کی پیدائش پر مصروفِ ادائے نوافل تھے جب ترکِ استقبال قبلہ کیا تو میرے والد کی پھوپھی نے میرے نومولود وجود کو اُن کے ہاتھوں میں دے دیا۔ انہوں نے تشکر کی ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور پھر نہایت مسحور کن آواز میں اذان میری سماعت کے سپرد کر دی۔ میں اپنی تازہ

آنکھوں سے اُن کے چہرے کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔ پھر میری آنکھیں باسی ہو گئیں اور وہ چہرہ عکسِ پارینہ میں تبدیل ہو گیا۔ دُنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ میں اپنی تقدیر سے الگ ایک نئے مقدّر کی تلاش میں راہ سے بے راہ ہو گیا۔ اندھی خواہشوں کے سرکنڈے میرے وجود میں لہلہانے لگے اور دُنیا کی ایک بدترین صورت میرے اندر قرار پا گئی۔ ایسی دُنیا جو میرے اجداد کی دُنیا سے مختلف تھی۔ گناہ اور معصیت کے سائے میرے وجود میں در آئے۔ شراب نوشی کی تمنا اور زنا کی خواہش نے مجھے زیر و زبر کر دیا۔ اندر کی آگ نے اس قدر زور باندھا کہ نیکی کی ہر ساعت جل کر راکھ ہو گئی۔ مراجعت کا ہر ایک لمحہ خواب ہوتا چلا گیا اور خواب کی ہر تعبیر مفقود... ایسے میں مراجعت کا ایک لمحہ آیا اور میں اُس طرف سے اِس طرف کو آ گیا۔ ایک آواز کے تعاقب میں۔ پھر میں چُپ ہو گیا اور وہ آواز جس کے تعاقب میں، میں بے خطر اُس طرف سے اِس طرف آ گیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی۔ تم ایک راہ گم کردہ رُوح ہو۔ اور گم کردگانِ راہ اتنی آسانی سے اپنا مقصود نہیں پاتے ہیں۔ اُن کو ضمیر کی ایک معمولی سی ملامت سے ہدایت کی منزل نہیں مل جاتی ہے۔ وہ امتحان در امتحان اپنی عمر کرتے رہتے ہیں تب جا کر اُن کو حق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ تم ابھی کسی قابلِ ذکر امتحان سے نہیں گزرے ہو۔ ابھی تمھارے اندر خواہش اور تمنا کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ابھی تمھاری آنکھوں میں رشک کی چمک موجود ہے۔ ابھی تمھارے فیصلے مقرر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جسے تم مراجعت کا لمحہ تصوّر کر رہے ہو وہ کسی محرومی کی پیداوار ہو۔ کسی تشنۂ آرزو کی متغیر صورت ہو۔ تم اس خاموشی اور تاریکی میں اپنے اعمال کی فرد لیے احتساب کے عمل سے گزرتے رہو۔ اپنے کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کو یاد کرو۔ اپنے مظالم اور زیادتیوں کو بغیر کسی جواز کے ظلم و زیادتی تصوّر کرتے رہو۔ اپنے نفس کی قوّتِ فکریہ کو اتنا فروغ دو کہ وہ تمھارے نفس کی قوّتِ غضبیہ اور قوّتِ شہوانیہ کو ہلاک کر دے۔ تب مراجعت کا یہ لمحہ تم پر منکشف ہو گا اور تمھاری فیصلہ کرنے کی صلاحیت مثبت صورت اختیار کرے گی۔ اور پھر جب تم اس خاموشی اور تاریکی میں اپنی دونوں آنکھیں کھولو گے تو یہ خاموشی خاموشی نہیں ہو گی اور یہ تاریکی تاریکی نہیں رہے گی۔ خاموشی کے بطن سے جو نطق ظہور کرے گا اور تاریکی کے پہلو سے جو نور ہویدا ہو گا وہ تم پر تم کو منکشف کر دے گا۔ پھر ایک نیا شخص تمھارے اندر سے برآمد ہو گا۔ یہ شخص اپنے نفس کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات کی اطاعت پر مجبور کرے گا۔ ظلم کے ساتھ غالب ہونے پر انصاف کے ساتھ مغلوب ہونے کو ترجیح دے گا۔ سلامتی کے زمانہ میں ہلاکت کو، عافیت کے زمانہ میں مصیبت کو اور دُنیا کے مقابلے میں آخرت کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ اخلاق اور افعالِ حسنہ کے ذریعۂ عوام الناس سے اُنس و محبت پیدا کرے گا۔ بے وقوفی، ریا کاری، ابتذال، غدر، حماقت، جہل، مکر و خباثت اور کند ذہنی سے کنارہ کش رہتے ہوئے اپنے اندر صدق، حکمت، تحمّل، دلیری، عاجزی، ثابت قدمی، حلم، عالی ہمتی اور درگزر کے جذبات کو فروغ دے گا۔ طیش، کینہ، لہو و لعب، بے شرمی،

حسد، بدخلقی، خودپسندی، سنگدلی، ترش روئی، نخوت، غرور، خجالت، بے وفائی سے گریز کرے گا اور بردباری، نرم مزاجی، ضبط وصبر، سخاوت، قناعت، پاک دامانی، حیا، کرم، ایثار کی طرف راغب ہوگا کیوں کہ اُسے علم ہوگا کہ علم کا سبب عاجزی ہے، قناعت کا سبب استغنا ہے، بے عزتی کا سبب طمع ہے، تنگدستی کا سبب فضول خرچی اور پاکیزگی کا سبب تزکیۂ نفس ہے۔ پھر وہ آواز خاموش ہوگئی اور ایک مہیب خاموشی میرے اطراف پھیل گئی۔ اس خاموشی اور اس تاریکی میں ایک بار پھر میں نے اپنی دونوں آنکھیں بند کرلیں۔ وہ آواز خاموش تھی لیکن میرے اندر ایک شور برپا تھا۔ ایسا شور جو شدید زلزلہ کی آمد پر پیدا ہوتا ہے۔ جس میں زمین کے شق ہونے کی ہولناک آوازیں۔ عورتوں بچوں کی چیخ و پکار، زخمیوں کی کراہیں، عمارتوں کے گرنے کی فلک شگاف گڑگڑاہٹیں اور رحم وپناہ کی بلند بانگ التجائیں شامل ہوتی ہیں۔ میں نے اِس شور میں اندر کی آوازیں سنیں اور باہر کی تمام آوازیں میری سماعت کے لیے معدوم ہوگئیں۔ اندر کی آوازیں۔ ایسا لگتا تھا میرا قلب میری رُوح سے ہمکلام ہے۔ نجانے کتنی راتیں اور کتنے دن اسی عالم میں گزر گئے۔ پھر ایک دن اس صورتِ حال سے اُکتا کر میں نے اپنی دونوں بند آنکھیں کھول دیں۔ میں یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ میں جہاں کھڑا تھا اَب بھی وہیں پر کھڑا ہوں۔ میرا وجود اور عدمِ وجود اَب بھی ایک دوسرے سے بہت دُور کھڑے اجنبی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں کسی نے مجھ سے کہا کہ تم عجلت کا شکار ہوگئے ہو۔ تم نے اپنی آنکھیں بہت جلد کھول دی ہیں۔ اس لیے تمھارے سب منظر بے منظر ہوگئے ہیں۔ بصارت سے الگ ایک قوّت جو بُصیرت کہلاتی ہے وہ عجلت کی بنا پر تم سے روٹھ گئی ہے۔ اب تم کسی حجلۂ دُعا میں اقامت اختیار کرو۔ استغفار کے لمحے کو اپنے اندر وسعت دو اور اپنی ظاہر کی آنکھیں بند کرلو تاکہ اندر کی آنکھوں کی روشنی بحال ہوسکے اور تم اپنے عدم وجود کو پاسکو۔ مگر شاید تم کبھی اپنے عدمِ وجود کو نہیں پاسکو گے۔ کیوں کہ عدم وجود تو زاہدوں اور عابدوں پر ظاہر ہوتا ہے اور یہی وجود اُن کو ذاتِ باری تعالیٰ کی نعمتوں سے قریب کرتا ہے اور اُن لوگوں سے محفوظ رکھتا ہے جو غضب کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی وجود اپنی رہنمائی میں انسان کو عرفان مآب بناتا ہے۔ تم تو ابھی اپنے سابقہ وجود کے حصار میں کھڑے اپنے معطل احوال کو رشک سے دیکھ رہے ہو۔ اُٹھو اور اپنی ہی آگ میں جل کر کیمیا ہوجاؤ کہ کیمیا ہونا ہی عدمِ وجود تک رسائی کی شرطِ اوّلین ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

ڈاکٹر ادل سومرو

آپ کی ٹرین کسی وقت بھی آسکتی ہے

(تنویر عباسی کے حوالہ سے تاثراتی تحریر)

ہر آدمی کی ٹرین آتی ہے۔ اپنی اپنی ٹکٹیں سنبھال کے رکھیے۔ آپ کی ٹرین کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ کچھ لوگ ٹرین کا انتظار کرتے ہیں اور کچھ لوگوں کو یاد ہی نہیں رہتا کہ انہیں یہ پلیٹ فارم چھوڑنا بھی ہے۔ ایسے لوگوں کو چلتی ہوئی ٹرین میں چڑھنا پڑتا ہے۔

انیتا جوزف اور ثروت حسین اپنی ٹرین کا زیادہ انتظار نہ کر سکے اور خود کو ٹرین کے حوالے کر دیا اور ٹرین کو پیارے ہو گئے۔

اسٹیشن پر انتظار ہے، جدائی ہے۔
پتہ نہیں یہ ٹرینیں کہاں سے آتی ہیں اور کہاں کو جاتی ہیں۔
وہ رات بھی ستاروں بھری تھی۔
روہڑی اسٹیشن کا پلیٹ فارم اور لیٹ آنے والی ٹرین کا انتظار۔ پتھر کی بینچ اور ٹھنڈی میٹھی باتیں۔
(جمعہ 12 نومبر 1999)

ٹرین آئی اور تنویر عباسی اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔
ٹرین اس کی جس طرف کو جا چکی ہے، میں ابھی تک اس طرف ہی دیکھتا ہوں۔
(تنویر عباسی، ساجن، سوتھن مسرت، ص، 45)

اس کی ٹرین پھر سندھ واپس نہیں لوٹی۔
اس کی آنکھیں بھی سندھ سے باہر ہی رہ گئیں۔
جب آپ کی آنکھیں بھر آئیں تو تنویر عباسی کی آنکھوں کو ضرور یاد رکھیے گا۔
وہ آنکھیں، جنہوں نے ہر آدمی کا مسکرا کر استقبال کیا۔ جن میں معصومیت، سادگی اور محبت تھی۔
ساجن گھر آیا۔
ایک آنکھ نے دیکھا، دیکھ سکی نہ دوجی۔

کسی نہ کسی حوالے سے انسان بے بس نظر آتا ہے۔ (تنویر)

مرنے کے بعد تو ویسے بھی دوسروں کے حوالے، لیکن زندہ رہتے ہوئے بھی وہ کسی نہ کسی کا طابع ضرور ہے۔

کوئی بھی اپنی مرضی کا مالک اور آزاد نہیں ہے۔

کامریڈ برکت علی آزاد بھی آزاد نہ تھا۔

زندگی میں بھی اکثر خواہشیں نامکمل رہتی ہیں اور مرنے کے بعد کی چھوٹی چھوٹی معصوم سی، خواہشیں بھی پوری نہیں کی جاتیں۔ کہیں فطرت آڑے آتی ہے تو کہیں رشتوں ناتوں کی انائیں رکاوٹ بنتی ہیں۔

یہ سب شاعرانہ خیالی باتیں ہیں، سب کو تو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے خواہش کا اظہار کیا۔ اس نیک ارادے کا صلہ اسے ملے گا۔ بس خیر ہو۔ یہ بہت ٹیڑھے معاملات ہیں، ان میں نہ پڑا جائے تو بہتر ہے۔ ہمارے اپنے اطوار اور طریقے ہیں۔ ہمیں یہاں رہنا ہے، اس لیے حالات کے مطابق ہی فیصلہ کرنا ہے۔

ٹھیک ہے آپ ادبی وارث ہیں، لیکن کسی بھی فیصلے کا اختیار ہم عزیزوں کو ہے۔

تربت کو کیا ہے؟ تربت کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی ادیبوں اور شاعروں کی تربتیں لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہیں۔

اگر تنویر عباسی کی ڈیڈ باڈی، اس کی وصیت کے مطابق میڈیکل کالج کو دی جاتی تو پھر تربت کا سوال اٹھتا کیا؟ پھر تم کیا کرتے؟

چھوڑیں یہ باتیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔

دونوں جڑواں چاند ڈوب گئے۔

(الطاف عباسی، 6 فروری 1978، اور تنویر عباسی 25 نومبر 1999)

جڑواں چاند۔ الطاف عباسی کا شعری مجموعہ۔

مٹی میں مٹی بن جائیں، کتنے پیارے لوگ (تنویر کہے، صفحہ 354)

قمر، چاند۔ تنویر، روشنی۔ (قمر عباسی، تنویر عباسی کی شریک حیات)

مجھ میں تو موجود
اور میں بھی تو ہی تو

پارس، سرمد، مارئی اور روبی رانی۔

ختم کہانی

سرمد کا گھر۔ خیرپور

26 نومبر 1999

کچھ نوجوان شاعر اور ادیب، اداس بیٹھے ہوئے ہیں۔ سرمد کے گھر کے اوپر نیلا آسمان۔ میرواہ کے کنارے، شیشم کے درخت، پرندے اور ہوائیں۔

فطرت کا شاعر تنویر عباسی، اب سرمد جو گھر میں موجود نہیں ہے۔

میرواہ کے پنچھی پوچھیں

کہاں گیا تنویر

سب دوست پھول باغ چلیں، جہاں تنویر عباسی کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔

یہ غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کس نے کیا ہے؟

زندگی میں تنویر عباسی جن معاملات سے دور رہے، اب ان کو اختیار کیا جا رہا ہے۔

تنویر عباسی نے تو ہسپتال میں مصنوعی طریقے سے زندہ رہنے سے بھی انکار کیا تھا۔

نماز بھی غائبانہ ہوتی ہے کیا؟

کیوں نہیں ہوتی، غائبانہ امتحانات ہوتے ہیں۔ غائبانہ نکاح ہوتے ہیں تو پھر غائبانہ نماز میں کیا حرج ہے۔

یہ کونسا پھول باغ ہے جہاں ایک بھی پھول نہیں ہے۔ اس باغ میں کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے ایک جلسے میں تقریر کی تھی اور تنویر عباسی اس کے ساتھ تھے۔

غائبانہ نماز سے بہتر ہے کہ تنویر عباسی کی غائبانہ صدارت میں غائبانہ مشاعرے کا پروگرام کیا جائے۔

مشاعرے کا ذکر مت کرو۔ ہوٹنگ کرنے والے جمع ہو جائیں گے۔

غائبانہ نماز میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

وہ محقق ملا غائب ہو گیا ہے۔ تنویر عباسی کے بارے میں شک میں پڑ گیا ہے اور اس کا ایمان ذرا سا ہلنے لگا ہے۔

اچھا یہ تو بتاؤ اسلام آباد کون کون چلے گا؟

سفر لمبا ہے یار کچھ سوچتے ہیں۔ ویسے بھی تنویر عباسی کا تخلیقی فکر ہمارے ساتھ ہے۔ تنویر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔

آؤ اس کے اشعار پڑھیں اور انہیں پھیلائیں۔

میں تنویر عباسی کا ایک ہائیکو میرواہ کے درخت پر اس طرح لکھ کر آیا ہوں، جیسے میں نے کبھی اپنی

محبوبہ کا نام لکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک نیل کنٹھ تنویر کا ہائیکو بڑے غور وفکر سے پڑھ رہا تھا۔

اسے کہتے ہیں جمالیاتی شعور۔

آئیں ہم سب مل کر تنویر کو یاد کریں۔ اس کے جنم دن کی یاد میں کیک کاٹیں اور دیے جلائیں۔

اس کی یاد میں کوئی اکادمی، فورم یا ادارہ قائم کریں۔

ایسی غلط تجاویز نہ دیں، خوامخواہ کے جھگڑے ہوں گے۔ تنویر اور تنویر کے افکار کو کسی بھی فورم کی ضرورت نہیں ہے۔ تنویر عظیم ہے اور اس کے اشعار دلوں میں محفوظ ہیں۔

او تنویر!

اشعار یہ تیرے

دیس کا بھاگ جگائیں گے

تنویر کی ہمیں ایک بات بالکل اچھی نہیں لگتی تھی، وہ سب کو عزت دیتے تھے۔

وہ کہتے تھے:

"میں شاعر ہوں اور میرے پاس ہر انسان کے لیے احترام ہے"۔

بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ غیر ضروری لوگوں کو بھی اہمیت دی جائے۔

وہ ضدی بھی بہت تھے۔

ہم کہتے تھے سائیں آپ کے اعزاز میں ایک زبردست قسم کی شام کا اہتمام کیا جائے اور آپ کے گیت نئے انداز سے مختلف فنکاروں کی آواز میں ریکارڈ کرائے جائیں۔

تو وہ انکار کر دیتے تھے۔

ہم کہتے تھے، سائیں آپ کی کتاب کی رونمائی کرائی جائے۔ تو وہ کہتے، کسی نئے لکھنے والے کا پروگرام کرایا جائے۔ ہم کہتے تھے، سائیں فلاں پروگرام کی صدارت آپ کو کرنی ہے۔ تو انکار کر دیتے تھے۔

سائیں کے انکار کرنے پر مجبوراً ہمیں اپنے اعزاز میں شاموں کا اہتمام اور اپنی کتابوں کی رونمائی تقاریب کا انعقاد کرنا پڑتا تھا۔

علمی و ادبی سرگرمیاں تو جاری رکھنی ہیں نا۔

تنویر کہتا تھا:

کچھ نہ لے جائیں گے

کچھ دے کر ہی جائیں گے

عجیب فلسفہ ہے۔
جل کر جو خوشبو پھیلائے
وہ ہی ہے چندن

تنویر تو چندن تھا، جس نے خود جل کر دوسروں کو خوشبو دی۔ خیر پور میں اب کوئی بھی چندن نہیں رہا۔ یہاں تو اب دوسروں کو جلا کر ہاتھ گرم کرنے والے رہ گئے ہیں۔

ہم تو تنویر عباسی کو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنانا چاہتے تھے لیکن حسب معمول انہوں نے انکار ہی کیا۔

بھلا یہ تو بتاؤ شاعر ہونا بڑی بات ہے یا وائس چانسلر ہونا؟

شاعر ہونا قابل فخر بات ہے۔

یہ تو آپ شاعر لوگ خوش فہمی کے چکر میں ایسا کہتے ہیں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہسپتال تک پہنچنے کا کرایہ بھی آپ کی جیب میں نہیں ہے۔ آپ کی یہ پرانی بائیسکل کتنا سفر کر سکے گی۔ یہ ساری ہوائی باتیں ہیں۔ آپ کے یہ اخباری بیانات ورد سر کی دو گولیاں بھی نہیں دلوا سکتے۔

رشید بھٹی کی فائل بھی محکمہ صحت کے دفتروں میں دفن ہو گئی اور وہ الوداع کہے بغیر ہم سے بہت دور چلے گئے۔

رشید بھٹی، تنویر عباسی کا جگری دوست تھا۔ ادب میں مارشل لا کے عنوان سے وہ اپنے افسانے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایک محقق کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ سچل سرمست پر لکھے گئے آٹھ دس مضامین کو سامنے رکھ کر ان میں سے فقرے کاٹ کر سچل سرمست پر اپنا مقالہ تحریر کر رہا تھا۔" (کتاب جاڑوں کی رات ص 145)

تحقیق بھی بڑا گورکھ دھندا ہے۔ سچل سرمست پر جدید تحقیق کی نگرانی کے لیے ہم نے تنویر عباسی کو زبردستی سچل چیئر بھیجا، ورنہ وہ تو انکار ہی کر رہے تھے لیکن ہم نے انہیں سمجھایا کہ سائیں آپ کا شہر سوبھو ڈیرو، سچل کے شہر درازا شریف کے قریب ہے، اس لیے سچل چیئر پر آپ کا حق زیادہ بنتا ہے۔ تب جا کر تنویر کو بات سمجھ میں آئی۔

ہم نے تنویر سے کہا کہ شاہ لطیف کے بعد اب وہ سچل سرمست پر بھی تحقیق کریں۔ عالموں اور ادیبوں کو تحقیق کی کمی کے سلسلے میں خواہ مخواہ کی شکایات ہیں۔ ہمارے لوگ تحقیق میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی نجی زندگی کے بارے میں تحقیق کرتے رہتے ہیں۔

فلاں شخص آج کل کیا کر رہا ہے؟

اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ؟

فلاں کی بیوی بہت خوبصورت ہے۔

وہ آخر اتنا خوش کیوں ہے۔

ہر شخص دوسرے کے بارے میں تحقیق کرنے میں مصروف ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں میں بھی تحقیق یعنی ریسرچ کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ پڑھنا پڑھانا اتنا اہم نہیں جتنی ریسرچ اہم ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اساتذہ ریسرچ میں مصروف ہیں۔ وہ یہ ریسرچ کرتے رہتے ہیں کہ کون سے کام فائدہ مند اور کون سے نقصان دہ ہیں۔ وہ ایسے گُر اور ہنر تلاش کرتے رہتے ہیں کہ جن کے ذریعے باس کی خوشنودی حاصل کی جا سکے اور ادارے میں موجود نہ ہونے کے باوجود وہ نظر بھی آ سکیں۔ یہ جدید تحقیق کی اقسام ہیں جو دیسی یونیورسٹیوں میں تو موجود ہیں لیکن باہر کے لوگ ان سے انجان ہیں۔

تحقیق میں مصروف یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان، تنویر عباسی سے ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے۔ تنویر کو تحقیق کا کیا پتہ؟ وہ تو ایم اے پاس بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ گائیڈ ہے، یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی۔

لیکن تنویر کو ان تبصروں کی پرواہ نہ تھی۔

میں تنہا بھی جاؤں گا
مجھ کو آگے جانا ہے (ساجن سوتھن سرت، ص، 13)

چیٹر بہت خطرناک لفظ ہے۔

رشتوں ناتوں کے درمیان اگر ''چیٹر'' آ جائے تو بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔

کہاں چِل اور کہاں چیٹر؟

آئیں چِل چیٹر کے حوالے سے یہ تحقیق کریں کہ تنویر عباسی کا کوئی دشمن بھی تھا کیا؟

نہیں، تنویر عباسی کا کوئی بھی دشمن نہ تھا، سب دوست ہی تھے اور وہی سب کچھ تھے۔

دوستوں نے دوستی خوب نبھائی
میں گرا تو وہ روند کر گذر گئے (ایم کمل)

تنویر نے کہا:

نہ ہی میں خدا اور نہ ہی میں رسول
میں تنویر ہوں، گر کرو تم قبول

لیکن پھر بھی لوگوں نے اس کے ساتھ پیغمبروں جیسا برتاؤ کیا۔

تنویر کا خیال تھا کہ:

وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے
میرے پاس ہی آئیں گے

لیکن تنویر کا قریبی ساتھی اور رفیق اس کے دل پر پاؤں رکھ کر جو چلا گیا تو وفات کے بعد بھی تنویر کے دروازے پر نہ آیا۔

تنویر کے پاس جاؤ تو پھول لے کر جانا
کسی کی شکایت نہ کرنا

ہم معمولی چھوٹے لوگ ذرا سی بات پر بھی ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ تھوڑی سی ذاتی زیادتی ہوتی ہے تو اسے اجتماعی مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن تنویر نے سارے درد خاموشی سے برداشت کیے اور کسی سے کوئی شکوہ نہ کیا۔

اس کے سارے آنسو، اس کے دل پر گرے لیکن چہرے پر آخر تک وہی مسکراہٹ رہی۔

آنسو اتنے کہ کوئی پونچھ نہ سکے
گھاؤ ایسے کہ کوئی سی نہ سکے (تنویر)
درد اتنے کہ کوئی گن نہ سکے
سارے داغ دھل جاتے ہیں لیکن
درد کا داغ کبھی دھل نہ سکے

تنویر نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ انسان پر اس کا اعتماد اور بھروسہ کہ:

ہر انسان ہے موتی کا دانہ
ہر دل ہے ہیروں کی کان (تنویر)
اتنا جلدی اٹھ جائے گا اور اس کے آدرش لرز جائیں گے
لوگوں کے اس جنگل میں، کتنا زخمی ہو گیا ہوں میں (تنویر)

ہیرا پھیری کی اس دنیا میں اصول پرست انسانوں کے لیے گنجائش کم ہوتی ہے۔ تنویر بڑا آدمی تھا اور ہاں میں ہاں ملانے والا نہ تھا۔

یہ سر کسی کے آگے جھکانے سے
بہتر ہے کہ سر ہی کاٹ دیا جائے (تنویر)

اس کے افکار اور دانش کی خوشبو، ذہنی آلودگی رکھنے والے چھوٹے لوگوں کو پسند نہ تھی۔

جس تربوز میں خوشبو ہوگی
وہ ہی پہلے ٹکڑے ہوگا
میر واہ کے کناروں کی طرح
لوگوں کے دلوں کے کنارے بھی خستہ پڑ گئے ہیں
مفلس شہر کے مفلس لوگ
سرمد کا گھر وہی ہے لیکن وہ اب ووٗمن چیئرز بن گیا ہے
چِل چیئرز۔ ووٗمن چیئرز
کیا خواتین بھی ''چیئرز'' پر لڑتی ہیں؟
نہیں، خواتین صرف میوزیکل چیئرز گیم کھیلتی ہیں، جس میں ایک دوسرے کو دھکا دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔
ہر گیم یہاں پر ہی رہ جائے گی
آپ کو اپنی ٹرین کی تیاری کرنی چاہیے
ٹرین کسی وقت بھی آ سکتی ہے
اپنے ہاتھوں سے مٹی میں
مجھ کو وہ دفنائے گا
میرا ساجن آئے گا (تنویر)

''پوٹھوہار کی اس مٹی میں، موتیے کی مہک جیسا، سندھ کا صوفی شاعر دفن ہے۔ جس نے امن، انسانیت، پیار و محبت اور مٹی کے گیت لکھے، لیکن اسے اپنے دیس کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ آپ جب بھی یہاں سے گزریں، تو اس مسافر شاعر کی تربت پر اپنی نیک تمناؤں کے دو چار پھول رکھنا نہ بھولیے گا کیوں کہ اسے پھولوں سے زیادہ محبت تھی''۔ (تنویر کی تربت کا کتبہ)

مجھے تو تنویر کی تربت کا نمبر بھی یاد نہیں رہا۔

یہ اسلام آباد ہے، دفتروں اور قبرستانوں کا شہر۔

یہاں روبوٹ رہتے ہیں اور ''یس سر یس سر'' کہتے رہتے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کا زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دیتا۔ یہاں سب اکیلے ہیں۔ اور تنویر عباسی بھی اکیلا رہ گیا۔

☆☆☆☆

محمد عارف

ضیاء العلوم

سٹڈی میں بیٹھے، چاروں اور دیکھتے، کتابوں کو گھورتے، ہم اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان میں سے کون سی کتابیں موصوف نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے خریدی ہیں۔ دفعتاً چائے کی ٹرے اٹھائے داخل ہوا، چائے پیش کی اور ادب پر گفتگو کی دعوت دی۔ بیک وقت دو آوازیں ابھریں: شاعری، افسانہ۔۔۔

’’یار کوئی ایسا موضوع جس میں آپ کی مشترک دلچسپی ہو؟‘‘

’’اسٹیج ڈراما‘‘ اس جواب کے ساتھ ہی سکوت چھا گیا۔

چہرہ: مہرہ سا، رنگ: رنگ دار (جسے چھپکے رنگ کے لباس سے مزید گہرا کرتا ہے) ڈاڑھی: روزمرہ کے عین مطابق، مونچھیں: خلافِ روزمرہ، بال اور کریکٹر بلیک اینڈ وائیٹ، شکل معصومیت اور کرختگی کا حسین امتزاج، کوئی بات کر رہا ہو تو چہرے پر بے زاری اور خود بات کر رہا تو بہت بے زاری ہوتی ہے۔ اپنی ٹانگ ہمیشہ اوپر رکھتا ہے، دوسرا شخص میسر نہ ہو تو اپنی بائیں ٹانگ اپنی دائیں ٹانگ پر رکھ لیتا ہے، ثبوت کے طور پر کوئی بھی تنقیدی اجلاس ملاحظہ فرمائیں۔ ہر وقت سوچتے رہنے کی ایکٹنگ کرتا رہتا ہے، کیا سوچتا ہے؟ اسے خود بھی معلوم نہیں اور نہ اس کے پاس وقت ہے کہ اس بارے میں سوچے۔ دورانِ گفتگو آنکھیں یوں گھماتا ہے جیسے سوچ بھی آنکھوں سے رہا ہو، اگر یہ بات درست تسلیم کر لی جائے تو دائیں آنکھ سے قدرے ترچھا سوچتا ہے اور ویسے بھی دیکھتا تو تنقیدی بصیرت سے ہے، عینک تو صرف ’’شو۔ شا‘‘ کے لیے لگائی ہوئی ہے۔

ضیاء المصطفیٰ ترک مہروی، کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک ہی بندے کا نام ہے۔ لگتا تو ہمیں بھی نہیں تھا لیکن کام اور کرتوت دیکھے تو محسوس ہوا کہ ایک ادھ دُم چھلا مزید لگایا جا سکتا ہے، سو یار لوگوں نے ’’پروفیسر‘‘ لگا دیا۔ اِس کے تخلص کا بھی جواب نہیں، صرف ’’ت‘‘ کی حرکت تبدیل کر کے مقطع کے ساتھ ساتھ پورا منظر نامہ بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ وطنِ عزیز میں اتاترک کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہونے والا ترک یہی ہے، جس کی ایک وجہ تو اس کی بے پناہ تنقیدی بصیرت ہے اور دوسری یہ کہ تیسرا کوئی ترک موجود ہی نہیں۔

شکل سے روایتی جب کہ شاعری سے جدید شاعر لگتا ہے، ایسی شکل کے شاعر جنگِ آزادی سے پہلے پائے جاتے تھے، پتا نہیں یہ کیوں لیٹ ہو گیا، وقت پر آتا تو نہ صرف ہماری صحبت سے بچ جاتا بل کہ اپنے

دیوان پر دیوان سے ضخیم مقدمہ لکھ کر امر بھی ہو جاتا، خیر امر تو اب بھی ہے۔

”شعرگائی“ میں اپنے سٹائل کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ شعر سنانے سے قبل سکتہ کرتا ہے، پھر دور خلا میں گھورتے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے اسے 45 ڈگری پر فکس کر کے ابتدا کرتا ہے، اس دوران آنکھوں کی چمک اور چہرے کا تغیر یوں ہوتا ہے جیسے مضامین اتر رہے ہوں اور موصوف ابھی کے ابھی موزوں کر کے انھیں احباب کے گوش گزار کر رہے ہوں۔ ایسے اشعار جو احباب کو بھی ازبر ہو چکے ہیں وہ بھی اسی وجدانی کیفیت میں سناتا ہے، (جن احباب کو اس وجدانی کیفیت کی سمجھ نہ آ رہی ہو وہ موصوف کے شعری مجموعے ”شہر بے چراغ“ پر موصوف کی ڈایاگرام ملاحظہ فرمائیں) دوسروں کے اشعار تو یوں سناتا ہے جیسے اپنے ہوں۔

داد دینے کی صلاحیت خداداد پائی ہے، ایسی بے داد صلاحیت زورِ بازو سے حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اس کی داد پر اچھا بھلا عاقل بالغ شاعر بھی سٹپٹا جاتا ہے۔ ہم نے اس کی داد پر کچھ احباب کو خوش اور کچھ کو بہت خوش دیکھا۔ اپنی سمجھ میں تو پہلے روز ہی آ گیا تھا کہ پروفیسر آدمی ہے، جس چیز کی تعریف کرے اسے کسی قابل آدمی کو ضرور دکھانا چاہیے۔

اپنی مرضی کے کام میں خوش رہتا ہے، اس لیے ہر وقت تنقید کرتا رہتا ہے۔ ہر بات عقل کی کسوٹی پر پرکھتا اور تولتا ہے، ہاں حوالے اور باٹ اس کے اپنے اور الگ ہیں۔ ناقد بھی ہے (ایسا ادیب جس کی سرشت میں خیر سے زیادہ شر ہو ناقد کہلاتا ہے، شاید آگے جا کر یہی ناشر بنتا ہے۔ ناقد کو ادبی مولوی بھی کہہ سکتے ہیں بشرط کہ غیر ادبی مولوی کو اعتراض نہ ہو) دورانِ تنقید پہلے سامع، پھر مقرر اور پھر مکرر ہوتا رہتا ہے۔ اس میدان میں اس وجہ سے بھی کامیاب ہے کہ جتنا یہ اکیلا شور مچاتا ہے، کئی آدمی مل کر بھی نہیں مچا سکتے۔ بولنے کا موقع ہر کسی کو دیتا ہے لیکن بولتا خود ہی ہے۔ فن پارہ کوئی بھی ہو اس کی ہیئت، فکر اور فن پر بحث کرنا اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس شغل کے دوران اس کا لہجہ یوں ہوتا ہے جیسے تنقید نہیں مناظرہ کر رہا ہو، اس مرحلے پر اس سے بحث کرنا بھڑوں کے چھتے میں منہ دینے کے مترادف ہے۔

ہر بات ہر جگہ نہیں کرتا، بحث ہر جگہ اور ہر وقت کرتا ہے۔ بحث میں بہ یک وقت دو تین زبانیں استعمال کرتا ہے، لیکن مقدم وہی زبان رکھتا ہے جس میں نرم سے نرم الفاظ میں سخت سے سخت بات کی جا سکتی ہو۔ اس کی قادرالکلامی اور انشاپردازی کے کیا کہنے، کسی بھی لفظ کو گالی اور گولی کی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ کسی موضوع پر بحث جاری تھی اور ضیاء کا گلا خراب تھا، احباب نے خوب خوب فائدہ اٹھایا، زور و شور سے بحث ہوئی، موصوف باوجود کوشش کے کوئی خاص انٹری نہ دے سکے، سو گفتگو کا مزا دوبالا ہو گیا۔ محفل برخاست ہوئی تو پوچھا: ”ڈاکٹر کے پاس گئے تھے؟“

"ہاں"

"کیا کہہ رہا تھا، گلا کتنا عرصہ اسی طرح رہے گا؟" ہم نے اپنی خوشی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔

"تمھیں شرم آنی چاہیے۔۔۔ میری طبیعت خراب ہے اور ہلکا ہلکا ٹمپریچر بھی ہے۔"

کہا: "طبیعت کی بات تو ٹھیک ہے ہلکا ہلکا ٹمپریچر تو تمھیں سارا سال رہتا ہے۔"

"تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

جس دن غزل برائے تنقید ہو اس کی عید ہوتی ہے تاہم اس کی صدارت ہو تو دیگر احباب کی۔ غزل پر گفتگو کا آغاز ہمیشہ روایت اور فن سے کرتا ہے اور ہر شعر پر اسی مضمون کا شعر بھی ضرور کوٹ کرتا ہے، چاہے وہ روایت میں موجود ہو یا نہ ہو۔ اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھتا ہے اور دلیل کے طور پر کہنا نہیں بھولتا کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ کبھی قائل نہیں ہوتا، ہمیشہ دوسروں کو قائل کرتا ہے اور اگر کوئی قیل وقال کرے تو حال حال کر کے ہال سر پر اٹھا لیتا ہے۔ اپنی رائے سب سے آخر میں دے کر فریقین کی رائے یکسر مسترد کر دیتا ہے یا پھر اسی رائے سے کسی ایک فریق کو خوش کر دیتا ہے۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم "فن کار" میں "عرصہ گاہ" کی ترکیب استعمال کی۔ کسی نے اس ترکیب پر اعتراض کیا تو ساحر نے ایک صاحب کی معرفت علامہ تاجور نجیب آبادی سے استفسار کیا۔ علامہ تاجور نے کہا: "اگر کسی دوست نے استعمال کی ہے تو درست ہے، اگر کسی دشمن نے لکھی ہے تو غلط ہے، میں دونوں طرح سے ثابت کر سکتا ہوں۔" اس فن میں موصوف، علامہ تاجور نجیب آبادی کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

جس نگاہ سے دوسروں کے فن پارے دیکھتا ہے، کاش اپنے بھی اسی نگاہ سے دیکھے، اپنا صرف وہی فن پارہ اس نگاہ سے دیکھتا ہے جو تنقید کے لیے پیش کرنا ہو، پھر دورانِ تنقید احباب "ضیاء" کے ہوتے ہوئے ناک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں اور اس دنگل میں بعض تو اس فن پارے کو کھولنے کے بجائے ایسا "ٹائیٹ" کر دیتے ہیں کہ موصوف خود بھی کیا کرتے ہوں گے۔

بہ یک وقت کئی کتابیں اس کے زیرِ مطالعہ ہوتی ہیں، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور موازنہ اس کے ہتھیار ہیں، جنھیں ہر وقت تیز کرتا رہتا ہے۔ باریک سے باریک نکتہ بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ دلیل سے ذلیل کرتا ہے۔ ہمارے مسودے میں ایک جگہ "غور وخوص" لکھا نظر آیا تو اس پر کافی دیر غور وخوض کرنے کے بعد ڈرائنگ روم سے تشریف لے گئے، واپسی ہوئی تو چہرے کی مسرت چھپائے نہیں چھپتی تھی، "ایڈیٹ! میں تین لغات دیکھ کر آیا ہوں کہیں پر بھی 'غور وخوص' موجود نہیں، تمھیں شرم آنی چاہیے ایسی غلطیاں کرتے

ہوئے۔ ’’ویسے شرم تو تمھیں بھی آنی چاہیے کہ اس لفظ کو دیکھنے کے لیے تمھیں لغت کا سہارا لینا پڑا۔ بات لغت کی نہیں میں تمھارے معاملے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔

بنیادی طور پر تنقید کے تین دبستان ہیں، جب کہ موصوف نے ایک چوتھے دبستان کی بنا رکھی ہے جسے ’’طنزیاتی تنقید‘‘ کہہ سکتے ہیں۔ بقول موصوف تنقید کوئی بھی ہو سیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس بات سے تو ہمیں بھی اتفاق ہے ہم نے احباب کو اس کی تنقید کے بعد سبق سیکھتے دیکھا ہے۔ ایسی تنقید کے بعد لوگ طبع آزمائی سے گریز کرتے ہیں اور اس طرح معیاری ادب کو فروغ ملتا ہے۔

دیباچہ لکھنے میں تو اس کا کوئی ثانی ہی نہیں، دور دور تک موصوف کے اس فن کی دھوم ہے۔ اس کے دیباچوں کا تو مجھ سا کافر بھی منکر نہیں، ویسے اسے خود بھی اس کا احساس ہے۔ بعض دیباچوں میں تو کتاب کے ساتھ ساتھ شاعر بھی کھول کے رکھ دیتا ہے، پڑھتے ہی پتا چل جاتا ہے کہ شاعر کتنے پانی میں ہے اور شاعری کتنے قیراط کی ہے، شاید اسی باعث اپنی کتاب پر خود دیباچہ تحریر نہیں فرمایا۔ اسی سلسلے میں عزیزی محمود ساجد کی کتاب کا مسودہ آیا تو گویا ہوئے: ’’یار بہت مصروف ہوں، ڈرائیونگ سیکھ رہا ہوں، تنقید کر رہا ہوں یا شاید کہہ رہے تھے کہ تنقید سیکھ رہا ہوں، ڈرائیونگ کر رہا ہوں، تین کتابیں پہلے سے رائے کے لیے پڑی ہیں، پرچیں ہو رہی ہیں، پیپر مارک کر رہا ہوں، بچے کا داخلہ کرانا ہے، خط بنوانا ہے، بال کٹوانے ہیں، نہانا ہے، بہت مصروف ہوں۔ تین چار مہینے لگ جائیں گے۔‘‘ جواب آیا جو بھی ہے آپ نے ہی لکھنا ہے۔۔۔ اور یوں ضیا کی رائے، کشمیر کی رائے شماری ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے اپنے مقالے کے دو باب دیے تو صاف صاف کہہ دیا: ’’بھائی! صرف دیکھنے ہیں، دیباچہ نہیں لکھنا۔‘‘

سیدھی سادی بات کو گھما پھرا کے یوں بیان کرنا کہ سننے والا گھوم جائے، فلسفہ کہلاتا ہے، ہماری اس تعریف کی رو سے موصوف فلسفی بھی ہیں۔ حلقہ ہو یا حلقۂ یاراں احباب آئے روز موصوف کے اس فن سے مستفید ہوتے ہیں۔ عصمت حنیف کی کتاب ’’نیلی نیند کے سپنے‘‘ کی تقریبِ پذیرائی میں فرمایا: ’’عصمت بہت Keen Observer ہے۔‘‘ لہجہ اور اسٹائل ایسا تھا کہ مجھ سمیت کئی احباب نے سنا: ’’عصمت بہت کینہ پرور ہے۔‘‘

اکادمی ادبیات نے یوتھ مشاعرے کا انعقاد کیا تو عمر کی حد چالیس برس رکھی گئی، پتا چلا کہ موصوف بھی چالیس سے کم کے ہیں، کال ملائی: ’’ہیلو! آپ کی عمر کیا ہے؟‘‘

’’ہوں۔۔۔ یعنی آپ ابھی چالیس کے نہیں ہوئے؟‘‘

’’نہیں‘‘

"شرم آنی چاہیے تمھیں!"

"کیوں؟"

"کہ ابھی تک چالیس کے نہیں ہوئے۔"

ہومیو پیتھک کمپاؤنڈر بھی ہے، ویسے طبیعت ایسی ہے کہ ہومیو ڈاکٹر ہو بھی جاتا تو کہلانا پسند نہ کرتا، کہ اس کی "سرجن" جیسی طبیعت پر "ہومیو ڈاکٹر" کا سابقہ لگا نہیں کھاتا۔ چھیڑ دیں تو چھڑ جاتا ہے۔ اپنی غلطی کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ شاعر نہ ہوتا تو صحافی ہوتا۔ چائے، سگریٹ، نسوار اور تنقید پہ چلتا ہے، دلوں کے بھید ربّ جانتا ہے شاید ملامتی صوفی بھی ہو، ویسے صوفی کو صرف صوفی ہونا چاہیے ۔۔۔ ہر کام میں پراعتماد نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی کبھار پری شان اور اکثر اوقات پریشان، الجھا الجھا اور دباؤ کا شکار نظر آتا ہے۔

والدِ گرامی اور لختِ جگر نقش معین کو یاد کرتا ہے، کبھی کبھی بیگم سے ڈرتا ہے، اولاد سے پیار کرتا ہے لیکن بیٹیوں کے لیے شاعر کا دل اور بیٹے کے لیے ناقد کا دماغ رکھتا ہے۔ گھر میں شوہر سے زیادہ شاعر اور باہر شاعر سے زیادہ ناقد ہوتا ہے، مزید گھر میں ادیب بروزنِ شریف بن کے رہتا ہے، ویسے اس پر پیار آتا ہے کہ ایسا منہ پھٹ اور بے لحاظ آدمی کچھ بھی ہو سکتا ہے گھر داماد اور زن مرید نہیں۔

تخلیق، تنقید اور شعر اس کی شخصیت کے تین حصے ہیں، باقی ماندہ سارا ضیا، یا ساری ضیا، چوتھے حصے میں ہے۔

ضیاء، روشنی ہے اور روشنی رنگوں کا مجموعہ، سو کہیں شاعر، نثر نگار ہے تو کہیں ناقد اور محقق۔ کبھی فلسفی لگتا ہے تو کبھی صوفی، کہیں استاد ہے تو کہیں یاروں کا یار، یہی اس کے رنگ ہیں۔ رنگوں کی یہ بہار دیکھنی ہو تو اس "ضیاء" کو دل کے پرزم (Prism) سے گزار کر دیکھیں قوسِ قزح میں یہ رنگ نظر آئیں گے، بس "پرزم" کا صاف اور مخصوص زاویے پر ہونا شرط ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

اروں کمار جین

ہندی زبان سے ترجمہ: تنویر غلام حسین

پتھریلی حقیقت

اُس کے سائٹ پر پہنچتے ہی ہل چل مچ گئی۔

سلام سر، بڑے صاحب سلام، بابو جی رام رام جیسے کلمات کام کرنے والوں کے منہ سے ادا ہو رہے تھے اور مسکراتا ہوا سب کا سلام قبول کر رہا تھا۔

”گڈ مارننگ سر“

ٹھیکے دار کے منشی نے انگریزی کے ذریعے اپنی اہمیت جتانی چاہی۔

گڈ مارننگ سُریش! ابھی تک کام شروع نہیں کیا؟

”بس سر! آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا، سبھی تیار ہیں۔ رام کلی! جلدی چائے بناؤ سر جی کے لیے، ملائی ڈال کر۔“

سُریش خدمت کا اظہار ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

وہ سائٹ پر انجینئر تھا۔ ایک بہت بڑے پلانٹ کا کام ہو رہا تھا۔ کام کو مکمل کرنے کی تاریخ مقرر کی جا چکی تھی۔ کافی تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ وہ صبح صبح سائٹ پر آ جاتا اور سارا دن خوب محنت کرتا، دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتا اور رات کو گھر پہنچتا۔ اُس کے کام کی رفتار سے سبھی مطمئن تھے۔ معائنہ کے لیے آنے والے آفیسر اُسے تعریفی سند بھی دے چکے تھے۔

”سر! چائے“

رام کلی اُس کی پسندیدہ چائے لے آئی تھی۔ ٹرے میں کپ پلیٹ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔

”ارے بہت جلدی چائے بنائی تم نے“

روزانہ کی طرح اُس نے رام کلی کی تعریف کی۔

رام کلی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں پلکوں کا جال گرا دیا، ہلکے سے گردن جھکائی اور تھوڑا سا مسکرا دی جیسے کوئی بچہ اپنی تعریف سُن کر شرماتا ہوا مسکرا دیتا ہے۔

”سُریش تم مشین چلانی شروع کرو“

یہ کہہ کر وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا

”جی سر“

سُریش نے کہا اور چلا گیا۔

رام کلی اسی طرح سر نیچے کیے چُپ چاپ کھڑی تھی۔

مکسر چلنے لگا۔ لیبر، سمنٹ گٹی اور ریت لا لا کر ڈال رہی تھی اور کنکریٹ بنتا جا رہا تھا۔ وہ ضروری احکامات دے کر کام کرواتا رہا۔

”گڈ مارنگ سر!“

ایک سجیلے نوجوان نے موٹر سائیکل سے اترتے ہوئے سلام کیا۔

”گڈ مارنگ ارورا، کیا حال ہے؟ آج لیٹ کیسے؟

”فضل ہے سر، آج تھوڑی دیر ہو گئی ہے میں پہلے کولھو گیا وہاں سے بھٹے پر ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔ دراصل راستے سے بڑے صاحب کے لیے کچھ سامان لینا تھا۔“

ٹھیکے دار نے تفصیلی وضاحت دی۔

”ٹھیک ہے ارورا صاحب! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا آپ تو مکمل ایکسپلینیشن دینے لگے ہیں۔“

ارورا صاحب تھوڑا جھینپ کر مسکرا دیے۔

”جسٹ ابھی آیا سر“

ارورا اپنی گاڑی کو کِک لگاتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہاں ہو کر آؤ۔“

ارورا جیسے ہی سوڑ تک پہنچا، روز کی طرح سُریش نے اُس کی گاڑی لے کر اسٹینڈ پر کھڑی کی اور پھر اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔

”رام کلی! باس کے لیے چائے بناؤ لیکن پہلے پانی لانا۔“

سُریش نے رام کلی کو حکم دیا اور باس کو صبح سے اب تک کی پیش رفت بتانے لگا۔ وجے ارورا سب کچھ سمجھ رہا تھا۔

”مالک چائے“

رام کلی چائے اور پانی لے آئی۔ یہ چائے پہلے والی سے الگ تھی۔ اس میں پتی زیادہ اور چینی کم تھی۔ رام کلی کو ٹھیکے دار کی پسند کا علم تھا۔

''ٹھیک ہے، سُریش! تم دیکھ کیا ٹرک آ رہے، میں، گٹی ناپ لینا، ناپ کر ہی اُنھیں رسید دینا۔

''او کے باس''

سریش کہہ کر چلا گیا۔

رام کلی چائے لیے کھڑی تھی۔

''رکھ دو رام کلی! تمھیں چائے بنانے کے لیے کہا ہے اُسے لے کر کھڑے رہنے کی سزا تھوڑا ہی دی ہے۔۔۔لاؤ پہلے چائے ہی پی لیتے ہیں۔''

ارورا نے کہہ کر چائے کا پیالہ اُس سے لے لیا اور چسکیاں لینے لگا۔

واقعی تمھاری چائے کا جواب نہیں رام کلی، پچھلے جنم میں ضرور تم چائے کی کسی کینٹین کی مالکن رہی ہو گی۔ وجے نے تعریف کی۔

رام کلی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں پر پلکیں گرائیں۔ گردن کو تھوڑا جھکایا اور جھینپتے ہوئے ہلکے سے مسکرا دی۔

''ارے کبھی کچھ بولا بھی کر، جواب دیا کر''

وجے نے روز کی طرح اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ بھی روز کی طرح اُسی انداز میں کھڑی رہی۔

چائے پی کر اُس نے پیالہ رکھا اور رام کلی خالی پیالہ ٹرے میں رکھ کر چلی گئی۔

''کیا چیز ہے۔۔۔'' وجے بڑبڑایا۔

بالکل خاموش رہنے یا بہت کم بولنے والی، سانولی سی، تیکھے نین نقش والی رام کلی دوسری مزدور عورتوں سے بہت مختلف تھی۔ نہ بھڑکیلا بھونڈا سنگھار اور نہ مست کر دینے والے اشارے، نہ لڑائی جھگڑا اور نہ ہی پیسے کا لالچ، رام کلی کی شخصیت باوقار تھی، اُس کی عمر اٹھارہ بیس کے آس پاس ہو گی باپ بچپن میں ہی مر گیا تھا گھر میں سوائے ماں اور ایک بھائی کے کوئی نہ تھا۔ تینوں افراد محنت کرتے تھے۔ ریش (بھائی) چوکیداری کرتا تھا۔ وہ ڈرائیوری بھی جانتا تھا۔ ماں گھر پر لفافے بناتی تھی اور رام کلی سائٹ پر کام کرتی تھی۔ اُس کی مختلف شخصیت اور ایمان داری کے گُن کو دیکھ کر ہی سائٹ والوں نے اُسے باورچی خانے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ وہ کسی کام کے لیے منع نہیں کرتی تھی۔

وجے کا دل رام کلی پر آ گیا تھا۔ عام ہوس سے ہٹ کر وہ کچھ اس طرح سوچتا کہ وہ اُس کو لے کر گھومے، چھوٹی موٹی سی رام کلی کے رخساروں کا لمس محسوس کرے، اُس کی موہنی مسکراہٹ کا لطف اٹھا لے۔ لیکن رام کلی کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں تھا۔ ایک دفعہ وجے نے اُس کا ہاتھ تھاما اور کہا، ''چل تجھے گما کر

لاتے، ہیں''

لیکن رام کلی آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر چلی گئی تھی۔

وہ جیسے سوچ رہا تھا کہ شاید اگلے دن وہ کام پر نہ آئے لیکن دوسرے دن رام کلی سائٹ پر موجود تھی۔ تبھی سے وہ کشمکش میں رہتا ''یہ کیسی لڑکی ہے؟ ہاں بھی نہیں۔۔۔۔اور ناں بھی نہیں۔۔۔''

دوپہر کا وقت تھا۔ انجینئر صاحب اپنے آفس میں تھے۔ ٹھیکے دار سائٹ سے دوسرے کاموں کو نکل گئے تھے اور سائٹ کا کام منظم انداز میں چل رہا تھا۔ سُریش صبح سے چیختا چلاتا اب کافی تھک گیا تھا انجینئر صاحب ٹھیکے دار، مزدور، بڑھائی اور مستری ساری لیبر کو الگ الگ انداز سے ڈیل کرنا پڑتا ہے۔ کہیں کوئی چوک ہوگئی تو گالیاں پڑنے کا ڈر، ٹھیکے دار کا نقصان تو نوکری جانے کا ڈر اور اگر کام میں خرابی تو انجینئر کی چار باتیں سُننا، پھر بھی سُریش یہ سب بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کر رہا تھا۔

''ارے رام کلی مجھے بھی چائے پلادے''

کچھ لمحے راحت پانے کے لیے سُریش سائٹ آفس میں داخل ہوا۔ یہیں بیٹھ کر وہ پورا دن سب کچھ سنبھالتا تھا پورے تیس دن کڑی محنت کرنے کے بعد ٹھیکے دار سے دوہزار روپے اُسے ملتے تھے۔ یہ اُس کی خون پسینا ایک کرنے کی قیمت تھی۔

''بابو چائے''

رام کلی چائے لے کر آئی اور ساتھ دو پراٹھے بھی تھے۔ سریش اس وقت چائے کے ساتھ پراٹھے بھی لیتا تھا۔ اُس کی چائے میں پتی اور چینی تیز ہوتی تھی۔

''رام کلی تمھاری چائے بھی تمھاری طرح بہت میٹھی ہے۔''

سریش نے رام کلی کی تعریف کی۔ اور رام کلی نے ایک دفعہ پھر پلکوں سے بڑی بڑی آنکھیں ڈھک لیں اور گردن کو تھوڑا جھکا کر ہلکے سے مسکرادی۔ سُریش رام کلی کا دیوانا تھا۔ اُس کے تیکھے نین نقش، کومل انداز، ایسے لگتا کسی راج کماری نے جھونپڑے میں جنم لے لیا ہو۔ سُریش موقع ملتے ہی رام کلی سے باتیں کرنے لگتا لیکن رام کلی کے جواب میں سوائے خاموشی، ہوں ہاں یا پھر پلکوں کا آنکھیوں پر گرنا تھا۔ سُریش رام کلی سے انجینئر اور ٹھیکے دار کو بھی باتیں کرتا ہوا دیکھتا تھا۔ لیکن اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ رام کلی کسی کو گھاس نہیں ڈالتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے دل میں رام کلی کی عزت اور بڑھ گئی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ اگر رام کلی ہاں کہہ دے تو وہ اس کے ساتھ اپنا گھر بسا لے گا۔

شریف، نیک دل، معصوم اور خوب صورت۔ ہمیشہ کام میں مصروف رہنے والی اور کم بولنے والی،

اس سے اچھا کسی کی زندگی میں اور کیا ہوتا ہے۔ لیکن رام کلی تو عجب مٹی کی بنی تھی نہ ہاں، نہ ناں۔۔۔ چائے پی کر وہ اپنے دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

ٹھیکے دار کے سائٹ آفس کے پاس سناٹا تھا۔

“بابو جی۔۔۔۔بابو جی!”

“بابو نہیں ہے۔۔۔”

اس سے پہلے کہ شیام لال اندر کے کمرے میں جاتا رام کلی نے باہر نکل کر اُسے کہا۔

“کہاں گئے ہیں؟”

“شہر سامان لانے”

اُسی طرح پُرسکون انداز میں رام کلی نے کہا۔

شیام لال کو معلوم تھا کہ نریش بابو نہیں ہے، اسی لیے تو موقع ملتے ہی وہ بھی رام کلی سے دو باتیں کرنے آیا تھا۔

“رام کلی! بہت پیاس لگی ہے پانی پلا دے”

گہری سانس بھرتے ہوئے شیام لال بولا۔ رام کلی نے ایک لوٹا پانی کا لا کر اُسے دے دیا۔

“میں کل شہر جاؤں گا رام کلی!۔۔۔تیرے لیے کچھ لاؤں؟” شیام لال نے آواز کو میٹھا بناتے ہوئے کہا۔

“نہیں”

وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔

“ارے تو ہمیں کیوں گھاس ڈالے گی، ترے تو بڑے بڑے دیوانے ہیں۔”

رام کلی کے کانوں میں اُس کے اندر تک پگلا دینے والے الفاظ پڑے لیکن اُس کے چہرے کی رنگت تبدیل نہ ہوئی۔

لنچ کے بعد انجینئر صاحب پھر آئے۔ رام کلی روز اسی وقت اُن کی چائے تیار کر کے رکھتی تھی۔ یہ بھی رام کلی کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ چوں کہ عہدے اور ساکھ میں اوپر تھے یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی لفظ زبان پر نہیں لائے لیکن اُن کی خواہش رہی کہ رام کلی سامنے بیٹھے، ہنسے باتیں کرے، وہ اس کی انگلیوں کا مست کر دینے والا لمس محسوس کریں۔

“رام کلی! چھٹی کب جائے گی؟”

”ابھی نہیں بابو جی۔“

کیا وجے بابو پیسے کاٹتے ہیں؟ مجھے بتاؤ۔“

انجینئر صاحب نے اپنا اختیار جتا کر ہمدردی ظاہر کرنی چاہی۔

رام کلی نے گردن ہلا کر پلکیں جھکا لیں۔ اتنے بڑے صاحب سے بھلا وہ اپنے ٹھیکے دار کی شکایت کیوں کرتی۔

”ارے کبھی کبھار گھوم آیا کرو۔ میں وجے سے کہہ دوں گا تیرے پیسے نہیں کاٹیں گے۔“

یہ کہہ کر انجینئر نے رام کلی کا کندھا تھپتھپایا۔ لیکن وہ بغیر کسی تاخیر کے، خالی کپ لے کر اندر چلی گئی۔

رات کو جب رام کلی ماں کے پاس لوٹی تو اُس کی ماں سو چکی تھی لیکن رام کلی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ انجینئر بابو، ٹھیکے دار جی، ہریش بابو، شیام لال اور بہت سے چہرے اُس کے دماغ میں اُبھر رہے تھے۔ اُسے سبھی کے الفاظ ایک ایک کر کے سنائی دے رہے تھے۔

رام کلی جب چھوٹی تھی تبھی اُس کی ماں بیوہ ہو گئی تھی۔ اکیلی ماں کے سر پر دو اولادوں کی ذمہ داری تھی اور گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اُس کی ماں نے لوگوں کے گھروں مزدوری کی لیکن اتنے کم پیسوں سے کیا گزارا ہوتا، پھر سائٹ پر بھی کام کیا اِن پیسوں سے پیٹ کی روٹی تو ملتی لیکن وقت ضرورت بچوں کی دوا، سکول کی فیس اور تہوار وغیرہ کے لیے جب بھی پیسوں کی ضرورت پڑتی اُسے بکنا پڑتا۔ اُس کی ماں اُس وقت کس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ کبھی کوئی ٹھیکے دار، کبھی کوٹھی کا مالک، کبھی بستی کا دادا، کبھی پولیس کا آدمی، اُس کی ماں نے کس کس کا ظلم نہیں سہا، دن بھر سب کچھ سہہ کر رات کو اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر وہ پھوٹ پڑتی تھی۔

”بیٹے ہم سے اچھے تو جانور ہیں۔ اُن کو کوئی بُرا بھلا نہیں کہتا۔۔۔ لوگ کھانے کو دو روٹی تو دیتے ہیں۔۔۔ ہمیں تو ایک ایک دن کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

رام کلی سب سمجھتی تھی لیکن وہ بے چاری بے بس تھی، ماں کی حالت دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں خوف سما جاتا۔ ایک نئی بات، نامعلوم، ناپسندیدہ۔۔۔ اسی خوف سے وہ پریشان ہو جاتی۔ اُس نے خوب پڑھنے کی کوشش کی، لیکن سکول کی فیس، کتابیں، یونیفارم کے پیسے اور اوپر سے گھر کے کام، ان سب سے وہ لڑ نہ سکی اور آٹھویں پاس کر کے وہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔

ماں اپنی بیٹی کو بہت جتن سے سنبھال کر بڑا کر رہی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ جس طرح اُسے نوچا کھسوٹا

گیا اُسی طرح رام کلی کو بھی کسی کے ہاتھوں لُٹنا پڑے۔ اسی لیے وہ اُسے سمجھاتی رہتی تھی۔

لیکن رام کلی تو ضرورت سے زیادہ سمجھ دار نکلی، سب دیکھ سُن کر اُس کا دل پتھر کا ہو گیا تھا کسی کی بات کا اُس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اگر کبھی اُس کا دل ڈولتا بھی تو وہ اُن چہروں میں ماں کو ستانے والوں کے چہرے دیکھنے لگتی پھر وہ اور زیادہ محتاط ہو جاتی۔ رات کو وہ ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتی وہ تھوڑی بہت سلائی بھی سیکھ گئی تھی، اُس کی خواہش تھی کہ پیسے جوڑ کر سلائی مشین خرید لے جس سے وہ گھر میں ہی کپڑے سیا کرے اور باہر کے ہزاروں لوگوں کی زہریلی نظروں، تیکھے جملوں اور شہد ملے میٹھے تیروں کا شکار ہونے سے بچ جائے گی۔ لیکن ضرورت پڑنے پر جڑے ہوئے پیسے بھی ختم ہو جاتے لیکن پھر بھی اُس نے ہار نہیں مانی تھی ۔۔۔ نہ ہی کسی صاحب یا بابو کے سامنے ہاتھ پھیلائے تھے ایک بار ہاتھ پھیلا کر زیادہ لینے کا المناک پھل وہ ماں کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔

سب نے اُسے ضرورت کے وقت پیسے لینے کو کہا۔۔ لیکن بچپن سے اس پتھریلی حقیقت کو برداشت کر کے بڑی ہونے والی رام کلی پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ ایک آدھ بار اُس نے سوچا بھی کہ ہزار پانچ سو قرض لے لے بعد میں ادا کر دے گی لیکن قرض سے ملی کامیابی کی خوشی وہ حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی نا ہی وقت پر پیسہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہونے والے حشر کو برداشت کرنے کے لیے وہ تیار تھی۔ اسی لیے روزانہ اپنا اٹل فیصلہ دہراتی اور زیادہ محنت سے کام کرتی۔

ابھی تک رام کلی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی وہ آہستہ سے اُٹھی، پرسکون انداز میں سوئی ماں کو دیکھا، بھیا بھی کونے میں سو رہا تھا۔ رام کلی نے آہستگی سے جا کر اپنی گُلک اُٹھائی اور اُسے کھولا، ڈھیروں چھوٹے چھوٹے نوٹ اور سکے بکھر گئے، رات کے سناٹے میں وہ انھیں تہہ کر کے گننے لگی، پورے نو سو پچاس (۹۵۰) روپے اُس کے پاس تھے۔ اتنے میں تو وہ سلائی مشین خرید سکتی ہے، سو دو سو اگلے مہینے دے دے گی۔ اُس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ اگر ماں اور بھیا کی نیند کھل جانے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ خوشی سے چیخنے لگتی۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا اُٹھے۔

اُس نے فوراً پیسے سمیٹے، انھیں اچھی طرح سے رکھا اور جا کر ماں سے لپٹ گئی تھوڑی ہی دیر بعد رام کلی گہری نیند سو رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر سکون، کامیابی حاصل کرنے کے بعد کا احساس اور اطمینان واضح جھلک رہا تھا۔

☆☆☆☆

رائے بریڈبری
انگریزی سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

دنیا کی آخری رات

“تم کیا کرتی اگر تمھیں معلوم ہوتا کہ یہ دنیا کی آخری رات ہے؟”

“میں کیا کرتی؟ تمھارا مطلب ہے۔ سچ میں۔”

“ہاں، میں سنجیدہ ہوں۔”

“میں نہیں جانتی، میں نے کبھی سوچا نہیں۔” اس نے چاندی کے کافی دان کا ہینڈل اس کی جانب موڑتے ہوئے کہا اور دو پیالے میز پوش پر رکھ دیے۔

اس نے کافی ڈالی۔ اس کے پیچھے اطاق کے ایک چھوٹے قالین کے ٹکڑے پر سبز لالٹین کی روشنی میں دو ننھی بچیاں بلاکز کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ شام کی ہوا میں کافی کی خوش کن اور دل آویز مہک شامل ہوگئی تھی۔

“اچھا ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دو۔” اس نے کہا۔

“تمھیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔” اس کی بیوی نے کہا۔ اس نے سر ہلایا۔

“ایک جنگ۔۔” اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔

“ہائیڈروجن یا ایٹم بم بھی نہیں؟”

“نہیں”

“یا کہ جراثیم کش جنگ۔۔۔”

“ان میں سے کچھ بھی نہیں۔۔” اس نے آہستگی سے اپنی کافی کا لطف لیتے اور اس کی کالی تہہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

“چلو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کتاب کو بند کرنا۔”

“میں سوچتی نہیں، سمجھتی ہوں”

“نہیں اور حقیقتاً میں بھی نہیں۔ یہ صرف احساس ہے جو مجھے خوف میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی کبھار میں بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ بہت پُرسکون۔۔۔” اس نے لڑکیوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تو لالٹین کی

زورروشنی میں ان کے سنہرے بال چمک رہے تھے، اس نے اپنی آواز آہستہ کی اور بولا، ‘‘میں نے تمھیں کچھ بھی نہیں بتایا پہلی بار یہ چار راتیں پہلے ہوا تھا۔’’

‘‘کیا؟’’

‘‘ایک خواب۔۔۔ میں نے خواب دیکھا کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے اور ایک آواز نے کہا بھی کہ یہ ہو چکا لیکن اب مجھے وہ آواز یاد نہیں۔ لیکن ایک آواز تھی ضرور اور اس نے کہا تھا کہ یہاں زمین پر سب چیزیں ختم جائیں گی۔ میں نے اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔ جب میں دوسری صبح جاگا تو میں کام پر چلا گیا لیکن یہ احساس سارا دن میرے ساتھ رہا۔ میں نے Stan Millis کو دیکھا جو سہ پہر کے درمیانی وقت میں کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ‘‘تمھارے خیالات کو سلام ہے، Stan ’’اس نے کہا۔ ‘‘میں نے پچھلی رات ایک خواب دیکھا ہے۔’’ اور پھر اس نے مجھے اپنا خواب سنایا بھی۔ میں جان گیا کہ یہ کیا تھا؟ میں نے اسے بتایا ہوتا لیکن اس نے مجھے سنایا اور میں نے اسے سنا۔’’

‘‘کیا یہ ویسا ہی خواب تھا؟’’

‘‘ہاں، میں نے Stan کو بتایا کہ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ اسے حیرت نہ ہوئی۔ درحقیقت وہ پرسکون تھا۔ پھر ہم نے اس کو جاننے کے لیے آفس میں چہل قدمی جاری رکھی۔ یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا۔ ہم نے نہیں کہا کہ آؤ ٹہلیں۔ ہم نے اپنی جانب سے چلنا جاری رکھا اور ہر جگہ ہم نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے ڈیسکوں کو غور سے دیکھ رہے تھے یا اپنے ہاتھوں کو یا کھڑکیوں سے باہر۔ وہ اس کو دیکھ ہی نہیں رہے تھے جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ان میں سے کچھ سے میں نے بات کی اور کچھ سے Stan نے۔’’

‘‘اور ان سب نے بھی خواب دیکھا تھا کیا؟’’

‘‘ہاں ان سب نے بھی۔ ایک جیسا خواب، جس میں کوئی فرق نہیں۔’’

‘‘کیا تم خوابوں پر یقین رکھتے ہو؟’’

‘‘ہاں، لیکن میں اس کے بارے میں زیادہ اعتقاد نہیں رکھتا۔’’

‘‘اور یہ کب ختم ہوگا؟ میرا مطلب ہے دنیا۔۔۔’’

‘‘کبھی ہمارے لیے رات کے دوران اور پھر جیسے ہی رات دنیا کے ارد گرد گھومتی ہے۔۔۔ وہ گردش کرتے حصے بھی اسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ اس تمام کو مکمل ہونے میں کوئی چوبیس گھنٹے ہی لگیں گے۔۔۔’’

وہ بغیر اپنے کافی کے پیالوں کو چھوئے کچھ دیر کے لیے بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے آہستگی سے اس کو

اٹھایا اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے پیا۔

‘‘کیا ہم یہ حق رکھتے ہیں؟’’ اس نے کہا۔

‘‘یہ حق رکھنے یا نہ رکھنے کا معاملہ نہیں ہے، یہ صرف وہ چیزیں ہیں جو کام نہیں کرتیں۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ تم ان کے متعلق بات تک نہیں کرتی۔ آخر کیوں؟’’

‘‘مجھے اندازہ ہے کہ اس کی ایک وجہ ہے۔’’ اس نے کہا۔

‘‘ویسی ہی وجہ جیسی کہ دفتر میں ہر بندے کو ہوتی تھی۔۔۔؟’’

اس نے سر نفی میں ہلایا، ‘‘میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتی۔ یہ پچھلی رات کو ہوا ہے اور دوسرے بلاکز کی عورتیں بھی اس کے متعلق باتیں کر رہی تھیں، صرف ایک دوسرے کے ساتھ۔۔۔۔’’ اس نے شام کا اخبار اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ ‘‘خبروں میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہے۔’’

‘‘نہیں، ہر ایک جانتا ہے، تو اس کی کیا ضرورت ہے؟’’ اس نے اخبار لے لیا اور پہلے لڑکیوں کی طرف اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی کرسی کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

‘‘کیا تم خوفزدہ ہو؟’’

نہیں، بلکہ بچوں کے لیے بھی نہیں۔ میں نے ہمیشہ سوچا کہ میں موت سے خوفزدہ ہو جاوں گا لیکن نہیں۔’’

‘‘وہ خود وفائی کا احساس کہاں ہے، جس کے متعلق سائنس دان بہت باتیں کرتے ہیں؟’’

‘‘مجھے نہیں معلوم۔ تم کو اتنا پرجوش نہیں ہونا چاہیے جب یہ ہمیں معلوم ہو کہ چیزیں منطقی ہیں۔ یہ منطقی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں لیکن یہ سب کچھ ویسے ہی ہو سکتا تھا جیسے کہ ہم رہتے ہیں۔’’

‘‘ہم اتنے برے بھی تو نہیں رہے۔۔ کیا ہم رہے؟’’

‘‘نہیں اور اتنے زیادہ اچھے بھی نہیں۔۔ میں اس کو ایک مشکل تصور کرتا ہوں۔ ہم اپنے علاوہ کچھ بھی اتنے خاص نہیں ہیں جبکہ دنیا کا ایک بڑا حصہ اس طرح کی عجیب وغریب چیزوں میں مصروف ہے۔’’

لڑکیاں اپنے اطاق میں ہنس رہی تھیں جیسے انھوں نے ان کی جانب ہاتھ ہلائے اور ان کے بلاکز کا گھر نیچے گر گیا۔

‘‘میں نے ہمیشہ یہ تصور کیا کہ لوگ گلیوں میں چیخ رہے ہوں گے جب بھی اس طرح کا وقت ہوگا۔’’

‘‘میرا اندازہ ہے کہ نہیں۔ تم حقیقی چیزوں کے بارے میں کراہتے ہو۔۔۔’’

‘‘کیا تم جانتی ہو۔ میں کسی چیز کو نہیں کھوؤں گا سوائے تمھارے اور ان لڑکیوں کے۔ میں نے کبھی

بھی شہروں، آٹو زفیکٹریوں، اپنے کام یا کسی اور چیز کو ناپسند نہیں کیا سوائے تم تینوں کے۔۔۔ میں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کروں گا سوائے اپنے خاندان کے اور شاید موسمی حالات کی تبدیلی کو یا ٹھنڈے پانی کے اک گلاس کی جو گرم موسم میں ضروری ہوتا ہے یا آرام کے۔ حقیقت میں یہ سب بہت چھوٹی چیزیں ہیں۔ ہم یہاں پر اس طرح بیٹھ سکتے ہیں اور اس طرح بات کر سکتے ہیں۔‘‘

’’کیوں کہ کرنے کے لیے اور کچھ نہیں۔‘‘

’’یقیناً یہی بات ہے۔ اگر وہاں پر کچھ ہوتا تو ہم کر رہے ہوتے۔ میں تصور کرتا ہوں کہ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ ہر ایک نے صرف یہ جانا کہ پچھلی رات کے دوران وہ کیا کرنے جا رہے تھے۔‘‘

’’میں حیران ہوں باقی سب لوگ اب کیا کریں گے، اس شام کو یا آنے والے کچھ گھنٹوں میں‘‘

’’شو میں جائیں، ریڈیو سنیں، ٹی وی دیکھیں، تاش کھیلیں، بچوں کو بستر پر سلا دیں خود بھی بستر پر سو جائیں جیسے کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔‘‘

’’جس طرح کسی چیز پر فخر کیا جاتا ہے۔۔۔۔ جیسے کہ ہمیشہ کیا جاتا ہے۔‘‘

’’ہم سارے برے نہیں ہیں‘‘

وہ ایک لمحے کے لیے بیٹھ گئے اور پھر اس نے کچھ اور کافی ڈالی۔

’’تم ایسا تصور کیوں کرتے ہو کہ یہ آج کی رات ہی ہے؟‘‘

’’کیوں کہ۔۔۔‘‘

’’کیوں نہیں، پچھلی صدی کی دس سالوں کی کوئی رات یا پانچ صدیاں پہلے کی یا دس۔۔۔؟‘‘

’’شاید یہ ہو کیوں کہ 30 فروری 1951 کبھی بھی نہیں آیا، اور نہ کبھی پہلے کی تاریخ میں لیکن اب یہ ہے اور یہی بات ہے کہ اس تاریخ کا مطلب کسی اور تاریخ سے بہت زیادہ ہے کیوں کہ یہ وہ سال ہے جب چیزیں ویسی ہی ہیں جیسی کہ ساری دنیا میں اور یہی وجہ ہے کہ یہ اس کا خاتمہ ہے۔۔۔‘‘

’’آج رات سمندر کے دونوں اطراف میں بمبار اپنے راستے پر ہیں جو کہ زمین کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔‘‘

’’یہ اس مقصد کا حصہ ہیں۔۔ کیوں؟‘‘

’’اچھا‘‘ اس نے کہا، ’’یہ کیا ہو گا؟ ڈشیں دھوؤ۔‘‘

انھوں نے احتیاط سے برتن دھوئے اور صفائی کے بعد ان کو رکھ دیا گیا۔ 8 بجکر 30 منٹ پر لڑکیوں کو بستر پر سلا دیا گیا اور شب بخیر کا بوسہ دے دیا گیا اور ان کے بستر کے ساتھ لگی ننھی روشنیوں کو گل کر دیا گیا اور

دروازے کو تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا گیا۔

’’مجھے حیرت ہوتی ہے۔‘‘ خاوند نے باہر آتے ہوئے اور پیچھے دیکھتے ہوئے کہا، ہاتھ میں سگار لیے وہ ایک لمحے کے لیے وہاں رکا۔

’’کیا؟‘‘

’’اگر دروازے کو ہر طرح سے بند کر دیا جائے یا اسے تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ ہم ان کو سن لیں جب بھی وہ ہمیں بلائیں۔‘‘

’’میں حیران ہوں اگر بچے یہ جانتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کو اس بارے میں بتایا ہے۔‘‘

’’نہیں، یقیناً نہیں۔۔۔ انھوں نے ہم سے یہ پوچھا تھا۔‘‘

وہ بیٹھ گئے اور اخبار پڑھنے لگے، آپس میں باتیں کیں، کچھ دیر ریڈیو کی موسیقی کو سنا اور پھر انگیٹھی کے ساتھ اکٹھے بیٹھ گئے اور سلگتے کوئلوں کو دیکھنے لگے۔ جیسے ہی کلاک نے ساڑھے دس بجائے، پھر گیارہ اور پھر ساڑھے گیارہ۔ انھوں نے دنیا کے دوسرے تمام لوگوں کے بارے میں سوچا جو اپنے اپنے انداز میں اپنی شام گزار چکے تھے۔

’’اچھا۔‘‘ اس نے آخر کار کہا۔ اس نے اپنی بیوی کو کافی دیر تک بوسے دیئے۔

’’جیسا بھی ہو، ہم ایک دوسرے کے لیے بہت اچھے ہیں۔‘‘

’’کیا تم رونا چاہتی ہو۔‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نہیں، میں ایسا نہیں سوچ رہی۔‘‘

انھوں نے اپنے گھر کا چکر لگایا، روشنیوں کو گل کیا، دروازے بند کیے اور پھر سونے کے کمرے کی جانب چلے گئے اور رات کے ملگجی اندھیرے میں برہنہ کھڑے ہو گئے۔ اس نے بستر پر سے چادریں اتاریں اور ان کو احتیاط سے تہہ کر کے ایک کرسی پر ڈال دیا جس طرح وہ ہمیشہ کرتی تھی اور باقی سارے کورز بھی پیچھے کی جانب دھکیل دیئے۔

’’چادریں بہت صاف ستھری اور عمدہ ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’میں بہت تھک چکی ہوں‘‘

’’ہم دونوں تھک چکے ہیں۔‘‘ وہ اپنے بستر میں گھس گئے اور لیٹ گئے۔

’’ایک منٹ ٹھہرو۔‘‘ اس نے کہا۔

اس نے اس کے اٹھنے کی آواز سنی اور وہ گھر کے پچھلی طرف چلی گئی اور پھر اسے جھولتے دروازے

کی مدھم آواز سنائی دی۔ ایک لمحے بعد وہ واپس آ چکی تھی۔

میں نے کچن میں پانی چلتا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے کہا: ”میں نے ٹوٹی بند کر دی ہے۔“

اس کے متعلق کچھ بھی کہنا مذاق تھا اور اس کو بھی ہنسنا پڑا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہنسی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس نے جو کہا ہے، کیا وہ اتنی مزاحیہ بات تھی۔ آخر کار انھوں نے ہنسنا بند کر دیا اور اپنے رات کے پرسکون بستر پر لیٹ گئے، ان کے ہاتھ ہاتھوں میں تھے اور سر جڑے ہوئے تھے۔

”شب بخیر ۔۔۔“ اس نے ایک لمحے بعد کہا۔

”شب بخیر“ اس نے آہستگی سے کہا، ”پیارے ۔۔۔“

☆☆☆☆

کیٹ شوپن
انگریزی سے ترجمہ: سعدیہ فیض

پچھتاوا

مزیل اورلی ایک اچھے اور مضبوط جسم کی مالک تھیں۔ سرخ و سپید گال، بھورے بال جو اب خاکستری مائل ہو رہے تھے اور پر عزم آنکھیں۔ وہ مردانہ ہیٹ پہن کر کھیتوں کا دورہ کرنے جاتی۔ جب کبھی ٹھنڈ ہوتی تو نیلا فوجی اوورکوٹ پہنتی اور کبھی کبھار ٹاپ بوٹ بھی پہن لیتی۔

مزیل اورلی نے کبھی بھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ بیس سال کی عمر میں اس کا ایک رشتہ آیا تھا جسے مزیل اورلی نے بلاتردد ٹھکرا دیا تھا۔ اب وہ پچاس سال کی ہو چلی تھی مگر کبھی اس بات کا پچھتاوا نہیں ہوا تھا۔

وہ دنیا میں بالکل تنہا تھی سوائے اپنے کتے مونٹو کے۔ کچھ حبشی تھے جو اس کے کیبن میں رہتے تھے اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اس کے پاس کچھ پرندے، گائیں اور خچروں کی ایک جوڑی تھی۔ ایک گن (جس سے وہ باز کا شکار کرتی تھی۔) اور کچھ مذہبی اعتقادات۔۔۔۔

ایک صبح کی بات ہے مزیل اورلی پُرخیال انداز میں ہاتھ سینے پر باندھے راہداری میں کھڑی تھی کہ اس نے ننھے بچوں کا ایک گروہ دیکھا۔ گویا وہ آسمان سے ٹپکے ہوں۔ وہ غیر متوقع اور حیران کن انداز میں اسی کی طرف آ رہے تھے۔ چناں چہ بن بلائے مہمانوں کے لیے اس کے دل میں کوئی پر جوش اور خیر مقدمی جذبات نہ تھے۔ وہ اس کی قریبی ہمسائی اودیل کے بچے تھے جو بہرحال کچھ ایسی قریبی بھی نہیں تھی۔

نوجوان خاتون کوئی پانچ منٹ کے بعد چار بچوں کے ہمراہ نمودار ہوئی۔ اس نے گود میں ننھی ایلوڈی کو اٹھایا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے بادلِ نخواستہ ٹیوم کو گھسیٹ رہی تھی۔ جب کہ مرسلین اور مرسلیٹ مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔

اودیل کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنسوؤں اور شدتِ غم سے اترا ہوا تھا۔ اس کی والدہ کی شدید علالت کے باعث کلیسائی حلقے سے اسے بلاوا آیا تھا۔ اس کا شوہر ٹیکساس میں رہتا تھا۔ اودیل کے نزدیک تو یہ لاکھوں میل کی دوری تھی۔ والسن اسے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے چھکڑا تیار کیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”اور تو کوئی بات نہیں مزیل اورلی آپ کو میرے واپس آنے تک میرے بچوں کو اپنے پاس رکھنا ہو

گا۔ خدا جانتا ہے کہ میں ان بچوں کو آپ پر نہ چھوڑتی اگر میرے پاس کوئی اور راہ ہوتی۔ انھیں قابو کر کے رکھنا اور کوئی چھوٹ نہ دینا۔ میں بچوں سے متعلق سخت پریشان ہوں لیون بھی گھر پر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے میری بے چاری ماں اس کے آنے تک زندہ نہ رہے۔" اس الم ناک اعلان نے اودیل کو حتمی طور پر اس رنجیدہ خاندان کو بحران میں چھوڑنے پر آمادہ کیا تھا۔

اودیل نے پورچ کے سکڑتے ہوئے سائے میں خاندان کے مجمع کو الوداع کہا۔ پرانے سفید تختوں پر سورج چمک رہا تھا۔ کچھ چوزے سیڑھیوں کے پاس گھاس کرید رہے تھے۔ ایک تو دلیری سے سنجیدہ اور بوجھل قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ آیا تھا اور راہداری میں بلا مقصد اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ فضا میں پھولوں کی خوشگوار مہک رچی ہوئی تھی اور کپاس کے کھلے ہوئے کھیتوں میں سے حبشیوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

مزیل اورلی کھڑی ہوئی بچوں کے بارے میں سوچ بچار کر رہی تھی۔ اس نے تنقیدی نظروں سے مرسلین کو دیکھا جو گول مٹول ایلوڈی کے بوجھ تلے لڑکھڑا کر چل رہی تھی۔ اس نے اسی طرح تولتی ہوئی نگاہوں سے مرسلیٹ کا جائزہ لیا جو اپنے خاموش آنسوؤں کو مینوم کی باغیانہ چیخوں کے ساتھ مدغم کر رہی تھی جو اپنے غم کے اظہار کے لیے با آوازِ بلند بھاں بھاں کر رہا تھا۔ غور و فکر کے ان لمحات میں مزیل اورلی خود کو مجتمع کر رہی تھی اور کوئی لائحۂ عمل مرتب کر رہی تھی جو فرائض کی بجا آوری کے لیے یکساں کارگر ہو۔

اُس نے بچوں کو کھانا کھلانے سے آغاز کیا۔ اگر مزیل اورلی کی ذمہ داریاں یہیں سے شروع ہو کر یہیں پر ختم ہو جاتیں تو وہ با آسانی عہدہ برآ ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اس کا نعمت خانہ اس اچانک پیدا شدہ صورتِ حال سے بخوبی نمٹ سکتا تھا۔ لیکن چھوٹے بچے کوئی چھوٹے جانور نہیں تھے۔ انھیں مسلسل توجہ اور محبت درکار تھی جو مزیل اورلی سے ملنا تو عبث تھی۔ اور نہ ہی اس کے لیے کوشش اور تیاری اُس کے بس کا روگ تھا۔

ابتدائی چند دنوں میں تو وہ اودیل کے بچوں کو سنبھالنے میں نالائق ثابت ہوئی۔ اورلی کو بھلا کیا معلوم کہ مرسلیٹ سے جب بھی بلند اور تحکمانہ لہجے میں بات کی جاتی تو وہ کیوں رونے لگتی تھی۔ یہ مرسلیٹ کی خصوصیت تھی۔ اسٹیفوم کے پھولوں کے جنون سے صرف اسی وقت واقفیت ہوئی جب وہ چنبیلی کے سارے پسندیدہ پھول یوں تو ڑلایا گویا اس نے پھولوں کے نباتاتی ڈھانچے اور نظام کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنا ہو۔

"مزیل اورلی آپ کو بتانے کے لیے میرے پاس کچھ ہے۔" مرسلین نے اسے ہدایات دیں۔ "آپ مینوم کو کرسی پر باندھ دیں۔ جب وہ مما کو تنگ کرتا تھا تو مما اسے کرسی پر باندھ دیتی تھی۔" مزیل اورلی نے جس پر مینوم کو باندھا تھا وہ کمرے میں رکھنے والی ایک بڑی اور آرام دہ کرسی تھی۔ وہ اس پر سہولت سے ہل جل سکتا تھا۔ مینوم نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور گرم ہوتی سہ پہر میں اونگھنے لگا۔

رات کو جب مزیل اورلی خشکار کر چوزوں کو ڈربے میں بند کر رہی تھی تو اس نے بچوں کو بستر پر جانے کے لیے کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھ آنے والے انداز میں اس کے سامنے کھڑے رہے کہ چھوٹے چھوٹے شب خوابی کے سفید لباس کا کیا کریں۔۔۔۔ پانی کا ٹب کس لیے ہے جو لا کر فرش کے وسط میں رکھا گیا تھا۔ مزیل اورلی نے ننھے ننھے، تھکن زدہ، دھوپ میں جلے ہوئے پاؤں دھو کر سب کو صاف ستھرا کیا۔ اس بات پر مرسلین اور مرسلیٹ خوش دلی سے ہنسنے لگیں کہ جو فارمولا مزیل اورلی نے تیار کیا ہے کیا اس کے مطابق ٹیموم بھوت پریتوں کی کہانیاں سنے بغیر اور ایلوڈی اپنا راگ الاپے اور بچھولے کھائے بنا سو جائیں گے۔۔۔۔

"میں بتائے دیتی ہوں آنٹی روبی!" مزیل اورلی نے اپنی باورچن کو اعتماد میں لیتے ہوئے اطلاع دی۔ "ان بچوں سے متعلق کوئی مجھ سے زیادہ ہمدردی اور مہربانی کی توقع نہ رکھے۔ ان چار بچوں کی نسبت ایک درجن کھیتوں کو سنبھالنا میرے لیے زیادہ آسان کام ہے۔"

"مجھے امید بھی نہیں ہے کہ آپ ان کے متعلق کچھ جان سکیں گی مزیل اورلی! میں تو بہت آسانی سے جان گئی تھی کل جب ان کو آپ کی چابیوں کی ٹوکری سے کھیلتے دیکھا۔ آپ کو نہیں معلوم کہ چابیوں سے کھیلنا بچوں کو بالغ اور سمجھدار بناتا ہے؟ یہ کسی مشکل بات کو سمجھنے کے مترادف ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو بچوں کی پرورش اور انتظام و انصرام کے لیے جاننا ضروری ہیں۔"

مزیل اورلی کے پاس یقیناً نہ ہی اس موضوع سے متعلق اتنی چھوٹی چھوٹی، سمجھ سے بالاتر اور ناقابلِ رسائی معلومات تھیں اور نہ ہی وہ جاننے کی خواہش مند تھی، جتنی آنٹی روبی کے پاس تھیں؛ جس نے اپنے وقتوں میں پانچ بچے پالے تھے اور چھٹا سپردِ خاک کیا تھا۔ بہر حال مزیل اورلی خوش تھی کہ حالات کے مطابق برتاؤ کرنے کے لیے اس نے ماؤں کے کچھ گُر سیکھ لیے ہیں۔

ٹیموم کی چپ چپی انگلیوں نے مزیل اورلی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا سفید ایپرن نکالے جو اُس نے مدتوں سے نہیں پہنا۔ اسے خود کو ٹیموم کے نم دار بوسوں کا عادی بنانا پڑا جو اُس کی محبت اور پرجوش فطرت کا اظہار تھے۔ اسے اپنی سلائی کڑھائی والی ٹوکری الماری کے اوپر سے اتارنی پڑی جو وہ شاذونادر ہی استعمال کرتی تھی۔ ٹوکری کو تیار حالت اور قابلِ رسائی جگہ پر رکھا کیوں کہ ٹوٹے بٹن ٹانکنے اور ادھڑی قمیصیں سینے کے لیے ہردم اس کی ضرورت رہتی تھی۔

مزیل اورلی کو گھر میں سارا دن گونجتی قلقاریوں، شریر چیخوں اور خوش کن آوازوں کا عادی بنانے میں کچھ دن لگے۔ یہ پہلی دوسری رات میں ہی نہیں ہو گیا تھا کہ وہ ایلوڈی کا گداز وجود ساتھ لپٹا کر سونے میں راحت محسوس کرتی تھی۔ اُس ننھی روح کی سانسیں اس کے رخساروں سے یوں ٹکراتی تھیں جیسے کسی پرندے

کے پرزمی سے پنکھا جھل رہے ہوں۔ دوسرے ہفتے کے اختتام تک مزیل اورلی مکمل طور پر ان معمولات کے سانچے میں ڈھل چکی تھی اور اب بچوں سے کوئی شکایت باقی نہیں تھی۔

یہ دوسرے ہفتے کا اخیر ہی تھا کہ ایک شام وہ دور کھرلیوں کی جانب دیکھ رہی تھی جہاں مویشیوں کو چارہ ڈالا جاتا تھا کہ اُس نے والسن کے نیلے چھکڑے کو سڑک کا موڑ کاٹتے دیکھا۔ اوویل ایک اور سواری کے ہمراہ سیدھی اور چوکس ہو کر بیٹھی تھی۔ جب وہ ذرا قریب ہوئے تو خاتون کا تمتماتا ہوا چہرہ اس بات کی عکاسی کر رہا تھا کہ اسے گھر لوٹنے کی بہت خوشی ہے۔

مگر اس غیر اعلانیہ اور غیر متوقع آمد نے مزیل اورلی کو ایک قسم کے غصے اور بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ تمام بچوں کو اکٹھا کرنا تھا۔ ''میوم کدھر ہے؟'' وہ ادھر چھجے کے نیچے پتھر پر اپنے چاقو کی دھار تیز کر رہا تھا۔ ''مرسلین اور مرسلیٹ؟''

وہ دالان کے ایک کونے میں گڑیا کے کپڑے کاٹ رہی تھیں۔ جہاں تک ایلوڈی کا سوال ہے وہ مزیل اورلی کی گود میں محفوظ تھی۔ ایلوڈی نے جانے پہچانے نیلے چھکڑے کو دیکھ کر خوشی سے چیخ ماری جو اس کی ماں کو واپس لے کر آ رہا تھا۔

تمام جوش و ولولہ سرد پڑ گیا تھا وہ سب اپنے گھر کو جا چکے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو گھر میں کتنا سناٹا چھا گیا تھا۔ مزیل اورلی انھیں جاتا دیکھنے کے لیے راہداری میں کھڑی ہو گئی۔ وہ زیادہ دیر تک چھکڑے کو نہ دیکھ سکی۔ غروب آفتاب کی سرخ روشنی اور نیلے اور سرمئی رنگ نے مل کر کھیتوں کے پار تک جامنی شفق کا غبار سا پھیلا دیا تھا اور سڑک کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چھکڑے کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور چرچراہٹ بھی زیادہ دیر تک سنائی نہ دے سکی۔ لیکن ایک مدہوشی کی سی کیفیت میں بچوں کی تیز پرشور اور پرمسرت آوازیں اب بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں۔

وہ گھر کے اندر پلٹی۔ بہت سا کام اس کا منتظر تھا۔ بچے اپنے پیچھے ایک بے ترتیبی اور اداسی چھوڑ گئے تھے۔ وہ ایک دم ہی چیزوں کو ترتیب دینے میں نہیں جت گئی۔ مزیل اورلی میز کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے سست روی سے کمرے میں نگاہ دوڑائی جس میں شام کے تاریک سائے رینگ آئے تھے اور اُس کے گرد تنہائی کا جال پھیلا رہے تھے۔ مزیل اورلی نے بازو کو گردن کے پیچھے خم کر کے اپنا سر اس پر گرا لیا اور رونے لگی۔ لیکن وہ اس طرح ہلکے ہلکے اور آہستگی سے نہیں رو رہی تھی جیسے عموماً خواتین کرتی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اشکوں نے اس کی روح کو اندر سے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اُسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ پونٹو اُس کے ہاتھ چاٹ رہا ہے۔

سامیعہ اتوت

انگریزی سے ترجمہ: محمد محمود

رکاوٹوں کے درمیان

وقت رک سا گیا تھا۔ میں نے اپنی شرٹ کی جیب سے ایک سگریٹ نکالی اور سلگائی۔ میں مسکراتے ہوئے مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”برائے مہربانی سگریٹ بجھا دیں۔ یہاں موجود آکسیجن ہمارے لیے کافی نہ ہو۔“ اس نے کہا۔

”کیا آپ اتنی خوفزدہ ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے، اور یہ جان کر میں بہت دکھی ہوں کہ کچھ دیر میں موت مجھے آ لے گی وہ بھی ایک خوبصورت حسینہ کے اتنے نزدیک۔۔۔“

”تم کتنے بدتمیز ہو!“ اس نے یہ کہتے ہوئے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

اس کو کپکپاتا دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرایا۔

اس کی بے چارگی دیکھ کر مجھے مزا آ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ میری کمینگی تھی۔۔۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا۔ میں اس سے خوش تھا۔ تاہم اس کے شانوں پر گرتی ہوئی خوبصورت زلفوں کو دیکھ کر میں نے اپنی سگریٹ بجھا دی۔ ”اب تو تم خوش ہو نا؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کچھ دیر تک خاموش ہی رہی۔ اس نے اپنے دستی بیگ سے رومال نکالا اور اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔

”وہ کب آئیں گے؟ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ ایک دفعہ گھنٹی کا بٹن دباؤ۔ برائے مہربانی ایک دفعہ اور کوشش کرو۔“

”ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں، اگرچہ جب سے یہ لفٹ خراب ہوئی ہے میں کئی مرتبہ کوشش کر چکا ہوں۔ میں نے زور سے اپنا ہاتھ دروازے پر مارا، مگر کوئی فائدہ نہیں۔“

”کیا اب میں مر جاؤں گی؟ آج صبح ہی میں سوچ رہی تھی کہ آج کا دن میرے لیے اچھا نہیں ہے۔ مگر میں سوچتی تھی کہ میری موت شاید کسی مختلف انداز میں ہو۔۔۔۔۔ کسی زلزلہ میں۔۔۔ کسی کار حادثہ میں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری موت دم گھٹنے سے ہوگی اور یہ کہ میں اپنے مکمل ہوش و حواس میں

موت کو گلے لگاؤں گی۔ ''

'' کیا تم افسردہ ہو؟ ''

'' تو کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟ '' اس نے دھیمے غم زدہ لہجے میں طنز کیا۔

'' میرا خیال ہے کہ تمھیں اپنی نیکیاں گننی چاہییں۔ ''

'' پر کیوں؟ ''

'' کیوں کہ تم جوان ہو، خوبصورت ہو اور دیکھنے میں خوش حال لگتی ہو۔ ''

'' کیا تم اپنی زندگی سے خوش ہو؟ ''

'' اپنی پیدائش سے لے کر آج تک میری زندگی میں اس سے پُرلطف دن کوئی نہیں آیا۔ ''

'' تم تو بڑے پیچیدہ انسان ہو، باتوں سے تو پاگل ہی لگتے ہو۔ ''

'' نہیں بلکہ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کسی خوب صورت لڑکی سے بات کروں گا۔ اب یہ دیکھو میرا خواب تو سچ ہو گیا۔ ''

'' تمھاری ان باتوں سے مجھے خوف آتا ہے۔ تم تو کہہ رہے ہو کہ ہم مرنے جا رہے ہیں۔ میں تو مرنا نہیں چاہتی! ''

کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔

'' تمھارے بیوی بچے ہیں؟ '' اس نے پوچھا۔

'' تم یہاں کام کرتے ہو؟ ''

'' میں اس عمارت کا لفٹ آپریٹر ہوں۔ کیا تم نے میرے کپڑے نہیں دیکھے؟ مگر تم کیا کرتی ہو؟ یہاں کیوں آئی ہو؟ ''

'' میں کام سے تھک چکی ہوں اور چھٹیوں پر یورپ جانے والے قافلے میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔ ''

'' ۔۔۔ آہ! ۔۔۔ افسوس ۔۔۔ ''

'' کیا تم مذاق اڑا رہے ہو؟ ''

'' نہیں ۔۔ مگر یہ صورتِ حال ضرور ۔۔۔ مجھے سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے۔ '' میں بڑبڑایا۔

'' اور میرا تو دم گھٹ گیا ہے ۔۔۔ ''

اس نے اپنا دستی بیگ زمین پر گرا دیا اور دیوار سے ٹیک لگا دی۔ میں نے شیشے میں اس کے زرد

پڑتے چہرے کا عکس دیکھا اس کے ماتھے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ رو پڑی۔

میں نے اس کو حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھوں کو تھپ تھپایا۔ میں نے جوشِ جذبات میں اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں اس زور سے تھاما کہ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میری انگلیوں کے نشان اس کے رخسار پر نہ گڑ جائیں۔

ہمارے درمیان مکمل خاموشی تھی۔

میں تو تقریباً رو ہی پڑا۔۔۔۔ اس کے بارے میں سوچ کر یا شاید یہ آنسو میرے اپنے لیے تھے۔

میں نے پھر سے ہمت کی اور اس سے پوچھا، ”تمھارا نام کیا ہے؟“

”جنان۔“

”ایسا لگتا ہے جیسے ساری دنیا کا درد تمھاری آنکھوں میں سمٹ آیا ہے۔“

”اور ساری دنیا کا کھوکھلا پن تمھاری آنکھوں سے عیاں ہے۔“

اس نے بس یہ کہا ہی تھا کہ لفٹ نے حرکت کرنا شروع کر دی۔

وہ خوشی سے چلائی۔ بچے کی طرح چھلانگ لگائی، عورت کی طرح قہقہہ لگایا۔ وہ اپنے آپ کو لے کر بہت خوش تھی۔ اس دوران میں سوچ رہا تھا کہ میں اس سے کیسے کہوں کہ وہ پھر کب ملے گی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں خاموش اور افسردہ ہوں تو وہ پُرسکون ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو شیشے میں دیکھتے ہوئے اپنے بال سنوارے کپڑے سیدھے کیے۔ پھر اپنا پرس اٹھایا اور کہا:

”برائے مہربانی۔۔۔ پانچویں منزل۔۔۔ جلدی کریں!“ اس نے شستگی سے کہا۔

اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

☆☆☆☆

ایملی ڈکنسن

انگریزی سے ترجمہ: ناہید ورک

غیر اہم

میں تو غیر معروف ہوں، اور تم؟
کیا تمھاری بھی کوئی اہمیت نہیں ہے؟
پھر تو ہم ایک جیسے ہوئے
ایک جوڑے کے مانند!
یہ راز عیاں مت کرنا
ورنہ تشہیر ہو جائے گی!
ناموری کی خاطر خودنمائی
اور عام ہونا بھی
کتنا تکلیف دہ ہے
اپنے ہونے کا احساس دلانا
مسلسل اپنا ہی نام دُہرانا!

☆☆☆☆

امرتا پریتم
پنجابی سے ترجمہ: اختر رضا سلیمی

ایک خط

یادوں میں تیری رات کا ہر پل گزار کے
جاگی ہوں آج سات بہشتیں اُسار کے

یہ رات، رحمتوں کی برستی ہوئی گھٹا
جس نے کیے ہیں سارے ہی پیماں ترے وفا

یوں ڈار پنچھیوں کی اڑی، جوں تیرا خیال
آتی ہے اب مہک بھی تری سانس کی مثال

جس سمت دیکھتی ہوں اندھیرا ہے سر بہ سر
حتیٰ کہ تیرا خواب بھی آتا نہیں نظر

ہر آن تیری یاد میں ہوں محوِ نغمہ خواں
حیراں ہوں ایک گیت بھی پہنچا نہیں وہاں

☆☆☆☆

ڈاکٹر اللہ داد بوھیو
سندھی سے ترجمہ۔ محمد رفیق مغیری

ادب اور نفسیات

ادب کو جس حد تک آرٹ سمجھا گیا ہے، اس حد تک نفسیات کا اس میں بڑا دخل ہے۔ آرٹ انسان کے ذہن کی پیدائش ہے۔ اور انسانی ذہن ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ نفسیات کے عالم نفسیات کے مطالعہ کے لیے تحریر و تقریر کو بنیاد بناتے ہیں اور ادب کے عالم علم و ہنر کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے اصول کام میں لاتے ہیں۔

لکھنے کی محرک سے لے کر لکھنے کی فارم یعنی نثر یا نظم لکھنے کے مقاصد فن کردار اور اظہار کے خاص اور اہم طریقے، سٹائل اور اسی طرح کی دوسری باتوں میں تخلیق کار نفسیات کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ شعر الہامی ہو یا کوشش دونوں حالتوں میں دماغ متاثر ہوتا ہے۔ کیوں کہ محض ایک ہی کارخانہ ہے جس میں شعر جیسی چیز بن کر تیار ہوتی ہے۔ شعر نقالی ہو یا تخلیق دماغ کا وجود اور اس کی تخلیقی بناوٹ ہی اسے بنا سکتا ہے۔ اسی طرح ادب کے گوناگوں سوالات اور معاملات میں دماغ اس کی مشینی قوت اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ یہ وہی چیزیں ہیں۔ جن کو قدم اٹھانا ہے اور بندوبست کرنا ہے۔ لہذا بہتر طریقے سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور ارسطو سے لے کر آج تک نفسیات جو کہ انسان کے سوچ کے طریقوں سے تعلق رکھتی ہے وہی ادب کے سوالات کے جواب کے لیے بلکہ ادب کے وجود کے لیے کام کرتا رہتا ہے۔

آرٹ کے سلسلے میں نفسیات کے علم کی مدد لینے سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ نفسیات کا علم ہمیں ایسی زبان اور ایسے الفاظ مہیا کرتا ہے۔ جس سے ہم ادب جیسی کسی بھی تخلیق انسانی کارنامے کو نہایت ہی موزوں طریقے سے بیان کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہماری ادبی اور تنقیدی زبان درست ہوتی ہے۔ اور اس لائق بنتی ہے کہ ہم اس کی مدد سے ادب جیسے نازک و نفیس موضوع پر بحث و مباحثہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ نفسیات کے طریقے اور اس کے اصول ہمیں ادیب یا شاعر کی ذاتی زندگی کو سمجھنے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہم کسی بھی ادیب یا شاعر کی تخلیق کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ انسانی تخلیق چاہے وہ ڈرامہ ہو یا نظم، افسانہ ہو یا مضمون بس انسان کے اندر کی کہانی کا کوئی نہ کوئی حصہ ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر بھی

اپنے ذاتی تجربے سے لکھتے ہیں عام انسان بھی اپنی زندگی کی خودنوشت سناتا ہے اور اسی طرح ہم ادیب کی ذاتی زندگی سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذاتی خیالات ذہنی طریقہ اور وسیلہ معلوم کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اسے تخلیق کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

۴۔ بڑی بات یہ ہے کہ تصوراتی ادب Fiction کا اصل دارومدار ہی تصوراتی کرداروں (Fictitious Characters) پر ہوتا ہے۔ اس قسم کے تمام کردار زیادہ نفسیاتی مطالعہ چاہتے ہیں۔ انسان کا ذہن گوناگوں صلاحیتوں کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ سب صلاحیتیں علیحدہ علیحدہ کرداروں کو جنم دیتے ہیں۔ ہر ایک کردار اپنی ایک جدا دُنیا رکھتا ہے۔ یہ دنیا بھی ادیب کی تخلیق ہوتی ہے جس میں جدا جدا محل (Situations) ہوتی ہیں۔ ہر ماحول اور محل کا ایک عروجی نقطہ (Crescedo) یا معائنہ Episode ہوتا ہے۔ یہی عروجی نقطہ پھر ناول یا کہانی میں دوسرے عروجی نقطے پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح سے دیکھا جائے تو ایک ناول (یا ایک چھوٹا افسانہ بھی) ایک ”عالم اصغر“ جیسا ہوتا ہے۔ جو کہ اپنی ہیئت کے خیال سے نفسیاتی کمپلیکس (Psychological Cimplex) جیسا ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نظم، ڈرامہ کہانی یا فکشن پر مکمل بحث کرنے کے لیے نفسیات کے اصولوں کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کی شروعات میں کئی ادیب فرائیڈ کی تحقیق سے متاثر ہوئے تھے۔ مسٹر برل Brill نے فرائیڈ کی دو مشہور کتابیں (۱) انگریزی میں ترجمہ کیں، اس کے بعد 1910 میں ڈاکٹر جونس Dr. Jones نے ہملیٹ کی جو تشریح کی اس میں فرائیڈ کی تحقیق سے کام لیا ہے۔ (۲)

اس قسم کی تحاریر ادیب اور لکھاریوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث بن گئی تھیں۔ اس وقت یہی سمجھا گیا تھا کہ فرائیڈ کی تحقیق سے آرٹ کے طریقوں کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح فنکار Artist کے لاشعوری مقاصد Unconcious Intentions کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوگئی اور تصوراتی کرداروں Fictitious Characters کی ادبی حیثیتوں کو زیر مطالعہ لایا گیا۔ اس وقت فرانس کے ادب میں ”ادبی فطریت“ Literary Naturalism Trends کا خیال ابھر کر سامنے آیا تھا۔ فرانس کے ادب کے اسی نظریے Trend کے مطابق انسان اپنے ماحول یا حیاتیاتی صورت کا شکار Victim تھا۔ فرائیڈ کی تحقیق نے اس دور میں ایسی معلومات دیں جس سے انسان کی اس مجبوری کے ماحول کو آسانی سے سمجھا گیا۔ یہ مجبوری والا ماحول یا وہ جبر والے حالات Repressions انسان کے سماج کی پیداوار تھے۔ فرائیڈ نے اس وقت کہا تھا کہ ”انسان وحشی نہیں ہے پر بیمار ہے“ ‘Man is sick rather than villainous’۔ یہی بات اس وقت حیاتیات کے ماہروں سے منسوب تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کردار کی پوری جوابداری فرد پر نہیں ہے۔ فرد تو ماحول

اور سماج کی طاقتوں کے سامنے بے بس اور لاچار ہے۔

ایسے ماحول میں نفسیات کی تحقیق نے یہی بات آسان کر دی کہ انسان اپنی انا یا اندر میں چھپے ہوئے رازوں کے اظہار کے لیے مجبور ہے۔ اسی طرح فرائیڈ کے نظریات کے مطابق اس کی بنائی ہوئی اصطلاحات کی روشنی میں کسی بھی ادبی تخلیق مثلاً ڈرامہ، افسانہ، ناول یا نظم وغیرہ میں جھانک کر دیکھنے سے اس میں پیش کیے گئے انسانی معاملات کو واضح نمونے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس دور کا ایک دوسرا حادثہ ہے آڈلر Adler کا احساس کمتری Inferiority Complex والا نظریہ۔ اس نظریے نے تخلیقی ادب پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اسی دور میں جنگ نے اجتماعی لاشعور Collective Unconcious کا تصور دیا تھا۔ مگر ان نظریات کی بنیاد بھی فرائیڈ کی تحقیق پر رکھی گئی تھی۔ فرائیڈ کی تحقیق کا ادب پر جو اثر پڑا تھا اس کا مطالعہ ہاف مین Hoff Man (۳) پھر لارنس شروووڈ اور اینڈرسن Lawrence, Sherwood, Anderson کے ادبی کارناموں کے سہارے پر کیا تھا۔ اس کے بعد کئی ادبا کے ادبی کارناموں کا نفسیاتی جائزہ لیا گیا تھا۔ مثلاً جیمس جوائس، گراہم گرین وغیرہ۔

ایسی حالت میں خود بخود طبیعت مائل تھی کہ ادیب یا نقاد مزید بحث کے لیے نفسیات کی مدد لیں۔ ادبا نے ایسی کوششیں شروع کیں تو از خود پہلا دھچکہ انسان کے ماضی کی تاریخ کی کچھ اہم روایات کو لگا۔ شروع شروع میں تو امریکہ اور انگلینڈ اس طوفان کی زد میں آئے۔ اس وقت امریکہ میں "پیوریٹن کلچر" مقبول تھا اور انگلینڈ میں وکٹوریائی دور کے نظریات اہم سمجھے جاتے تھے۔

جدید ہتھیاروں نے سب سے پہلے ان نظریات پر وار کیا جن میں "انتہائی سنجیدگی" High Seriousness موجود تھی۔ اگر چہ عصمت حلم اور عزت جیسے وصف Vitues نفسیاتی اصولوں کے خیال سے انسان کے جبر کی حالت میں رہنے کے لیے غیر صحت مند اظہار Unhealthly Expressions جیسے ثابت ہو سکتے تھے تو پھر ان کا ازلی حقیقت کا کوئی بھی وجود ثابت کرنا مشکل کام تھا۔ یہی سبب تھا کہ شرافت اور عصمت جیسے اوصاف پر نفسیات کے ماہرین نے بڑے حملے کیے اور وہ کہنے لگے کہ جو بھی آدمی ان اوصاف کو ازلی سمجھتے ہیں وہ جاہل ہیں یا پھر جان بوجھ کر اصل حقیقت کو نہیں دیکھ رہے ہیں۔

اس طرح کی ایک بڑی کوشش بورنے Bourne نے بھی کی تھی۔ (۴) جس نے اس نفسیات کی مدد سے شرافت اور عصمت کے تصورات کی ازلی یا جامد ہونے کو غیر حقیقی ثابت کیا تھا۔

ادب اور تنقید کے بارے میں نفسیات سے مدد لینے والا کام نمایاں طور پر 1919 سے شروع ہوا ہے۔ جب کونراڈ آئکن Conrodaiken کی کتاب شائع ہوئی۔ (۵) مزید کام ڈیل Floyddell اور کس

ایسٹمن Max Eastastman۔ ادبی مخزن The Mass میں کیا۔ جس کا وہ ایڈیٹر تھا۔ جب کہ یہ صاحبان سماجیات کے ماہرین تھے۔ اور وہ سماجی قدروں کی جانب زیادہ جھکاؤ رکھتے تھے۔ لیکن تب بھی انہوں نے نفسیاتی طریقوں کو عام کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔

انگلینڈ میں رابرٹ گریوز Robert Greves کا رایہ رائیورس Rivers کے نظریے پر تھا۔ رائیورس صاحب نے ''لاشعور شخصیات کا ٹکراؤ'' Conflict of Un Concious Personalities والا تصور پیش کیا تھا۔ اسی دور میں ہربرٹ ریڈ Herbert Read صاحب نے اس بات کی حمایت کی تھی کہ ادب اور تنقید میں نفسیات کے اصولوں سے کام لیا جائے۔ (۲) بے شک شروعات میں غیر مستند ولولے Un Qualified Enthusaism کی وجہ سے کئی نقادوں نے نفسیات کا استعمال غیر موزوں طریقوں سے کیا تھا اور کئی کو تو نقادوں نے نفسیات کا استعمال غیر موزوں طریقو ں سے کیا تھا اور کئی کو تو نفسیات کا پوری طرح سے علم بھی نہیں تھا۔ مگر یہ غلطی خوش آئند تھی کیوں کہ نفسیات ایک تکنیکی چیز تھی۔ آگے چل کر جب نقاد نفسیات کے اصولوں کے معاملے میں مزید سنجیدہ ہوئے تو نفسیات کا علم مزید مقبول ہوا۔ تب ادب اور تنقید پر نفسیات کا اثر مزید نمایاں ہوا۔

اسی طرح ادب کے میدان میں نفسیات کے اصول تین نمونے کے تحت مددگار ثابت ہوئے۔ نفسیات کے اس ادبی کردار کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے۔ مگر یہاں پر ذرا تفصیل سے اس کا ذکر پیش کرتے ہیں:

۱۔ مشہور محقق اور عالم آئی۔ اے۔ رچرڈ I.A. Richards کا خیال ہے کہ نفسیات ہمیں موزوں ترین محاورے مہیا کرتی ہے اور ہم اس کی مدد سے ادب کی تخلیقی قوتوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ رچرڈز نے اس سلسلے میں اپنی کتاب Principales of Literary Criticism میں جمالیاتی تجربے پر بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ تجربہ کتنے عناصر سے مل کر بنتا ہے۔ حسن Beauty کے بارے میں رچرڈز اوگڈن اور ووڈ کا خیال تھا کہ ''حسن ردعمل کا مخصوص اور پختہ یا برابر Harmonious وہ نمونہ ہے جو مشاہدہ کرنے والوں کے پاس آرٹ کے عمل نے پہنچایا ہے۔'' رچرڈس کے اس نظریے پر کئی علما و ادبا نے بحث کی ہے۔ مگر آج تک کسی بھی تنقید نگار نے اس خیال کو مکمل طور پر رد نہیں کیا ہے۔ رچرڈس کی رائے کا بڑے سے بڑا فائدہ برک Burke Kenneth نے لیا۔ برک نے اپنے مضمون Antony in Behalf of the Play میں مصنف اور قارئین کے درمیان قائم کیے ہوئے ''لاشعوری رشتے'' uncensious relations کا جائزہ لیا ہے۔

۲۔ دوسرا نمونہ جس میں نفسیات ادبی تنقید نگاروں کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے چوں کہ ولسن Wilson Edmund کی تحریروں میں آیا ہے۔ اسی طرح نفسیاتی اصول ہمیں ادبی سوانح لکھنے میں مدد

کرتے ہیں۔ اسی طریقے سے مصنفین کی ذاتی زندگی کا مطالعہ کرنے سے تخلیق شدہ آرٹ کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کشمکش کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں جو کہ مصنف کو کسی آرٹ کا شاہکار تخلیق کرنے کے لیے تیار کرے گا۔

ادبی تنقید کا یہ طریقہ ہمیں بتاتا ہے کہ آرٹ اور آرٹسٹ کے درمیان جو رشتہ ہے جیسا کہ بیمار اور خواب کے درمیان ہوتا ہے اس بارے میں اکثر و بیشتر لارنس کی رائے حوالہ کے طور پر کام میں لائی جاتی ہے۔ جس نے کہا کہ ”مصنف جو لکھتا ہے تو جیسا کہ اپنی بیماری کاغذ پر گراتا ہے۔“

اس خیال کے مطابق تنقید نگار ادبی شاہکار کا تجزیہ اس طرح کرتا ہے کہ جو کہ وہ پہلے پہل بیماری کی علامات Symtoms کی جانچ پڑتال کرتا ہے پھر ایک ایک علامت کو علیحدہ کر کے لاشعوری مجبوریوں کے اس ماحول کا مطالعہ کرتا ہے جس کی نشانیاں مصنف اپنی تحاریر میں چھوڑتا ہے جو کہ مصنف کا ماحول انھیں بناتا ہے۔

اس خیال کو ولسن Wilson نے اپنے مضمون The wound and the bow میں لایا ہے۔

ان کے خیال کے مطابق ہم مصنف کے ذاتی مسائل اور ان کے ذاتی حالات سمجھ کر پھر ان کی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح تخلیق کار کی تحاریر میں سمائے ہوئے Trends ظاہر ہو جاتے ہیں۔

۳۔ تیسرا نمونہ جس میں نفسیات ہماری مدد کرتی ہے۔ وہ یہ ہے جس کو لیوکس Lucus. L.F نے اپنی کتاب Literature and Psychology میں ظاہر کیا ہے۔ اس کتاب سے ہمیں کئی کردار ملتے ہیں جو کہ عمل اور رد عمل کی دنیا میں رہتے ہیں اور آپس میں ٹکر کھاتے ہیں۔ اس طرح کے کرداروں کا مطالعہ کرتے وقت تنقید نگار کا کام نفسیات کے اس ماہر جیسا ہوتا ہے جو کہ تحت الشعور سے بیماری کے عمل کے وہ Trends ڈھونڈ نکالتا ہے جو کہ ان سے کوئی نہ کوئی عمل کرا لیتے ہیں۔

اس سلسلے میں بڑا کام ڈاکٹر جونس Dr. Jones نے کیا ہے۔ جونس ہملیٹ کا مطالعہ کرتے ہیں، دکھایا ہے کہ وہ کونسی نفسیاتی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے ہملیٹ اپنے باپ کا انتقام لینے میں تاخیر کرتا رہا اور یہ وجوہات وہی وجوہات ہیں جن کو فرائیڈ کی تحقیق کے بغیر معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس قسم کا ایک مطالعہ ہمیں ادنا کینٹن Edna Kenton کے مضمون (۷) میں بھی ملتا ہے۔ جس میں انہوں نے ہینری جیمس کے آرٹ پر بحث کی ہے۔

ادب کے نفسیاتی تنقید کے نظریے پر جو تنقید ہوئی ہے وہ دو نمونے کی ہے۔ اول یہ کہا گیا ہے کہ نفسیاتی تنقید کوئی نئی بات نہیں ہے اس حالت میں محض ایک عام فہم نظریے کو مزید عام فہم بنایا گیا ہے۔ اس رائے کی وابستگی زیادہ تر نفسیاتی تنقید کے اس دور سے ہے جب نفسیاتی طریقے ابھی تک نئے نئے تھے اور نفسیاتی تنقید نگار پوری طرح سے ادب کے نقاد نہیں تھے۔

دوسرا اس سلسلے میں یہ رائے دکھائی گئی ہے کہ آرٹ کی تخلیق خواب کی طرح نہیں ہے اور کوئی بھی آرٹسٹ اس لیے نہیں لکھتا کہ وہ بیمار ہے۔ اسی رائے میں یہ کہا گیا ہے کہ آرٹسٹ ایک حقیقی خالق کی طرح اپنی تخلیقات کو اپنے ذہن کے ضابطے میں رکھتا ہے۔ اسی کے برعکس خواب کی حالت میں انسان بے بس ہوتا ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ اگر ”فنکار بیمار“ کوئی تخلیق دے سکتا ہے تو فنکار صحت مند کے تصور کو کیسے ٹھکرایا جا سکتا ہے اور وہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ تخلیق ذہن کی کسی نہ کسی بیماری (Abnormal State Of Mind) کا ہی نتیجہ ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی تنقید میں جس طرح کے سوالات اٹھائے گئے ہیں ان کی بنیاد سائنسی سوچ پر نہیں ہے۔ ایک عام فہم بات کو مزید عام فہم بنانے والا جو الزام نفسیاتی تنقید کے ماہرین پر لگایا گیا ہے اس میں کمزوری یہی ہے کہ نفسیاتی تنقید میں تو خود تنقید کے ہنر اور علم کو مزید سائنسی اور اصولی بنایا گیا ہے اور اس طرح سے تو خود تنقید مزید فنی اور تکنیکی بن گئی ہے۔ نفسیاتی تحقیق کے بعد اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر ایک لکھنے والا تنقید نگار بھی ہو سکے۔ اب تو ادب کے وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ نفسیات کا بھی وسیع مطالعہ کرنا پڑے گا۔ اس لیے تمام لوگ صحیح اور صحت مند ادب کے ساتھ ساتھ تنقید بھی کر سکیں گے اور یہ تنقید بھی انتہائی طور پر فنی انداز میں ہوگی۔ دوسرے نمبر پر الزام کی حالت میں تو نفسیات کے کئی اصولوں کو خیال میں بھی نہیں لایا گیا ہے۔ نفسیاتی تنقید میں اس طرح نہیں کہا جاتا ہے کہ ہر ایک آدمی بیمار ہے اور ہر ایک ادیب عالم، فاضل اور شاعر خواب دیکھتا ہے۔ اور خواب ہی کو تحریر میں لایا جاتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کی دریافت یہ ہے کہ انسان ایک ماحول کا ایک جز ہے۔ سوچ اور ارادے یا شعور اور لاشعور کا عمل ان کی تخلیق نہیں ہے یہی عمل تو خود شاعر یا ادیب کو پیدا کرتے ہیں اس لیے شاعر یا ادیب فقط یہی کہہ سکتا ہے جو کچھ وہ سوچتا ہے۔ اسی بات کو ہمارے ایک شاعر نے اسی انداز میں کہا ہے ”جو سوچے گا وہی کہےگا شاعر اور کیا بات کہےگا۔“ (تنویر)

حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان اپنی سوچ کا محتاج ہے اور سوچ پھر سماجی ماحول اور سماجی تصورات Concepts کے تابع رہتی ہے۔ اسی لیے آرٹ جو بھی تخلیقی ہے اور جو دل کے امنگوں آرزوؤں سے پیدا ہوتا ہے وہ اپنی حیثیت میں تو منفرد نرالا اور تخلیقی ہے۔ مگر خالق کے خیال سے وہ کچھ حالات اور کچھ مجبوریوں کا نتیجہ ہے اس لیے اس طرح کہنا کہ نفسیاتی تنقید میں انسان کی بنیادی صلاحیتوں کا انکار کیا گیا ہے غلط ہے۔ نفسیاتی تنقید کے خیال سے خود بڑی سے بڑی چیز ہے یہی انسان کی بنیادی صلاحیت، مگر نفسیاتی تنقید کی بڑی دریافت یہ ہے کہ انسان کی بنیادی صلاحیت کوئی منفرد یا علیحدہ عمل نہیں ہے۔ وہ تو انسان کے ماحول اور سماج کی مشترک کارکردگی کا ایک جز ہے اسی طرح نفسیاتی تنقید کے اصول ادب کے سماجی مقصد اور ان کی افادیت کا خود زیادہ قائل ہیں۔

ماضی قریب میں اس نئی بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ وہ لاشعور جو ادب کی بنیاد ہے، انفرادی

لاشعور نہیں ہے۔ وہ تو حقیقت میں کسی نسل یا کسی ثقافت کا گزرا ہوا لاشعور ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے اس طرح ادب سارے کا سارا ایک سماجی علامت بن جاتا ہے۔ اس کا تعلق ایک دور کے اس "اسپرٹ" کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو کسی نسل یا ثقافت کی پوری تاریخ کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس قسم کی دریافت کا واسطہ محض نفسیات کے ساتھ نہیں ہے۔ حقیقت میں تو یہ بات کسی اور علم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ جس کو سماجی علم الانسان Social Anthropology کہا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کچھ علما اس قسم کی رائے کو علیحدہ کر کے اسی علم کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔ اس طرح ادبی تنقید کا ایک نیا نظریہ وجود میں آجاتا ہے جسے Archetypal Approach کہا جاتا ہے۔ (۸)

حواشی

1. "Three Contributions to the Theory of Sex" 1910 and "The Interpretation of Dreams" 1912.
2. "Hamlet and Oedipus" 1949.
3. "Freudianism and the Literary Mind" 1945.
4. "The Puriton's will to Power" Seven Arts. April 1917.
5. "Skepticism-Notes on Contermpray Poetry" 1919.
6. "Reason and Romanticism" 1926.
7. "Edna Kenton's Essay, 1924, Adopted by Gerad Wilson in a Case Book on Henry Tames" 1960.
8. Wilbur Scott "Five Approches of Literary Criticism" 1962, P.73.

☆☆☆☆

گوجری تخلیق وترجمہ: غلام سرور رانا

گوجری مرثیہ: ایک جائزہ

گوجری مرثیہ کی تاریخ کافی پرانی ہے اردو اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں گجرات کا مولد و مسکن ہونے کی بنا پر گجری اردو یا بولی گجرات کہلاتی تھی ان دنوں یہ خطہ بڑا علمی و ادبی مرکز تھا جہاں شاہی سرپرستی میں شعروادب کی محفلیں سجتی تھیں۔ جہاں سے دوسری اصناف کی طرح مرثیہ بھی سننے کو ملتا تھا۔ جموں وکشمیر میں بولی جانے والی گوجری کے ڈانڈے بھی گجری اردو سے ملتے ہیں۔ ملک کے نامور دانشور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:

> ''گجرات میں قدیم اردو کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں یا تو صوفیائے کرام کے ملفوظات ہیں جن سے اُس زمانے کی عام بول چال کی زبان کا اندازہ ہوتا ہے یا پھر شاعری کے وہ نمونے ہیں جو شاہ باجنؒ، قاضی محمود دریائیؒ، شاہ علی جیوگام دھنیؒ اور خوب محمد چشتیؒ کے قلم سے نکلے گجرات میں پہلی بار ہمیں اس زبان میں تخلیق کرنے کی مسلسل روایت کا پتا چلتا ہے جو اُس دور میں اس طور پر کہیں نظر نہیں آتی۔''

یہ وہ لسانی یگانگت ہے جو قدیم گجری اردو اور جموں وکشمیر میں بولی جانے والی گوجری میں نظر آتی ہے۔ جس کا اظہار بیجاپور کے جلیل القدر خانوادہ کے سرخیل حضرت میراں جی شمس العشاقؒ سے لے کر جموں وکشمیر کے نامور صوفی حضرت میاں عبید اللہ لارویؒ کے ملفوظات اور شاعری میں یکساں نظر آتی ہے۔ اول الذکر بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے عہد کے بہت بڑے کامل شیخ اور مشہور صاحب عرفان تھے جن کے بیٹے شاہ برہان الدین جانمؒ اور پوتے امین الدین اعلیٰؒ نے اپنی شاعری کو فخریہ انداز میں گجری کہا ہے جب کہ موخر الذکر نے جموں وکشمیر میں روحانی قدروں کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔ جہاں ان کی درگاہ کے سجادہ نشین حضرت میاں نظام الدین لارویؒ نے ایک بڑے دبستان کی بنیاد رکھی۔ جس سے اہل علم کی بڑی تعداد وابستہ ہوئی۔ حضرت شمس العشاقؒ کی طرح آپ کے خانوادے میں شاعروں اور ادیبوں کی کمی نہ تھی۔

گوجری مرثیہ کے بارے میں نامور محقق اور دانشور ڈاکٹر رفیق انجم جدید گوجری کی تاریخ کے تیسرے حصے میں قدیم وجدید گوجری مرثیہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’گوجری ادب میں مرثیہ کی روایت کافی توانا ہے۔ اِس زبان کے ابتدائی دور کے شعرا کے ہاں مرثیے ملتے ہیں جن میں واقعات کربلا اور حضرت امام حسینؓ اوران کے جاں نثار ساتھیوں کی قربانیوں کو بڑی دلسوزی اور عقیدت سے بیان کیا ہے۔‘‘

گجری اردو میں مرثیہ کی روایت کا ثبوت عادل شاہی عہد کے نام ور مرثیہ گو شاعر شاہی کا وہ مرثیہ ہے جس کا حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو کے صفحہ 329 میں دیا ہے۔ جس کے بول ہیں:

تج فراقوں سوریو دستا اندھیارا یا حسینؓ
قرۃ العین نبی کا تھا پیارا یا حسینؓ
آیا چندر یوجگ ملنے سکھ سب جدا ہوا
یو شور سر عشو ر کا گھر گھر ندا ہوا

آزاد کشمیر میں مرثیہ گوئی کا سہرا بابائے گوجری رانا فضل حسین کے سر ہے۔ جنھوں نے ستر کی دہائی میں آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل کے گوجری پروگرام کے سپروائزر کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی محرم کے حوالے سے خصوصی پروگراموں کا اہتمام کیا۔ جس میں گوجری شاعروں اور ادیبوں کی بڑی تعداد شامل ہوتی رہی ہے۔ یہ سلسلہ ان کی ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ ان کے ریڈیو کے دور کے مرثیہ کے پروگراموں میں پیش کیے گئے فیچرز، تقاریر اور مرثیوں کو کتابی صورت میں مرتب کیا جائے تو کئی ضخیم کتب مرتب ہو سکتی ہیں۔ رانا فضل حسین گوجری کے ممتاز شاعر اور ادیب ہیں۔ انھوں نے مرثیہ گوئی کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ مرثیہ کو انفرادی نہیں بلکہ غم حسین کے تناظر میں لکھا ہے۔

نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

جد فر سنسار ماں پنگرے گی کائے مندی بھل یزیداں کی
فر ناں حسین کو پگرے گو تقدیر نے فتوو چا ڈو
یروشلم بیروت پکاریں یا حسینؓ یا حسینؓ
تھارے ناؤیں ہوتا سُنیاں وچ کشمیر سلام
حرف حرف ماں لہو لہو کربل لہو رنگیتی تھاری
پیش کرے نذراناں تم ناں فضل فقیر سلام

نام ور محقق پروفیسر محمد نذیر مسکین بابائے گوجری رانا فضل حسین کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''رانا فضل حسین نے روایتی مرثیہ نہیں لکھا بلکہ وہ واقعہ کربلا اور حضرت امام حسینؓ کے کردار کو اپنے لیے ایک استعارہ بنا کر اسی معرکہ حق و باطل کے تسلسل کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں ۔ اس تناظر میں ان کی نظموں کے عنوانات بھی پُر تاثیر ہیں مثلاً لہو لہو بین، پُھٹکارو (کوفیوں کے لیے) لہو، ناں حسینؓ نیاں، روتا نین، ویرا، عشق نماز لہو کہانی، لہو تڑونکا، پن دان، نِک لہو کی لالی، چپناہی چپناہی، سراں کا سودا، کربل کی تکار، ان کی چند نظموں کے عنوانات ہیں ۔''

رانا صاحب کے خاندان کو 1965 میں راجوری میں سانحہ کربلا کی طرح کے واقعہ سے گزرنا پڑا انھیں بیالیس افراد کی قربانی دینی پڑی جس میں چھ سالہ بھتیجے کے ساتھ ساتھ بچوں، جوانوں اور پچاس سال تک کی عمر کے لوگوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑا ۔ خاندان کا لٹا پٹا قافلہ کو میرپور ہجرت کرنا پڑی خود رانا صاحب ہجر کی کربنا کی سے دوچار رہوئے جس کا اظہار انھوں نے مرثیوں کی صورت میں گوجری کو عمدہ معیار کے مرثیے دے کر کیا۔ منیر حسین چودھری منفرد لہجے کے شاعر ہیں ۔ سانجھ کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ دوسری اصناف کی طرح مرثیہ نگاری میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے۔

سب کجھ دے کے لاج نبھاوے اچا کرے اصولاں نا
سچ کی مانگ ہے کھیڈ سراں کی سچ کے منگ حسینؓ کرے
کج اک جی داراں کو لڑنو بڑا یزیدی لشکر نال
نہ پہلا آسمان تے تکی جہڑی جنگ حسینؓ کرے

فضل مشتاق کا شمار گوجری کے نامور محققین اور شاعروں میں ہوتا ہے ۔ ان کی تحریریں جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگوجز سری نگر کے رسالوں شیرازہ گوجری اور مہارا ادب میں شائع ہوتی رہتی ہیں ۔

شیرازہ گوجری میں اپنے مضمون گوجری ادب ناپونچھ کی دین میں اپنے ایک مرثیہ کے اشعار کا حوالہ دیا ہے:

شب شب چلے دو دتی گھب پوویں تھا خنجر
کپ کپ کے ہٹ گیا تھا قاسمؓ عباسؓ باقرؓ
عونؓ و محمدؓ آ آ عابد تے حضرت باقرؓ
مڑیا وے جہڑے پاسے کہے کہے کے اللہ اکبر
شیراں تے لومڑاں نا نہ آن ڈتو
آیو جس کے اگے زندہ نہ جان ڈتو

حسین بی بی بابا ئے گوجری رانا فضل حسین کی حقیقی ہمشیرہ ہیں ۔ پروڑی گوجراں میں اپنے خاندان پر ٹوٹنے والی قیامت کی وہ چشم دید گواہ تھیں ۔ اُس کا حقیقی بیٹا دل محمد بھی شہدائے پروڑی میں شامل تھا ۔ شہادت کے واقعہ کے بعد خاندان کی خواتین اور بچوں کے لٹے اور پچھلے قافلے نے تو میرپور ہجرت کی مگر حسین بی بی نے اپنے گاؤں پروڑی گوجراں میں ہی قیام کرنا پسند کیا جہاں اپنے بھائی فقیر محمد کے ساتھ جو معذوری کے سبب شہید ہونے سے رہ گئے تھے ۔ اُس کے ساتھ بیتے لمحوں کو یاد کرتے ہوئے آنسو بہاتی اپنے خاندان کی قربانیوں کو کربلا کی دین قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

سچ کا پرچم اچا رکھیا سر نیزے لہرایا
عشق نماز تلے تلواراں کر چلیا تھا چارا
زینبؑ روئی سنگ نہ کوئی سچ کی رسم نبھائی
یا حسینؑ حسینی روے راہ ٹریا ہم تھارا

عبدالرشید چودھری کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے ۔ صاحب دیوان شاعر ہیں ۔ کچھ عرصہ قبل ان کا شعری مجموعہ نین سمندر کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ جس میں مرثیہ بھی شامل ہے ۔ جس میں سے چند اشعار پیش کرتا ہوں؛

تیر تبر تے نیزہ بھالا لابھل انت یزیدی فوج
ظلم مقابل تن بہتر لے کے آیا سائیں حسینؑ
نیزہ اُپر تلاوت کرتاں سر تھو شام کا محلیں آیو
ہار کے زندگی محشر توڑیں جتیا رہیا سائیں حسینؑ
ندی فراتے تیں نہ تھو اہل بیت نا قطرو پانی
محشر توڑی شرم تیں رہ گو پانی تیرو پانی پانی

غلام سرور رانا نے بھی مرثیہ گوئی کی روایت کو خوبی سے نبھایا ہے ۔ انھوں نے واقعات کربلا کو عمدگی سے اپنا موضوع بنایا ہے ۔

محشر تک بڈیار ہتھایا کربل کی قربانی کا
ظلم کی چڑھتل تک جناں نے تج تو زندگانی نا
یا حسینؑ حسینؑ ہووے گو نام حسینؑ ہمیشاں جیئے
دنیا تندے تندے سرور تت یزید کی ڈھائی نا

خواجہ بشیر سرتاج راجوروی گوجری کے باکمال شاعر تھے۔ انھوں نے دوسری زبانوں میں بھی لکھا۔ چوں کہ ان کی آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل کے گوجری مشاعروں، محفل مسالمہ سے وابستگی تھی۔ اس لیے گوجری میں ان کی شاعری زیادہ ہے۔ انھوں نے سبھی اصناف میں لکھا مگر ان کا گوجری مرثیہ اپنی اسلوب کے اعتبار سے منفرد تھا۔ نمونہ کے اشعار ملاحظہ کریں:

دجل فرات اڈیکیں اج وی
کت ہیں بھکھا تسا لوک
کربل گمر ی پھٹیا کنڈیا
چا ڈاڈاں نے رلسا لوک
خالی پتھر پہ دیسی لوکاں
ہس کے جھلیا سارا وار
شہیداں کو سردار حسینؓ
حق سچ کو معیا ر حسینؓ

پروفیسر یوسف حسن اردو، گوجری اور پنجابی کے صاحب طرز ادیب اور شاعر تھے۔ گوجری ادب کے حوالے سے ان کا اہم تحقیقی کام قدیم گوجری شاعری کا جائزہ تھا۔ جس میں انھوں نے منقبت اور مرثیہ کی روایت کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ وہ خود بھی گوجری کے بڑے مرثیہ گو تھے۔ آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل سے برسوں تقاریر اور کلام شاعر کے ذریعے گوجری میں اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ ان کے مرثیہ میں سے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایے:

حشر سماں کو کربل بلیو کربل ماں
تا نبور یت کلیجو ت تلیو کربل ماں
زمین اسمان دوہیں لال و لال ہویا
شام نا اِک اِک خیمو بلیو کربل ماں
یوسف ہوروی اُچو ہویو سچ کو نام
چوٹھ کو نہ کوئے چارو چلیو کربل ماں

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین اظہر نامور ماہر تعلیم، محقق اور دانشور رہے۔ گوجری زبان و ادب کی ترقی کے لیے ان کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے ان کے فیچرز، تقاریر اور شاعری گوجری

مرثیہ نگاری میں یاد رکھی جائیں گی۔ ان کے مرثیہ میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں؛

سلام اُس پہ سلام اُس پہ
جس نے جان کی بازی لا کے
جس نے اپنو سر کٹا کے
سارا کنبا سا را جھگا
اپنی ہر اک شے لٹا کے
حق کی بازی جت لئی ہے

محمد اسرائیل مجبور راجوری ایک انقلابی شاعر تھے جنھوں نے گوجری کے علاوہ ہندکو میں بھی لکھا۔ نغمۂ کہساران کا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں سبھی اصناف کی شاعری ملتی ہے۔ مظلوم طبقات کے مسائل کے حل کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ شیرازہ گوجری اور مہاروادب میں ان کے حوالے سے مضامین اور شاعری شائع ہوتی رہتی ہے۔ ان کے مرثیہ میں سے چند شعر:

دی حق کے واسطے تم نے
حضرت امام پاک سلام تم پہ
چپہ چپہ زمین کا اُپہ روشن
تھارو جگ ماں نام سلام تم پہ

مولانا محمد اسماعیل ذبیح راجوروی گوجری کے صفِ اول کے شعرا میں سے تھے۔ اس زبان میں ان کی متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ علمی اور ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ وہ ایک نامور سیاسی اور سماجی راہنما بھی تھے۔ ان کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ عرصہ تک آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل کے گوجری پروگرام میں کربلا کے واقعات پر تقاریر کرتے رہے۔ محفل مسالمہ میں ان کی شرکت لازمی ہوا کرتی تھی۔

جہڑو مونڈھاں پہ رسولؐ اللہ کے ہووے تھو سوار
تھو علی کو کالجو کی اکھاں کی لو، دل کو قرار
فاطمہ زہراؓ کا دودھ کی جہڑو پیتو رہیو دھار
کر گو اپنا لہو تیں کربلا نا لالہ زار

مولوی مہر الدین قمر راجوروی گوجری ادب کی تحریک کے سرگرم راہنماؤں میں سے تھے۔ تحریک آزادیٔ کشمیر کے حوالے سے بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ راجوری سے ہجرت کے بعد ایبٹ

آباد میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کی تحریروں میں سیاسی وسماجی نوعیت کی شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل کی محفلِ مسالمہ کے سبب گوجری میں مرثیے لکھنے کی جانب مائل ہوئے۔

اَج محرم کو چَن چڑھیو
سارو خون بدن کو کڑیو
کے دسوں ہوں اپنو حال
درداں گو پیغام لیا یو
گھر گھر ماتم سوگ ہوا یو

ملک محمد زبیر زخمی ایک شاعر اور صحافی کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے تھے۔ عوامی مسائل کے حل کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ شعری ذوق رکھتے تھے۔ بابائے گوجری کی رفاقت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا۔ انھوں نے عمدہ مرثیے لکھے ہیں جن میں سے نمونہ کلام درج ذیل ہے:

ساری دنیا وِچ ظلم ہے
اَج کربلا کے نال کو
جموں و کشمیر فلسطین تے عراق وِچ
جام شہادت پیٔں ولولہ کے نال کو
یوہ ہی راہ ہے علیؓ کو
نالے فاطمہؓ کا لال کو

گوجری کے عصری ادب کو دیکھا جائے تو اس میں مرثیہ ایک اہم صنف کے طور پر سامنے آیا۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ گوجری مرثیہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ جہاں اس میں کربلا کا ذکر ہے وہاں کشمیر کا بھی ذکر ہے۔ نوجوان شعرا کی بڑی تعداد مرثیہ گوئی کی جانب راغب ہو رہی ہے۔ ذکرِ حسینؓ ایک اہم استعارہ وعلامت کے طور پر ان کے فکری جوہر کو چمکا رہا ہے۔ گوجری کے مرثیہ گو شعرا کی بڑی تعداد ہے جن کا ذکر طوالت کی وجہ سے نہیں کر سکا۔

حواشی

ڈاکٹر جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو
ڈاکٹر عبدالحق	قدیم اردو
ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم	اردوئے قدیم اور چشتی صوفیا

مرتب رانا غلام سرور	بابائے گوجری
چودھری فیصل مشتاق	شیرازہ گوجری
ڈاکٹر رفیق انجم	لعلاں کا بنجارہ
ایضاً	جدید گوجری ادب
بابائے گوجری رانا فضل حسین	سچ مچ فیض
ایضاً	گوجری مرثیہ
ایضاً	بانہل بانہل پانی
ایضاً	رت کا نشان
پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین اظہر	فیچرز شہدائے کربلا
عبدالرشید چودھری	نین سمندر
منیر حسین چودھری	سانجھ

☆ ☆ ☆ ☆

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

تصوف اور ادب کا باہمی تعلق

تصوّف اور ادب کے تعلق پر بحث سے قبل ہمیں جاننا چاہیے کہ ادب اور تصوف کی تعریفیں کیا ہیں؟ اِن کے موضوعات کیا ہیں؟ اِن کے اسلوب بیان کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان میں کون کون سے پہلو باہمی مماثلت رکھتے ہیں؟ اِن مباحث کے ذریعے ہم ادب اور تصوف کے باہمی تعلق سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس مقالے میں انھیں سوالات کے جوابات اور موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تصوّف کیا ہے؟

تصوّف کیا ہے؟ اس اصطلاح پر کتب میں کثرت سے تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس لیے یہاں انتہائی مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ ’’تصوف کے معنی اپنے آپ کو صوفیانہ زندگی کے لیے وقف کرنا۔(۱)

۲۔ ’’محبت میں خلوص اور صفیّ سے مراد مخلص دوست کے ہیں۔‘‘(۲)

۳۔ امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں: عربی میں جب کوئی صوف کا لباس پہنے تو اس کے لیے تصوف بولتے ہیں۔(۳)

۴۔ تصوف کا ایک مادہ ’’الصوف‘‘ یک سُو کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔(۴)

۵۔ تصوف کا ایک مادہ ’’الصفہ‘‘ بھی بیان کیا جاتا ہے، یعنی مسجدِ نبویؐ کا وہ سائبان جہاں آپؐ صحابہؓ کو تعلیم فرماتے تھے۔(۵) گویا تصوف کے معنی اوصافِ اصحابِ صفہ سے قریب ہوتا ہے۔

۶۔ ’’علامہ لطفی جمعہ مصری نے اپنی کتاب ’’فلاسفۃ الاسلام‘‘ میں لکھا ہے کہ صوفی یونانی کلمہ ’’سوفیانہ‘‘ سے مشتق ہے جس کے معنی حکمتِ الٰہی کے ہیں۔‘‘(۶)

’’تصوف وہ کلمہ ہے جو صفا سے مشتق ہے جس کے معنی صفائی ہے۔‘‘(۷)

مذکورہ بالا تمام اشتقاقات سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اِن کے معنی و مفہوم میں کوئی منفی پہلو نہیں ہے۔ ہر اشتقاق کی گہرائی میں انسانیت، محبت، خلوص اور پاکیزگی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے، جو موجودہ عہد میں تیزی سے ناپید ہوتا جا رہا ہے، اسی لیے علمائے باطن نے تصوّف کی جو اصطلاحی تعریف متعین کی ہے، وہ

انسان کی ظاہری وباطنی اور اجتماعی زندگی کی فلاح وبہبود پر پوری اُترتی ہے۔ تصوّف وہ اصطلاح ہے جو انسان کی مکمل ظاہری اور باطنی زندگی پر محیط ہے۔ اسی سبب دورِ جدید میں تصوف کی سرحدوں کو وسعت دیتے ہوئے اس کی سائنسی اور سماجی تعریفیں بھی کی گئیں ہیں۔ شاہ مقصود عنقا نے تصوف کی سائنسی انداز میں تعریف کی ہے۔ ''طبیعی دنیا کو مابعدالطبیعاتی اصولوں کے مطابق سمجھنے کے علم کو عرفان (تصوف) کہا جاتا ہے۔''(۸) خرم مراد نے تصوف کی سماجی حوالے سے تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ احسان کے مترادف انگریزی لفظ excelence ہے، یعنی احسان سے مراد جو بھی کام کیا جائے وہ اعلا معیار کا ہو، خواہ وہ معاشی ہو یا تجارتی، سیاسی ہو یا مذہبی بہترین ہو۔(۹) گویا مرورِ ایام کے ساتھ تصوف کا انسانی زندگی اور معاشرے سے تعلق بڑھتا ہی جارہا ہے۔

ادب کیا ہے؟

ادب متنوع معانی کا حامل ہے۔ اردو میں اس کے معنوں میں تہذیب، احترام، شائستگی، تمیز، لحاظ، حفظِ مراتب اور معاشرے کے پسندیدہ طریقے شامل ہیں۔ ادب کے لغوی معنی کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> پرانی عربی میں ادب دعوتِ طعام کے مترادف تھا، چناں چہ لفظ مأدبہ اسی سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں طعام مہمانی چوں کہ عربوں کے نزدیک مہمان نوازی حسنِ اخلاق کی علامت تھی، اس لیے رفتہ رفتہ ادب تہذیب اور حسنِ اخلاق کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔(۱۰)

تعلیماتِ تصوف میں بھی لفظ ''ادب'' بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ جس طرح ادب کے لغوی معنوں میں طعام اور مہمان داری شامل ہے، اسی طرح صوفیانہ تعلیمات میں مہمان نوازی اور حسنِ اخلاق کی ترغیب بھی مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ابتدائی اور کچھ موجودہ خانقاہوں کی تعمیرات کو دیکھا جائے تو اُس میں پکانے کے لیے جگہ مخصوص نظر آتی ہے جسے لنگر خانہ کہا جاتا ہے۔ یہی نہیں مہمانوں کے قیام کے لیے مہمان خانہ بھی خانقاہ کے نقشے کا لازمی جز و رہے ہیں یعنی طعام اور مہمان نوازی کے لوازمات خانقاہ کے بنیادی اجزا ہیں۔ ان کے علاوہ عاجزی، انکسار اور حسنِ اخلاق بھی تصوّف کی تعلیمات کے اہم عناصر ہیں۔ گویا ادب کے لغوی معنی اور تصوف کے عملی مظاہر میں گہرا ربط ہے۔ صوفیوں کے ہاں ادب بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں مہمان نوازی اور حسنِ اخلاق کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث اور مرشد کی تعلیمات واحکامات پر خلوصِ نیت سے عمل کرنا بھی شامل ہے تو بزرگوں اور والدین کا احترام بھی۔

ادب کے اصطلاحی پہلو پر نظر کی جائے تو ادب ہی کیا فنونِ لطیفہ کی کسی بھی قسم کی مکمل اور جامع تعریف طے کرنا مشکل امر رہا ہے۔ اِن اصناف کی تفہیم کے لیے کاوشیں ہوتی رہی ہیں، جس کے نتیجے میں اصناف کے بنیادی اجزا پر کسی حد تک اتفاق رائے نظر آتا ہے۔ یہی صورت ادب کی بھی ہے۔ بہت کم تعریفیں ایسی ہیں جو ادب کی تعریف کا احاطہ کرتی ہوں۔ ”فروغِ اسلام کے ابتدائی زمانے میں ”ادب“ کو تعلیم کے معنی میں استعمال کیا گیا۔“ (۱۱) جب کہ عجمی تصور کے مطابق ادب سے مراد وہ علوم عربیہ ہیں، جن سے زبان پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اَدب کی عجمی تعریف کا مفہوم؛ ماضی اور حال میں بھی قبولیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ ادب کے اظہار کا وسیلہ الفاظ ہیں۔ زبان الفاظ کے مجموعے کا نام ہے۔ زبان پر قدرت کے لیے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ہیں۔ یہ تبدیلیاں ادب ہی کے توسط سے ہوتی ہیں۔ ادب کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ ”ہر تحریر کردہ لوازمہ ادب ہے۔“ (۱۲) سخاوی نے لکھا ہے کہ وہ تمام معلومات جو کتابوں سے حاصل ہوتی ہیں، ادب ہے۔ (۱۳) میتھو آرنلڈ نے لکھا کہ ”وہ تمام علم جو کتابوں کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے ادب ہے۔“ (۱۴) اگر ادب کے حوالے سے ان نظریات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو ہر تحریر کردہ لوازمہ، چاہے وہ سائنس، معاشیات، صحافت، سماجیات، قانونیات اور دفتری احکامات وغیرہ پر مشتمل ہو، ادب ہوسکتا ہے۔ ان سب کو اس لیے ادب نہیں کہا جا سکتا کہ یہ علوم مادی مسائل کی تشریح و تفہیم، غیر تخلیقی انداز سے کرتے ہیں۔ ان علوم سے داخلی کیفیت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ادبی اور غیر ادبی تحریر میں فرق ضروری ہے۔ ذیل میں اسی فرق کی وضاحت کی گئی ہے۔

ادبی اور غیر ادبی تحریر کا فرق

ادبی اور غیر ادبی تحریروں کی پہچان اور ان کے بارے میں واضح انداز میں بیان کرنا آسان نہیں ہے پھر بھی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ غیر ادبی تحریر میں اظہار مقصود ہوتا ہے، جب کہ ادبی تحریروں میں اظہارِ حسن بھی ضروری ہوتا ہے۔

۲۔ غیر ادبی تحریروں کے برعکس ادبی تحریروں میں مصنف کی ذات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

۳۔ ادبی تحریروں کا مواد عام انسانی دلچسپی پر مشتمل ہوتا ہے، غیر ادبی تحریر کے لیے یہ شرط نہیں۔

۴۔ غیر ادبی تحریر کسی ہیئت کی پابند نہیں ہوتی، جب کہ ادبی تحریر کے لیے کسی ہیئت کا پابند ہونا لازمی ہے۔

۵۔ ادبی تحریر میں تخیل بھی ہوتا ہے، جب کہ غیر ادبی تحریر تخیل سے عاری ہوتی ہے۔

۶۔ غیر ادبی تحریر مثلاً سائنسی، معاشیاتی اور دیگر تحریریں جذبات سے گریزاں اور ادبی تحریر

جذبات کو مائل کرتی ہے۔ غیر ادبی تحریر کا بنیادی مقصد معلومات کی فراہمی جب کہ ادبی تحریر کا مقصد مسرت بخشی اور حسن آفرینی بھی ہوتا ہے۔ (۱۵)

۷۔ ادبی تحریر یا ادب کے تین بنیادی مقاصد ہیں۔ (الف) جمالیاتی مسرت پہنچانا (ب) حیات وکائنات اور خود فرد کی ذات کے بارے میں آگہی بخشنا، جس سے قلب وذہن کو جلا ملے۔ (ج) قارئین کو کوئی خاص زاویۂ نظر یا طرزِ عمل اختیار یا رد کرنے کی ترغیب دینا۔ (۱۶)

چوں کہ فنونِ لطیفہ کی شاخ "ادب" کا لوازمہ مخصوص صفات کا حامل ہوتا ہے، اس لیے اس کی تعریف بھی مخصوص کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیومین (Newman) کے بقول "وہ تمام افکار اور احساسات جو زبان اور لفظ کے ذریعے ادا ہوں ادب کہلاتے ہیں۔" (۱۷) برک (Burk) نے ان خصوصیات میں یہ اضافہ بھی کیا کہ "اس قسم کی تحریر قاری کو انبساط اور مسرت بھی بہم پہنچاتی ہو۔" (۱۸) اسی طرح مائی کین (Miac an) نے لکھا ہے کہ انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ صفات کا اظہار ادب ہے۔ (۱۹) ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریر کردہ ادب کی اصطلاحی تعریف بہت حد تک جامع ہے۔ جس کے اہم نکات یہ ہیں۔ (۱) ادب فنونِ لطیفہ کی ایک قسم ہے۔ (۲) ادیب اپنے جذبات و احساسات اور افکار کے لیے ادب کو ذریعہ بناتا ہے۔ (۳) افکار وجذبات کی تنقید زندگی کے داخلی و خارجی حقائق کی روشنی میں کر کے اُسے الفاظ کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ (۴) ادیب اپنے تخیل اور قوتِ اختراع کی مدد سے پیرائے کو مؤثر اور دل نشین بنا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری و سامع اُسی طرح متاثر ہو جس قدر خود ادیب ہُوا ہو۔ (۲۰)

ادب اور تصوف کا باہمی ربط

ادب کی مذکورہ بالا تعاریف سے تصوف اور ادب کے باہمی ربط اور ان کے درمیان کئی مماثلتوں کا پتا چلتا ہے۔ ان مشترک صفات کو ذیل میں بحث کیا گیا ہے:

۱۔ ادبی تحریر کی طرح حسن اور تاثر صوفیانہ ادب کا بھی خاصہ ہوتا ہے۔

۲۔ ادبی موضوعات کی طرح صوفیانہ ادب میں بھی انسان کی عمومی دل چسپی کے موضوعات ہوتے ہیں۔ بلکہ تصوف تو "انسان کیا ہے کے بجائے انسان کو کیا ہونا چاہیے پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔" (۲۱)

۳۔ کیوں کہ صوفیانہ ادب کا موضوع "تصوف" ہے، اس لیے اسے ادب کی کسی بھی ہیئت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ ادب کا عمومی اور صوفیانہ ادب کا خصوصی مقصد حیات وکائنات اور ذات کے بارے میں

آ گہی دیتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ’’تصوف سرِّ حقیقت کی تفہیم کے لیے محض عقلی اور ظاہری حواس کے بجائے وجدان اور باطنی حواس کو بھی بنیاد بناتا ہے۔ یوں انسان کو زندگی کے تین مراحل یعنی خودشناسی، جہاں شناسی اور خداشناسی کو کامیابی سے سَر کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔‘‘ (۲۲) جب کہ ادیب اپنے وجدان کے ذریعے قاری کو آ گہی دیتا ہے۔

۵۔ ادیب کی طرح صوفی بھی افکار، جذبات اور احساسات کو سالکین یا لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ماہرِ معاشیات، سائنس دان، صحافی، ماہرِ سماجیات وغیرہ بھی اپنے افکار کو قلم بند کرتے ہیں۔ ان افکار کا خارجی حالات کی روشنی میں تنقیدی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ جب کہ وہ ادیب اور صوفی کی طرح اپنے جذبات اور احساسات کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ اُن کا انداز خالصتاً منطقی ہوتا ہے۔ جب کہ ادیب اور صوفی کے جذبات اور احساسات تحریر میں موجود ہوتے ہیں، جن کا منبع قلب ہوتا ہے۔

ادیب اور صوفی دونوں قوتِ مخترعہ اور تخیّل کی مدد سے تحریر کو مؤثر پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صوفیانہ ادب میں اثر کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ملفوظات جو خالص صوفیانہ ادب کی صنف ہے۔ اس کی تاثیر مسلّم ہے۔ جس طرح مؤثر ادب کی تخلیق کے لیے زندگی کے داخلی پہلو کی اہمیت ہے، اسی طرح تصوّف میں بھی انسانی زندگی کے داخلی پہلو (روح) کی کھوج کو اولیت حاصل ہے۔ اس کھوج میں کامیابی کے لیے زندگی کے خارجی عوامل معاونت کرتے ہیں۔ گویا ادب کی طرح تصوف میں بھی انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کی اہمیت ہوتی ہے۔ صوفی تصوف کی تعلیمات کو اپنے داخل کا جزو بناتا ہے، پھر اس کا بیان کرتا ہے، یوں صوفی کی لکھی ہوئی تحریر ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ کے مصداق پُرتاثیر ہوتی ہے، اسی طرح وہی ادب مؤثر ہوتا ہے جو ادیب کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے یعنی ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ کا ترجمان ہو۔

جہاں تک ادب کے موضوعات کا تعلق ہے تو ادب کا موضوع بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان اور انسانی زندگی سے متعلق ہے، یعنی دنیا کی کوئی چیز بھی ادب کا موضوع بن سکتی ہے، البتہ زندگی کے قریب ترین موضوعات کی اہمیت زیادہ ہوگی۔ بالعموم نقادوں نے ادب کے موضوعات کو چھے بنیادی مضامین میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) خدا اور انسان سے اس کا تعلق (۲) روحانی دنیا اور اس کے کوائف (۳) انسان (۴) انسانی زندگی اور اس کے تمام متعلقہ کوائف (۵) فطرت (مظاہر اور مناظر) اور انسان کا فطرت سے تعلق (۶) آرٹ یا فن (۲۳)

مذکورہ بالا مضامین میں سے پانچ کا براہِ راست تعلق تصوف سے بھی ہے، جہاں تک آخری مضمون کا تعلق ہے تو غیر محسوس طور پر تصوف میں موجود ہوتا ہے، کیوں کہ فن کا ایک اہم پہلو حسن اور تاثیر ہے تو وہ تصوف میں آ ہی جاتا ہے۔

ادب میں تخلیقی عمل کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے، کروچے نے تخلیقی عمل کو چار مدارج میں تقسیم کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ تاثرات۔
۲۔ اظہار یعنی متخیلہ میں وجدانی امتزاج یا ترکیب
۳۔ وہ لذت جو فن کار کو اس امتزاج سے حاصل ہوتی ہے۔
۴۔ اس جمالیاتی حقیقت کی مادی صورت پذیری مثلاً آوازوں، حرکتوں، خطوط اور رنگوں وغیرہ کے امتزاج سے فن پارے کی تعمیر۔

لیکن ان مدارج میں سے جس کی نوعیت صحیح معنوں میں جمالیاتی ہے، وہ نمبر۲ ہے، نمبر۳ اور۴ محض تجربہ ہیں۔(۴۴)

کروچے نے تخلیقی عمل میں اظہار یعنی متخیلہ میں وجدانی امتزاج کو خصوصی اہمیت دی ہے، ادیب کی یہی وجدانی صلاحیت اور کیفیت ادب کو اعلا معیار عطا کرتی ہے۔ غالبؔ نے اسی لیے کہا ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ادب کی طرح تصوف میں بھی وجدان کی اہمیت مسلّم ہے۔ کروچے کے تخلیقی عمل کے چوتھے درجے سے یہ نکتہ عیاں ہوتا ہے کہ فن میں جمالیاتی حقیقت کو مادی صورت دی جاتی ہے، یہ جمالیاتی حقیقت کیا ہے؟ جمالیاتی حقیقت سے مراد آفاقی حسن ہے، جسے ادب میں پیش کیا جائے تو وہ بھی زمان و مکاں کی قید سے ماورا اور آفاقی ہو جاتا ہے۔ حسن کیا ہے؟ حسن کسی شے میں عناصر کے توازن اور اعتدال کا نام ہے۔ حسن کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ”اصولاً حسن ایک ناقابلِ تعریف کیفیت ہے، اس کا ادراک عجیب و غریب پُراسرار باطنی رشتوں اور راستوں سے ہوتا ہے، اسی لیے ایک خیال یہ ہے کہ حسن دراصل دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے، یعنی یہ دیکھنے والے کی اپنی ذہنی کیفیت کا اظہار یا انعکاس ہے، اس کے برعکس ایک رائے یہ بھی ہے کہ حسن شے میں ہوتا ہے یعنی شے کو

> دیکھ کر فرد مسرت حاصل کرتا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ حسن ایک مشترک صفت یا مرکب کیفیت ہے، جس میں دیکھنے والا اور وہ شے جسے حسین سمجھا جاتا ہے، دونوں باہم مل کر ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں۔“ (۲۵)

آخرالذکر رائے زیادہ صائب محسوس ہوتی ہے کیوں کہ بعض مرتبہ ایک شے کو بیش تر لوگ حسین یا معیاری قرار نہیں دیتے مگر کچھ لوگوں کو وہ حسین اور معیاری محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر ادب پارے میں مختلف یا متضاد آرا کا پایا جانا عمومی رویہ ہے۔ حسن اگر شے میں ہو تو حسین شے پر سب کی آرا ایک ہو، اسی طرح حسن آنکھ میں ہو تو شے پر مختلف و متضاد اور کثرت سے آرا ہوں گی۔ جب کہ شے اور آنکھ دونوں میں حسن ہو تو بیش تر آرا کا یکساں یا مماثل ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اس حوالے سے سید عبداللہ نے ایک اہم نکتہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ حسن کا تعلق پُراسرار باطنی رشتوں سے ہوتا ہے۔ اس باطنی تعلق کی تفہیم ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے یوں کی ہے۔

> ”قلبِ انسان کی ایسی موضوعی قوتوں کا سرچشمہ ہے جو اپنی نوعیت میں فعلی اور انفعالی ہیں۔ فعلی قوتوں کے ماٰخذ کا نام دماغ ہے اور انفعالی قوتوں کے مبدأ کو دل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ دماغ بہت سی قوتوں کا سرچشمہ ہے، جن میں سے تصور، تخیُّل، تعقل، تفکُّر اور تذکُّر جمالیات کی رو سے بہت اہم ہیں، اسی طرح دل بھی متعدد انفعالی قوتوں کا منبع ہے، جن میں سے وجدان اور حِسِ جمال یا جمالیاتی حس کی قوتیں اہم امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔“ (۲۶)

جس باطنی قوت کا اظہار سید عبداللہ نے کیا ہے، اُس باطنی قوت کا منبع دل ہے۔ جس کی اہم خصوصیت وجدان اور حِسِ جمال ہے۔ دل کا تعلق ادب کی طرح تصوُّف سے بھی گہرا ہے۔ حسن پر ایک طویل بحث کے بعد سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ ادب میں معنی کے کامیاب اظہار کا نام حسن ہے اور شناخت اس کی یہ ہے کہ ناظر یا سامع یا قاری اس اظہار سے مطمئن ہونے کے ساتھ، مسرت اور طبیعت میں کشادگی محسوس کرے۔ (۲۷) اس میں مزید اضافہ یوں کرتے ہیں کہ ”ممکن ہے آج کا قاری، اپنی کوتاہی سے اس کا ادراک نہ کر سکے لیکن اگر وہ زبان زندہ ہے اور اس میں ذوقیات کا تجربہ بند نہیں ہُوا تو آئندہ کا قاری اس غلطی کی اصلاح کر دے گا۔“ (۲۸)

تخلیقی عمل کا ایک نکتہ جمالیاتی حقیقت ہے۔ یہ حقیقت کیا ہے؟ اس بارے میں کروشے کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ

> ''حقیقت'' کا کوئی متعین مفہوم نہیں ہے، لہٰذا جو شے ذہن کے نزدیک حقیقی ہے، وہی حقیقت ہے، حقیقت کی دو اقسام ہیں، ایک وہ جو ذہن سے باہر موجود ہے اور ایک وہ جو اس کے اندر ہے، مگر اُس کے نزدیک ذہن سے باہر کچھ بھی نہیں، اگر چہ ذہن اپنے بعض مقاصد کے لیے بعض بیرونی اشیا کو حقیقت تصور کر سکتا ہے۔'' (۲۹)

یہ نکتہ کہ ''حقیقت' کا کوئی متعین مفہوم نہیں ہے۔'' ہمیں حقیقتِ واحد کے ایک اہم بنیادی پہلو کی آگہی فراہم کرتا ہے۔ اگر حقیقت کا مفہوم متعین کرتے ہیں تو اُس کی تحدید ہوتی ہے۔ جب کہ حقیقت، واحد ہونے کے ساتھ ساتھ لامحدود بھی ہے۔ یہ دونوں پہلو تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب حقیقت کا مفہوم متعین نہیں ہوگا تو اس کی تفہیم کے زاویے تبدیل ہوتے رہیں گے۔ گویا معنوی تہ داری حقیقت کا ایک جزو ہے۔ دوسرا نکتہ اس بیان سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت کی دونوں قسمیں بھی اپنے اندر اہم پہلو رکھتی ہیں۔ ذہن کے باہر حواس کے ذریعے جو کچھ محسوس کیا جاتا ہے، اس میں بھی ہر فرد مختلف انداز سے محسوس کر سکتا ہے۔ یعنی ذہن کے باہر جو کچھ بھی ہے اُس میں بھی لامحدودیت کی جھلک ہے۔ ایک ہی شے کو لوگ علاحدہ کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ اُن سب کے ہاں اندر کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ ذہن کے باہر جو کچھ موجود ہے، وہ اندر کی فکر کے ساتھ مل کر مفہوم دیتا ہے گویا ہر شخص کا تجربہ علاحدہ ہو سکتا ہے۔

کروشے نے تخلیقی عمل کے لیے جمالیاتی حقیقت کے اظہار کے لیے مادی صورت پذیری کو ضروری قرار دیا ہے۔ یہ حقیقت ذہن کے قریب ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ذہن کے باہر اور ایک ذہن کے اندر، پھر وہ کہتا ہے ''ذہن کے باہر کچھ بھی نہیں، اگر چہ ذہن اپنے بعض مقاصد کے لیے اشیا کو حقیقت تصور کر سکتا ہے۔'' کروچے کے اس بیان سے خارجی دنیا کا وجود شک کا شکار ہو جاتا ہے، یعنی ذہن باہر کی اشیا کو حقیقت تصور کر سکتا ہے، جب کہ وہ حقیقت نہیں ہے۔

عابد علی عابد نے کانٹ کے تنقیدی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، اس سے بھی تصوّف اور ادب کے تعلق کا پہلو سامنے آتا ہے۔

> ''کانٹ نے انتقادِ عقلِ محض میں یہ دعویٰ کیا کہ عقلِ محض کا مطلب وہ علم نہیں جو حواس کے مسخ شدہ ذریعوں سے ہم تک پہنچتا ہے، عقلِ محض کا مطلب وہ علم ہے، جس کے ماخذ حواس نہیں بلکہ جو تمام تجرباتِ حسی سے ماورا اور مستغنی ہے، یہ وہ علم ہے جو ہمیں ذہن کی ساخت اور اس کی داخلی فطرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔'' (۳۰)

کانٹ کے حوالے سے عابد علی عابد مزید بیان کرتے ہیں:

> ”کانٹ کے خیال میں خدا کا تصور اسی عقلِ محض کا مرہونِ منت ہے، گویا خدا کا تصور ہمارے ذہن کی ساخت اور اس کی داخلی فطرت میں شامل ہے۔ اربابِ تصوف نے بھی حواسِ خمسۂ ظاہری سے ماورا، حواسِ خمسۂ باطنی کا ذکر کیا ہے۔ ان کو کبھی القا، کبھی شہود اور کبھی وجدان کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ خدا کا تصور ہماری ذہنی ساخت میں شامل ہے:۔

وہ اپنی نظیر آپ ہے اور اپنی مثیل آپ
آنکھوں سے نہاں، دل میں عیاں، اپنی دلیل آپ (۴۱)

کانٹ عقلِ محض کو وہ علم قرار دیتا ہے جو حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ علم ذہنی ساخت اور داخلی فطرت کے سبب حاصل ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ وجدان کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ خدا کے تصور کے لیے عقلِ محض کو ضروری قرار دیتا ہے جو جمالیاتی حقیقت بھی ہے، اللہ جمیل یحب الجمال: اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ اہلِ تصوف بھی حواسِ باطنی کو مشاہدۂ حق کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ تصوف اور ادب کے تعلق اور اس کی تقسیم کے حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی یہ عبارت بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے:

> ”تصوف ایک طرزِ زندگی ہونے کے علاوہ علمی اعتبار سے عرفانی عقائد و نظریات کا ایک مجموعہ بھی ہے اور ایک ذہین آدمی کے لیے ان عقائد و نظریات کو علمی حیثیت سے ذہن نشین کر لینا چنداں مشکل نہیں۔ صوفیانہ موضوعات و مسائل سے اس قسم کا علمی شغف بہت سے اردو شعرا کے ہاں مل جاتا ہے، اسے اصطلاح میں علمی یا نظری تصوف کہتے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ مرزا غالبؔ ایک دنیادار انسان تھے، انھیں صوفی قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن تصوف کے فلسفیانہ اور نظریاتی پہلو کے بارے میں انھیں ایسی آگہی حاصل تھی کہ وحدت الوجود اور نفی جیسے مسائل پر ان سے بہتر شعر کوئی نہ کہہ سکا۔ ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ تصوف کی علمی حیثیت ایک ثانوی چیز ہے، دراصل یہ ایک طرزِ حیات ہے اور اس خاص طرزِ حیات کو اپنانے والے لوگ ہی صوفی کہلاتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ ایک صوفی تھے، انھوں نے صوفیانہ واردات و کیفیات اور عرفان کی روحانی منازل کا ایک سچے صوفی کی طرح تجربہ کیا تھا۔ تصوف ان کے ہاں فقط قال نہیں بلکہ حال بھی ہے، محض گفتار نہیں، یہ ان کا کردار بھی ہے۔ اگر غالبؔ کے ہاں تصوف کی حیثیت ایک نظریے کی ہے تو میر دردؔ کے ہاں ایک روحانی تجربے کی۔

> غالبؔ فلسفۂ تصوف میں دلچسپی لیتے ہیں تو میر دردؔ وارداتِ تصوف سے۔ غالبؔ کا تصوف نظری ہے تو میر دردؔ کا عملی۔ میر درد کی شاعری ان کی تابناک صوفیانہ زندگی کا عکس ہے جب کہ غالبؔ کے صوفیانہ اشعار مسائل و معاملاتِ تصوف سے غالبؔ کی نظری آگہی کا نتیجہ۔‘‘(۳۲)

ادب کے حوالے سے ’’ادب برائے زندگی‘‘ کے نظریے نے جو مقبولیت حاصل کی، اُس سے ہر ادب شناس واقف ہے۔ یہ زندگی کیا ہے؟ بقول سلیم احمد:

> عسکری صاحب نے ہمیں بتایا کہ زندگی کو دیکھنے کے لیے ’’زندگی، زندگی‘‘ چلّانے کی ضرورت نہیں ہے، زندگی کو اپنے اندر اور اپنے باہر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ باہر سے زیادہ اپنے اندر، کیوں کہ باہر کا پتا بھی اندر دیکھنے سے چلتا ہے۔(۳۳)

تصوف کیا ہے؟ تصوف تو اندر یعنی باطن ہی میں دیکھنے کا نام ہے۔

عظیم ادب کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ روایت سے پیوستہ ہوتا ہے۔ یہ روایت کیا ہے؟ عموماً روایت ایسے عمل کو کہا جاتا ہے جو بطور رسم و رواج معاشرے میں جاری ہو۔ یہ عمل زندگی کے مختلف پہلوؤں یعنی رہن سہن، خورد و نوش، نشست و برخاست، شادی و مرگ اور گفت و شنید وغیرہ میں ہوتا ہے۔ معنی و مفہوم اور اظہار کا وہ انداز جو ماضی میں مستعمل رہا ہو اور اسے ماضی کے ساتھ ساتھ حال میں بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہو اور مستقبل میں بھی اُس کی اہمیت برقرار رہنے کا قوی امکان ہو، روایت کہلانے کا مستحق ہے۔ ایلیٹ کے نزدیک:

> ’’روایت کا معاملہ بہت وسیع اہمیت کا حامل ہے، یہ میراث میں نہیں ملتی اور اگر کوئی اسے حاصل بھی کرنا چاہے تو اس کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔ اوّل تو اسے تاریخی شعور کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔ تاریخی شعور کے لیے ادراک کی ضرورت پڑتی ہے، نہ صرف ماضی کی ’’ماضیت‘‘ کی بلکہ اس کی موجودگی کی بھی۔۔۔۔ تاریخی شعور، جس میں لازماں اور زماں کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے، وہ چیز ہے جو ادیب کو روایت کا پابند بناتا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو کسی ادیب کو ’’زماں‘‘ میں اس کے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتا ہے۔‘‘(۳۴)

ایلیٹ مزید لکھتے ہیں، شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماضی کا شعور حاصل کرے اور ساری عمر اس شعور کو پروان چڑھاتا رہے اور اپنی ذات کو مسلسل کسی ایسی چیز کے سپرد کرتا رہے جو اس کی ذات سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ ایک فن کار کی ترقی اپنی ذات کی مسلسل قربانی اور اپنی شخصیت کو معدوم کرنے میں ہے۔ اس کے لیے انھوں نے ایک سائنسی مثال بھی پیش کی کہ جس طرح آکسیجن اور سلفر ڈائی اوکسائیڈ سے بھرے ہوئے چیمبر میں پلاٹینم کا ٹکڑا ڈالا جائے تو سلفیورس ایسڈ پیدا ہوتی ہے، جب کہ پلاٹینم بھی متاثر نہیں ہوتا یعنی غیر جانب دار اور غیر مبدّل رہتا ہے، شاعر کا دماغ بھی پلاٹینم کی طرح ہوتا ہے۔ (۳۵) ذات کو فنا کرنا اور غیر جانب دار رہنا تصوف میں اہم عناصر ہیں۔ غیر جانب دار ہونے سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنی سوچ کو الہامی معاملات میں داخل نہ کرے۔ ایلیٹ آخر میں اپنے اس مضمون پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ مضمون مابعد الطبیعات یا تصوف کی سرحدوں کی طرف رجوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہی نہیں ایلیٹ نے اپنے مضمون ''مذہب اور ادب'' کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے۔

> جو کچھ مَیں کہنا چاہتا ہوں وہ زیادہ تر اس قول کی حمایت میں ہے کہ 'ادبی تنقید' کی تکمیل ایسی تنقید سے ہوتی چاہیے، جس کی بنیاد معیّن اخلاقی اور دینی زاویہ نظر پر قائم ہو، اگر کسی دور میں اخلاقی اور دینی معاملات میں باہمی اتفاق موجود ہے تو ایسے میں ادبی تنقید بھی ٹھوس اور پُرمغز ہوتی ہے۔ (۳۶)

محمد حسن عسکری نے ایلیٹ کے نظریۂ روایت کے اِن پہلوؤں پر اعتراضات کیے: (ا) روایت کا دار و مدار عقائد پر نہیں (۲) روایت وقیع ترین مذہبی رسوم سے لے کر سلام کرنے کے طریقے تک ان سارے افعال کا مجموعہ ہے جو ایک جگہ رہنے والے اور ایک نسل کے لیے معمول بن گئے ہیں۔ حسن عسکری روایت کے حوالے سے رُنے گیوں (واحد یحیٰی) کے نظریے کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''مغرب میں اس سوال کا جواب صرف ایک شخص نے دیا ہے اور مغرب اس شخص کی بات سننے سے انکاری ہے، میرا مطلب رُنے گیوں سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روایتی ادب اور روایتی فنون صرف روایتی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں اور روایتی معاشرہ وہ ہے جو مابعد الطبیعات کی بنیاد پر قائم ہو، مابعد الطبیعات چند نظریوں کا نام نہیں۔ التوحیدُ واحدٌ مابعد الطبیعات صرف ایک ہی ہو سکتی ہے، یہی اصلی اور بنیادی روایت ہے، اس کا تعلق کسی نسل یا ملک سے نہیں البتہ اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں اور ہندو روایت یا چینی روایت یا اسلامی روایت میں فرق انھیں طریقوں کے

اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔''(۴۷)

غرض یہ کہ ادب کی تخلیق وتنقید میں مابعد الطبیعات اور تصوف کی اہمیت مسلّم ہے۔ ادب کا تصوف سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ادب زندگی کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا بیان ہے تو تصوف ان پہلوؤں کی مثبت عملی تصویر ہے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، جلد ششم، (لاہور، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۶۲ء، طبع اوّل)، ص ۴۲۸۔

۲۔ ''المنجد''، (کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۶۰ء، اشاعت اوّل)، ص ۶۹۴، ۶۹۵۔

۳۔ قشیری، عبدالکریم: ''الرسالۃ القشیریہ'' [بنام تصوف کا انسائیکلو پیڈیا]، مترجم: محمد عبدالنصیر، (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، سن ندارد)، ص ۴۱۶۔

۴۔ اللغات'': ص ۱۱۳ بحوالہ، طاہر القادری محمد، ڈاکٹر: ''حقیقتِ تصوف'' (لاہور، منہاج القرآن، مارچ ۲۰۰۵ء، اشاعت نہم)، ص ۸۱۔

۵۔ ابراہیم مصطفیٰ: ''المعجم الوسیط''، (لاہور، مکتبہ رحمانیہ، سن ندارد)، صفحہ ۶۰۹۔

۶۔ بحوالہ: عبدالصمد الازہری: ''تاریخ تصوف''، (لاہور، ادارہ علمیہ، ۱۹۶۹ء، بار اوّل)، ص ۹۔

۷۔ ارسلان الدمشقی، الشیخ: ص ۳۹ بحوالہ طاہر القادری: ''حقیقتِ تصوف''، ص ۸۴، ۸۵۔

۸۔ عنقا، شاہ مقصود صادق: ''پیامِ دل''، (کراچی، مکتب طریقتِ اویسی شاہ مقصودی، ۲۰۱۰ء، طبع اوّل)، سرورق فلیپ۔

۹۔ خرم مراد: ''احسان کا صحیح اصلاحی تصور''، (منصورہ، منشورات لاہور، ۲۰۰۷ء، طبع اوّل)، ص ۱۵۔

۱۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''مباحث''، (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، طبع اوّل)، ص ۳۲۲۔

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، (کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۱ء، اشاعتِ دوم)، ص ۵۷۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۷، ۵۸۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۸۔

۱۴۔ ایضاً، ۵۸۔

۱۵۔ حفیظ صدیقی ابو الاعجاز: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، طبع دوم)، ص ۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۔

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۸۔

۱۸۔ انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۸۔

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۵۸۔

۲۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''مباحث''، ص ۳۴۳۔

۲۱۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص ۲۷۱۔

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ عابد علی عابد، سید: ''اصولِ انتقادِ ادبیات''، (لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۰ء، طبع اوّل)، ص ۳۴۔

۲۴۔ عابد علی عابد، سید: ''اسلوب''، (لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۶ء، طبع دوم)، ص ۸۔

۲۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''اشاراتِ تنقید''(لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۲ء، دوسرا ایڈیشن)، ص ۲۵۲۔

۲۶۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: ''جمالیات''، (لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء، اشاعتِ اوّل)، ص ۸، ۹۔

۲۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''اشاراتِ تنقید''، حواشی ص ۲۵۱ تا ۲۵۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۵۶۔

۲۹۔ ڈیورانٹ ول: ''داستانِ فلسفہ''، بحوالہ: عابد علی عابد سید: ''اسلوب''، ص ۱۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۔

۳۱۔ عابد علی عابد، سید: ''اسلوب''، ص ۱، ۲۔

۳۲۔ حفیظ صدیقی ابوالاعجاز: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، ص ۳۸، ۳۹۔

۳۳۔ سلیم احمد: پیش لفظ، مشمولہ محمد حسن عسکری: ''جھلکیاں''، حصہ اوّل، مرتبین: سہیل عمر اور نعمانہ عمر؛ (لاہور، مکتبہ الروایت، سن ندارد)، ص ہ۔

۳۴۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، (اسلام آباد، نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۹۷ء، طبع ششم)، ص ۵۰۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹۔

۳۶۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: ''ایلیٹ کے مضامین''، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، طبع دوم)، ص ۲۲۳۔

۳۷۔ محمد حسن عسکری: ''وقت کی راگنی''، (لاہور، مکتبہ محراب، ۱۹۷۹ء، طبع اوّل)، ص ۱۰۸۔

کتابیات

حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز: ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، طبع دوم، ص ۸۔

خرم مراد: ''احسان کا صحیح اصلاحی تصور''، منصورہ، منشورات لاہور، ۲۰۰۷ء، طبع اوّل۔

سدید، ڈاکٹر انور: ''اردو ادب کی تحریکیں''، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۱ء، اشاعتِ دوم۔

سلیم احمد: پیش لفظ، مشمولہ محمد حسن عسکری: ''جھلکیاں''، حصہ اوّل، مرتبین: سہیل عمر اور نعمانہ عمر؛ لاہور، مکتبہ الروایت، سن ندارد۔

طاہر القادری محمد: ''حقیقتِ تصوف''، لاہور، منہاج القرآن، مارچ ۲۰۰۵ء، اشاعت نہم۔

عابد علی عابد، سید: ''اصولِ انتقادِ ادبیات''، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۰ء، طبع اوّل۔

عابد علی عابد، سید: ''اسلوب''، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۶ء، طبع دوم۔
عبدالصمد الازہری: تاریخِ تصوف، لاہور، ادارہ علمیہ، ۱۹۶۹ء، بارِ اوّل۔
عبداللہ، ڈاکٹر سید: ''اشاراتِ تنقید'' لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۲ء، دوسرا ایڈیشن۔
عبداللہ، سید ڈاکٹر: ''مباحث''، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، طبع اوّل۔
عنقا، شاہ مقصود صادق: ''پیامِ دل'' مکتبِ طریقت اویسیؒ شاہ مقصودی، ۲۰۱۰ء، طبع اوّل۔
قشیری، عبدالکریم: ''الرسالۃ القشیریہ'' (بنام تصوف کا انسائیکلوپیڈیا)، مترجم: محمد عبدالنصیر، لاہور، مکتبہ رحمانیہ، سنہ ندارد۔
نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: ''جمالیات''، لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۶ء، اشاعت اوّل۔
جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۷ء، طبع ششم۔
جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''ایلیٹ کے مضامین''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، طبع دوم۔
عسکری، محمد حسن: ''وقت کی راگنی''، لاہور، مکتبہ محراب، ۱۹۷۹ء، طبع اوّل۔

لغت اور انسائیکلوپیڈیا

''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، جلد ششم، لاہور، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۶۲ء، طبع اوّل۔
معجم الوسیط، ابراہیم مصطفیٰ: لاہور، مکتبہ رحمانیہ، سن ندارد۔
''المنجد''، کراچی، دارالاشاعت، اشاعت اوّل، ۱۹۶۰ء۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر انصار احمد شیخ

فورٹ ولیم کالج کی علمی و ادبی خدمات

ایسٹ انڈیا کمپنی کے نووارد سول اور فوجی ملازمین جو یورپ سے ہندوستان آتے تھے۔ وہ مقامی زبانوں سے ناواقف ہوتے تھے۔ جس کے سبب وہ زندگی کے ہر میدان میں اپنے آپ کو مشکل میں گھرا پاتے تھے۔ لارڈ ویلزلی نے ایسے موقع پر ان کی مشکل کشائی کے لیے گل کرسٹ کا انتخاب کیا۔ چناں چہ ویلزلی کے ایما پر گل کرسٹ نے اورینٹل سیمنری کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔(۱) اس مدرسے کے تحت کمپنی کے ملازمین کو زبانوں سے واقفیت کرانے کے لیے باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مدرسہ ہندوستانی زبان کی تعلیم کے لیے ابتدائی اور تجرباتی اقدام تھا، جو نیک فال ثابت ہوا اور اسے چہار طرف سے خاطر خواہ پذیرائی ملی۔ اسی کے پیشِ نظر لارڈ ویلزلی کو فورٹ ولیم کالج کے قیام کی ہمت ہوئی۔ چناں چہ بنگال میں فورٹ ولیم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمین کی بہتر تعلیم و تربیت کے لیے ایک کالج کی بنیاد بتاریخ ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء، ۷ اصفر ۱۲۱۵ھ ڈالی گئی، جو دراصل سلطنتِ میسور کے دارالحکومت سیرنگاپٹم میں برطانوی افواج کی فیصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ ہے۔(۲)

کالج کے انتظامی امور مکمل ہونے کے فوراً بعد یعنی ۲۴؍نومبر ۱۸۰۰ء سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اسی تاریخ سے عربی و فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں لیکچر کا آغاز ہوا۔(۳) فورٹ ولیم کالج کا بانی اور روحِ رواں لارڈ ویلزلی تھا۔ اس کے عہد میں تصنیف و تالیف کو عروج بھی حاصل رہا۔ اس کے گورنر جنرل رہنے تک کالج کے خلاف متعدد بار محاذ آرائی کی گئی، مگر اس نے ہر محاذ پر ان سازشوں کا مردانہ وار ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۲۹؍اگست ۱۸۰۵ء کو ویلزلی کے مستعفی ہو کر ولایت چلے جانے کے بعد مجلس نظما کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا طوفان ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس سے نمٹنے کے لیے یہاں کوئی نہیں تھا، اگرچہ کالج میں تصنیف و تالیف کا کام ویلزلی کے چلے جانے کے بعد انتہائی سست روی سے چل رہا تھا اور کچھ قلمی نسخوں کی اشاعت کا کام ۱۸۵۰ء تک جاری رہا، لیکن اس کالج سے کمپنی کے مقاصد کلّی طور پر پورے نہیں ہو رہے تھے۔ کالج میں پڑھنے والوں کی نسبت پڑھانے والوں کی کثیر تعداد اب بھی یہاں تعینات تھی۔ جس کی مد میں خطیر رقم خرچ ہو رہی تھی۔ بالآخر ۲۴؍جنوری ۱۸۵۴ء کو گورنر جنرل نے مدِ فضول سمجھ کر اس کے خاتمے کے لیے سرکاری

طور سے فرمان جاری کر دیا (۴) یوں ۵۴ سال اردو زبان و ادب کی بے مثل خدمت کرنے کے بعد اس یادگار کالج کا چراغ گُل ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد زبان و ادب کی خدمت تھا اور نہ ہی ہندوستانی عوام کی ترقی و فلاح و بہبود مطمحِ نظر تھی۔ سیاسی حالات پر مکمل گرفت جیسے مفادات اُن کے پیشِ نظر تھے۔ انگریز اس بات سے بہ خوبی آگاہ ہو چکے تھے کہ جونووارد ہندوستان کم سنی میں آ جایا کرتے ہیں۔ وہ مکمل تعلیم و تربیت حاصل نہ کرنے کے سبب زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں، یعنی وہ یہاں کم تعلیمی قابلیت ہونے کی بنا پر بمشکل کلرک کی جگہ حاصل کر پاتے تھے۔ ولزلی نے جب یہ مخدوش صورتِ حال دیکھی تو اُسے انگریزوں کا مستقبل خطرے میں نظر آیا۔ چناں چہ ولزلی کی مساعی اور حکومتِ برطانیہ کی اجازت سے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کالج کے قیام سے قبل اردو کی تعلیم کا کوئی باقاعدہ معقول انتظام نہیں تھا۔ دیسی کالج کے نام سے وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اوّل نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ جس میں ہندوستانی طلبا اور انگریز ملازم فارسی کی تحصیل کیا کرتے تھے۔ کمپنی ان کو تیس روپے فی کس تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دیا کرتی تھی۔ (۵) لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ فارسی زبان بھی اپنی وقعت کھوتی گئی اور اس کی جگہ رفتہ رفتہ اردو زبان کو عروج حاصل ہوتا گیا۔ چناں چہ انگریزوں نے اردو کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ اس کو سیکھنے کی طرف مرکوز کر دی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ اس کے ذریعے وہ اردو زبان سے واقفیت، ہندوستانی رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور طور طریقے سے آشنا ہو کر ہندوستان میں حکمرانی کے قابل ہو جائیں۔

کالج کے قیام کے ساتھ ولزلی نے ملک بھر سے تعلیم یافتہ لوگوں کو کلکتہ آنے کی دعوت دی، تاکہ وہ کالج میں آ کر تدریس کا آغاز کر سکیں۔ چناں چہ انتہائی مختصر عرصے میں پچاس سے زائد اہلِ علم اس منصب پر فائز ہو گئے۔ شعبۂ ہندوستانی میں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے فرائض انجام دینے والوں کو کالج کی زبان میں 'منشی' کہا جاتا تھا۔ ان منشیوں کو مقابلے کا امتحان پاس کر کے ملازم رکھا جاتا تھا اور ان کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ عموماً یہ چالیس روپے سے لے کر دو سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ (۶) جب کہ انگریز اساتذہ کی تنخواہیں خاصی پُرکشش ہوتی تھیں، یعنی لیفٹیننٹ جان بیلی عربی پروفیسر تنخواہ سولہ سو روپے ماہانہ اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ پروفیسر ہندوستانی پندرہ سو روپے ماہانہ پاتے تھے۔ حالاں کہ یہ منشیوں کی نسبت کام بھی کم کیا کرتے تھے اور ان انگریز پروفیسروں کی معاونت کے لیے ہر شعبے میں منشی اور پنڈت کا تقرر کیا جاتا تھا، جو بہ وقتِ ضرورت ان کے کاموں میں مدد دینے اور طلبہ کے نصاب کی کتابیں تیار کرنے کا کام بھی

انجام دیا کرتے تھے۔ لہٰذا کالج کے قیام کے تھوڑے ہی عرصے میں لغات، داستان، تواریخ اور قصے کہانیوں کی کتابیں بڑی تعداد میں تیار ہو گئیں۔ تصنیف و تالیف اور ترجمے کا یہ کام کالج کے بند ہونے تک جاری رہا۔ اس کالج کی تصانیف میں طبع زاد کی تعداد بہت مختصر ہے، جب کہ تراجم کثرت سے ہوئے۔

کالج کے مصنفین میں میر بہادر علی حسینی، میر امّن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مظہر علی خاں ولاؔ، کاظم علی جواںؔ، خلیل علی خاں اشکؔ، تارنی چرن متر، میر بخشش علی، للو جی لال کوی، سدل مشر، سید منصور علی، میر معین الدین فیض، سیّد حمید الدین بہاری، غلام حیدر، شیخ امانت اللہ شیداؔ، مرزا جان طپش، نور علی، سیّد علی، بینی نرائن جہاںؔ، کندن لال، تو تارم، شیخ حفیظ الدین احمد، اکرام علی، مرزا علی لطفؔ، نہال چند لاہوری، محمد بخش، باسط خاں باسطؔ، حاجی مرزا مغل نشاںؔ، میر ابوالقاسم، محمد علی، نور خاں، مرزائی بیگ وغیرہ نے کتابیں لکھ کر اردو نثر کے خزانے میں گراں قدر اضافے کیے۔ مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے منظور شدہ تصنیف پر انعام دیا جاتا تھا۔ چناں چہ میر امّن کو "باغ و بہار" پر پانچ سو اور حاجی مرزا مغل کو "بوستان" پر چار سو روپے انعام دیے گئے۔ اس طرح انعام کا اعلان کر کے کالج سے باہر غیر متعلق مصنفین کو بھی رغبت دلائی گئی، جس سے متعدد ادبی شہ پارے وجود میں آ گئے، یوں اردو نثر کی آئندہ ترقی کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔

فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی چار سالوں میں ہندوستانی زبان کی تقریباً ۴۳ کتابیں تصنیف ہوئیں اور ڈاکٹر سمیع اللہ کی تحقیق کے مطابق کالج کے پورے دور میں تصنیف، تالیف اور ترجمہ ہونے والی کتابوں کی مجموعی تعداد ۲۴۷ ہے۔ جن میں مطبوعہ ۱۹۴ اور غیر مطبوعہ ۵۳ کتابیں ہیں۔ (۷) ان کتابوں کی تعداد سے کالج کی تخلیقی کارکردگی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بلا شبہ کالج انگریزوں کے اغراض و مقاصد اور کمپنی کی ضروریات کے لیے معرضِ وجود میں آیا تھا، لیکن اس سے سب سے زیادہ فائدہ اردو نثر کو پہنچا۔ حالاں کہ اس سے قبل اردو نثر کی کوئی کتاب بول چال کی آسان عام فہم انداز میں موجود نہیں تھی۔ اب تک اردو زبان فارسی کے زیر اثر مقفّٰی، مسجّع، ثقیل اور ادق قسم کے الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات وغیرہ سے بوجھل ہو رہی تھی۔ پہلی بار اس قدیم فرسودہ اور روایتی ڈگر سے ہٹ کر اردو زبان جدید ارتقائی دور میں داخل ہوئی۔ یعنی اس کالج کے طفیل زبان سادا، سلیس، با محاورہ اور روزمرہ سے قریب ہو کر پاک صاف ہو گئی اور اس سادگی و سلاست اختیار کرنے کے سبب اس زبان نے آئندہ مصنفین کے لیے مختلف اسالیبِ بیان کے دروازے وا کر دیے۔

کہانیوں اور داستانوں کی صورت میں اس نے بیش بہا ذخیرۂ ادب فراہم کیا۔ اردو ادب کی ترقی و ترویج میں یہ قابلِ رشک سرمایہ بالواسطہ طور پر مدد و معاون ثابت ہوا اور یوں جدید نثر کی ایک موثر تحریک کے

طور پر فورٹ ولیم کالج اُبھر کر ہمارے سامنے آیا۔ ڈاکٹر سمیع اللہ اردو زبان کی ترقی بہ سبب فورٹ ولیم کالج بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”فورٹ ولیم کالج کا سب سے اہم کارنامہ یہی ہے کہ اس نے اردو زبان وادب کی پوشیدہ ومخفی صلاحیتوں کو نمود کے موقع فراہم کیے اور اردو نثر کا ایک ایسا اُسلوب وضع کیا، جو بعد کے مصنّفین کے لیے چراغِ راہ ثابت ہوا۔ یہ تحریک ہندوستان کی سب سے پہلی شعوری اور اجتماعی، ادبی ولسانی تحریک تھی، جس نے اردو نثر کی رفتارِ ترقی کے لیے مہمیز کا کام کیا اور اسے وہ قوت وتوانائی عطا کردی کہ نصف صدی کی مختصر مدّت میں اردو زبان کے اندر مختلف مضامین ومباحث کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ فورٹ ولیم کالج اردو نثر کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اردو زبان وادب کو عوام سے قریب کردیا۔ کیوں کہ اسی کی بدولت جس اسلوبِ نگارش کو فروغ حاصل ہوا، اُس کی بنیاد عربی وفارسی کے ادق الفاظ کی بجائے ہندوستانی عوام کے روزمرّہ اور محاورے پر استوار ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کے جو دوررس نتائج برآمد ہوئے، ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ زبان جو علمی حلقوں میں انتہائی پس ماندہ وکم مایہ سمجھی جاتی تھی، صرف تیس پینتیس برس کی قلیل مدّت میں فارسی کو مسندِ اقتدار سے ہٹا کر اس کی جانشین بن گئی اور کاروباری زندگی میں شریک دنیا کی دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے لگی۔“(۸)

دراصل فورٹ ولیم کالج کے تحت جو زبان وادب کی خدمات انجام دی گئیں، اُس نے حقیقت پسندی کی روایت کو بھی غیر شعوری طور پر پروان چڑھایا۔ یعنی اس کالج کی وساطت سے شائع ہونے والی تصنیف وتالیف نے لوگوں کے اذہان کو غور وفکر کرنے اور حقیقتوں سے آشنا کرنے کا شعور بخشا۔ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف وتالیف اور ترجمے کا جب کام شروع ہوا تو اسی زمانے میں چھاپہ خانوں کی بھی ابتدا ہوئی۔ کالج کے نصاب کے لیے جو کتابیں ضروری سمجھی گئیں، وہ آغاز میں مختلف چھاپہ خانوں میں طبع ہوئیں، بعد میں گل کرسٹ نے خود ۱۸۰۱ء میں ایک مطبع قائم کیا۔ جس میں کالج کے مصنّفین کی مختلف موضوعات پر کتابیں چھپتی تھیں۔ چناں چہ اس کالج کی بدولت اردو کتابیں ہزاروں کی تعداد میں ان چھاپے خانوں میں چھپنے لگیں۔ (۹) حالاں کہ اس سے پیشتر اردو نثر ونظم کی کتابیں قلمی ہوا کرتی تھیں۔ بہ وقتِ ضرورت ان قلمی نسخوں کی نقل کرائی جاتی تھی۔ جس سے وقت اور پیسے دونوں کی قربانی دینا پڑتی تھی۔ عام لوگ پھر بھی ان کتابوں سے محروم رہتے

تھے۔ چناں چہ ان چھاپے خانوں کی تنصیب سے کتابوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا اور برق رفتاری سے اخبارات اور رسائل وجرائد بڑی تعداد میں شائع ہونے لگے۔ بالخصوص صحافت کو فروغ حاصل ہوا اور اردو تصنیفات سے استفادہ کیا جانے لگا۔ اس طرح اردو پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ کالج کی اس عظیم خدمت کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ جس کی بابت تصنیفات وتالیفات، ترتیب وتدوین، تراجم اور زبان وادب کی توسیع واشاعت کے مراحل خوش اسلوبی سے طے ہوئے۔

فورٹ ولیم کالج جس کی زندگی آدھی صدی سے کچھ زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس کے قیام کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس کے مصنفین، مرتّبین اور مترجمین نے تصنیف وتالیف کے ذریعے شعوری طور پر اردو زبان وادب کی وسعت، استحکام، ترویج اور ترقّی کے لیے بے مثال مساعی کی۔ داستانی ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ان ہندوستانی منشیوں نے ایسی نثر کی طرح ڈالی، جس کی رعنائی، دل فریبی، جاذبیت اور حقیقت نگاری سے اردو ادب میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ یہ درست ہے کہ ان میں مافوق الفطرت عناصر کی بہتات تھی، لیکن اس امر سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ہماری سماجی زندگی کے اَن گنت عجیب وغریب اور قابلِ یقین حقیقی تصورات موجود تھے۔ ان داستان گویوں نے اُس دور کی زندگی کے انسان، ان کے رسم ورواج، ماحول، بول چال اور عادات واطوار کو وہیں سے اخذ کیا۔ اس لیے ان داستانوں میں مبالغہ آرائی کے طفیل خواب وخیال کی طلسماتی دنیا ہونے کے باوجود حقیقت کی کچھ واضح اور کچھ مدھم شکلیں ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس کالج نے لسانی اعتبار سے اردو کی انفرادی حیثیت متعین کر کے رفتہ رفتہ اسے تصنعات اور تکلّفات سے نجات دلا دی۔ اس طرح اردو نثر میں ایک نئے اسلوب بیان نے جنم لیا، جس سے سادگی وسلاست اور عام فہم اندازِ بیان کے ساتھ حقیقت نگاری کی شمع بھی فروزاں ہوئی اور یوں چراغ سے چراغ جلتے گئے۔ چناں چہ فورٹ ولیم کالج کے ثمرات کو دلّی کالج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نیز اس کالج کے نثری اور حقیقت پسندانہ کارناموں نے اُس وقت کی ادبی تحریکوں اور عوام وخواص کو جس طرح متاثر کیا، اس بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں اسے ہمیشہ ایک نمایاں مقام حاصل رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ محمد عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، دوسری اشاعت: ۱۹۷۹ء، ص ۸۶۔

۲۔ نجم الاسلام، مطالعات، ادارۂ اردو، لاہور، نومبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۹۔

۳۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، دوسرا ایڈیشن: ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۔

۴۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۵۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخِ اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۹۵۔

۶۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم، محولۂ بالا، ص ۴۳۔

۷۔ ڈاکٹر سمیع اللہ، فورٹ ولیم کالج ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۸۳۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد، اردو زبان میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مکتبۂ خیابان ادب،
لاہور، سن ندارد، ص ۴۷۔

☆☆☆☆

شنا تخلیق و ترجمہ: احمد سلیم سلیمی

جدید شنا شاعری، گائیکی اور شنا کی مفلسی

موسیقی کی بات ہو تو ایک غضب کی بات بھی ساتھ شامل ہوتی ہے۔ آواز خوبصورت ہو، دُھن میں تاثیر ہو اور سازوں کا متوازن استعمال ہو تو، بے شک اس گیت، غزل (گانے) کی شاعری جتنی بھی اچھی ہو، بے چارہ شاعر باکمال ہونے کے باوجود ساز اور آواز کے پردوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔

ہندوستان، پاکستان کی فلمی موسیقی کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔ رفیع، لتا، مہدی حسن، کشور کمار، نور جہاں کا نام بہت مقبول ہے مگر ان کے فن کو زندگی کی حرارت دینے والے ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، گلزار اور مجروح سلطان پوری جیسے شاعروں کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

یہی صورت حال باقی موسیقی کے ساتھ بھی ہے۔ اب شنا گانوں کو ہی لیجیے۔ پہلے ایک ریڈیو گلگت ہی ذریعہ تھا، اب ایف ایم چینلز بھی ہیں۔ موبائل اور کمپیوٹر کی سہولت بھی موجود ہے۔ ایسے میں پہلے کی نسبت ان گانوں کی رسائی کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے اب ذوق کا معیار بدل گیا ہے۔ فاسٹ اور ہلکی شاعری کا چلن ہے۔ مگر ایک بات مشترک ہے۔ ہر دور میں شاعر۔۔۔ گلوکار کے اثر میں رہا ہے۔ بہت کم شاعر، موسیقی اور آواز کا جادو توڑنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ہاتھ کی انگلیوں سے بھی کم ان شاعروں کا خیال، ان کے الفاظ اپنی پہچان آپ بن جاتے ہیں۔۔

میڈیا کی وجہ سے اب دنیا سمٹ گئی ہے۔ زبان ہو، ثقافت ہو، ذہنی رویے ہوں، اب اپنی اصل میں نہیں رہے ہیں۔ ایسا ہونے میں اتنی قباحت بھی نہیں کیوں کہ وقت کے ساتھ بدلنا ترقی کی علامت ہے۔ اسی سے زبان و بیان اور سوچوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مگر پریشانی کی بات تب ہے، جب اس تبدیلی سے اپنی شناخت خطرے میں پڑے۔ جگنو پکڑنے کے زعم میں سورج کے وجود سے ہی انکار کیا جائے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب اپنی ثقافت، اپنی زبان اور تہذیبی ورثے کا درست ادراک نہ ہو، اس کی قدر نہ ہو۔

ایسے میں اپنی روایات کو جدت سے ہم آہنگ کر کے ایک متوازن اور مانوس راستہ اختیار کرنا کمال ہے اور ایسے باکمال لوگ ہم میں موجود بھی ہیں۔

ظفر تاج صاحب ایک ایسے ہی باکمال شنا شاعر ہیں۔ ساز اور آواز کی جادوگری میں بھی ان کی

شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ آج کے مقبول شاعر ہیں۔ ان کی شاعری، موسیقی کے سُروں پہ سوار کانوں میں رس گھولتی ہے۔ انھوں نے شنا شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا ہے۔ روایت اور جدت کے تال میل سے ایسی فن کاری دکھاتے ہیں کہ ان کے لفظ زندگی کی حرارت سے آتش بداماں ہو جاتے ہیں۔

اچھی موسیقی اور آواز لفظوں میں جان ڈال دیتی ہے مگر ان کے الفاظ گویا خود ہی گفتگو کرتے ہیں۔ ساز اور آواز کی تاثیر بڑھاتے ہیں۔ انھوں نے شنا موسیقی کا ذوق رکھنے والوں کو ایک منفرد مگر اپنا اپنا سا ذائقہ دیا ہے اور لگتا ہے کہ ایک طویل عرصہ اس ذائقے کی سحر کاری جاری رہے گی۔

ان کے ہاں یادِ ماضی اور یادِ وطن (گلگت) کا احساس غالب ہے۔ یہ محض nostalgia ہے یا اس کے پردے میں، کسی سے جُڑی شبنمی یادیں! جو بھی ہو، مگر ہے قیامت۔۔۔!!!

ایک اور شاعر ہے۔۔۔ جس نے شنا شاعری (موسیقی) کو ایک فطری آہنگ دیا ہے۔ ایک ریشمی احساس دیا ہے۔ لفظ ویسے تو ایک مجرد شے ہے۔ اس میں جب زندگی کے رنگ شامل ہو جائیں تو احساس بن کر دھڑکنے لگتے ہیں۔ کانوں میں نرم نرم سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اس شاعر نے بھی لفظ کو بولنا سکھایا ہے۔ سادگی، بے ساختگی اور فطری اظہار ان کے تن میں بھی ہے، ان کے فن میں بھی۔

پہلی دفعہ دیکھ کر کوئی انھیں شاعر تسلیم نہیں کرتا۔ جاننے کے بعد ان کے کمال کو سلام پیش کرتا ہے۔ یہ ایک لفظ نہیں پڑھ سکتا مگر اپنی شاعری سے بہت سے پڑھے لکھوں کی بولتی بند کرا دیتا ہے۔ شہر میں موجود بہت سے عام انسانوں کی طرح وہ بھی پھرتا ہے۔ نہ کوئی ظاہری کشش، نہ کوئی دکھاوے کی بود و باش۔۔۔ عام سا لباس پہنتا ہے۔ سر پہ بھورے رنگ کی گلگت کی ٹوپی بے ترتیبی سے دھری ہوتی ہے۔ اسے نہ جاننے والا پہلی نظر کے بعد دوسری نظر ڈالنا شاید گوارا بھی نا کرے۔۔۔ مگر اسے جاننے والا دیکھنے کے بعد، یقیناً نظر ہٹانا گوارا نہیں کرتا۔ اس کی گفتگو بے تاثیر، کلام پُرتاثیر۔ یہ مطالعے کے بغیر بھی عالمانہ خیالات بیان کرتا ہے۔ فطرت کی نرم گرم کروٹوں کو ایسے بیان کرتا ہے، آس پاس بکھرے بہت سے پڑھے لکھے دانشور اس کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک طرح سے اس کی سوچ، کسی خارجی فکر، نظریہ اور فلسفہ سے آلودہ نہیں۔ یہ جو سوچتا ہے، جو کہتا ہے اصل میں یہ اس کی طبع زاد تخلیقی اپج ہے۔ اس کی اپنی فکر اور اپنے جذبے کا شاعرانہ اظہار ہے۔

اس کے کلام میں زلف و رخسار کی گھاتیں بھی ہیں۔ حسن و عشق کی باتیں بھی۔ فکر و دانش کے سلسلے بھی ہیں، کیف و مستی کے معاملے بھی۔ یہ اپنی ظاہری بے رنگ زندگی سے ہٹ کے، جب رنگوں کی بات کرتا ہے، جذبوں کی بات کرتا ہے، فطرت کے جمال و کمال اور اَسرار کی بات کرتا ہے، تب اس کے باطن کا لالہ زار ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ اپنا کلام خود پڑھتا ہے تو جیسے کوئی خاموش آب جُو۔ کسی خوبصورت آواز میں ڈھلتا ہے تو

جیسے کسی آبشار کی گنگناہٹ۔ اب تک آپ اس شاعر کو یقینا جان گئے ہوں گے۔

اس شاعر کا نام ہے عزیز الرحمٰن ملنگی۔

فضل الرحمان عالمگیر، جان علی، عبدالخالق تاج، صلاح الدین حسرت کے بعد شنا شاعری (موسیقی) اپنی مٹی کی خوشبو اور مٹھاس سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں لفظ بھی، خیال بھی آلودہ ہونے لگے تھے۔ بہت سے اچھے شاعر اور گلوکار اس دوران مقبول بھی ہوئے۔ بدلتے عوامی ذوق کے مطابق کسی کو کم، کسی کو زیادہ پزیرائی ملتی رہی۔ مگر سنجیدہ ذوق کے لوگ بہت کم متاثر ہو سکے۔ انھیں کچھ ادھورا ادھورا سا لگتا تھا۔ شنا شاعری کے اپنے پن کا مزاج بدلا بدلا سا لگتا تھا۔

مادری زبان اپنی مٹی، اپنے ماحول اور روایات کی امین ہوتی ہے۔ اس کی گود میں سماج کے تہذیبی رویے پرورش پاتے ہیں۔ فطری سوچ کا درست اظہار اسی زبان میں ہی ہوتا ہے۔ مادری زبان کی شاعری، اس کا ادب، وقت کے تیز دھارے میں دم توڑتی ثقافت کا احیا کرتا ہے۔ مگر زبان خود ہی آلودہ ہو جائے۔ اپنی اصل سے دور ہٹ جائے۔ فطری اظہار کے احساس سے عاری ہو جائے۔ ایسے میں زبان و ثقافت کے ساتھ سماج کے رویے بھی شدید متاثر ہو جاتے ہیں۔ لوگ، کتنے کی حد تک اس مٹی سے جڑے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی سوچ، ان کا عمل اور کردار، اپنی اصل سے بہت دور۔۔۔ کسی اور دیس کے رنگ ڈھنگ اپنا لیتے ہیں۔

شنا شاعری (موسیقی) کا لب و لہجہ اور ساز و آواز، کچھ ایسی ہی بد چلنی کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے میں ظفر تاج اور عزیز الرحمان ملنگی نے شنا زبان کو ایک شیرینی، مانوس ترنم، روایت اور جدت سے ہم آہنگ ایک شناشناس احساس دیا۔ شنا شاعری (موسیقی) سے فاصلے بڑھانے والے لوگ، پھر سے لو لگانے لگے۔ ستار اور بانسری کی مدھرتا پھر سے رس گھولنے لگی۔

ظفر تاج اور عزیز الرحمان ملنگی کا کلام گلگت کے مقبول گلوکاروں نے گایا ہے۔ سب سے پہلے صلاح الدین حسرت کی پُرسوز آواز نے ان کے نام اور کلام کو پہچان دی۔ اس کے بعد اب جابر خان جابر اور سلمان پارس کی خوبصورت آوازیں، ان شاعروں کو شہرت کی بلندیوں تک لے گئی ہیں۔ مجھے موسیقی کی باریکیوں کا علم نہیں، مگر ذوق کی بات ہے۔ اس کی بنیاد پر کہتا ہوں۔ جابر کی آواز میں نرمی بھی ہے، سوز بھی ہے مگر ورائٹی نہیں۔ اس کی دُھن اور ردھم ایک خاص لے کے اندر رہتی ہے۔ اس لیے ان شاعروں کا کلام، خاص کر ظفر صاحب کی جتنی بھی غزلیں اس نے گائی ہیں، ان میں ایک ہی آہنگ کا تاثر غالب رہا ہے۔

سلمان پارس کی آواز میں لوچ ہے۔ سُروں میں لچک ہے اور ورائٹی ہے۔ اس لیے پسندیدگی میں آگے ہے۔ آج کی بے ہنگم اردو، شنا موسیقی کے اس پُرشور دور میں ان شاعروں کا کلام ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

امید ہے اچھی آواز اور خوب صورت موسیقی سے یہ اضافہ اپنا جادو جگاتا رہے گا۔ ان شاعروں کا فن اور شنا کی ترقی میں ان کا کردار یاد رکھا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی کچھ سوال ذہن کے دریچوں پہ دھپا دھپ دستک دیتے ہیں۔

شنا شاعری اور خاص کر ظفر تاج اور ملنگی کی شاعری سے حظ اٹھانے کے لیے کیا محض گلوکاروں کے مرہونِ منت رہا جائے گا؟

سنجیدہ مزاج کے لوگ محض اس وجہ سے شنا شاعری سے محروم رہیں گے کہ وہ گانے نہیں سنتے؟

شنا زبان کیا واقعی اتنی مفلس ہے کہ اس میں لکھا نہیں جاتا، محض گایا جاتا ہے؟

شنا کی بہت ہی خوب صورت لوک کہانیاں، یہاں وہاں بکھری ہوئی ہیں۔ بے شمار کہانیاں اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ مگر شنا میں تحریری شکل میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ سوال یہ ہے۔ کیا ہماری زندہ لوک کہانیاں اسی طرح اردو، انگلش زبانوں کی محتاج بن کر مردہ ہوتی جائیں گی؟

شنا گلگت بلتستان کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ اس خطے کے مرکزی اور سب سے بڑے شہر، گلگت کی زبان ہے۔ تمام اضلاع میں بہ حیثیت مادری زبان اس کا وجود ہے۔ کہیں زیادہ، کہیں کم۔ جی بی سے باہر چترال، کوہستان، آزاد و مقبوضہ کشمیر میں بھی بہ طور مادری زبان اسے بولنے والے موجود ہیں۔ ظفر صاحب کے بہ قول، مقبوضہ جموں و کشمیر میں دو لاکھ سے زیادہ لوگ اسے بولتے ہیں۔ شنا وہاں کے نصابِ تعلیم میں شامل بھی ہے۔

بچہ پیدا ہوتا ہے، سب سے پہلے مادری زبان کے لفظ اس کی سماعتوں کو چوم لیتے ہیں۔ اس کے سوچنے اور بولنے کی تحریک بن جاتے ہیں۔ اس کے محسوسات کا اظہار بن جاتے ہیں۔ جب سکول میں جاتا ہے تو یہی مانوس الفاظ اجنبی بن جاتے ہیں۔ اس کی جگہ اردو اور انگلش کے غیر مانوس الفاظ اس کے کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس کے لیے حصولِ علم کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس کے کچے دماغ میں ان مختلف زبانوں کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مادری زبان بے کار اور بے فائدہ ہوتی جاتی ہے۔ اس سے ایک طرف اُس کے فطری محسوسات کا اظہار روانی سے نہیں ہوتا، دوسری طرف وہ شعوری طور پر شنا کو ایک غیر اہم زبان سمجھ بیٹھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اردو اور انگلش اس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں کہ عام بول چال کی زبان بھی خالص مادری زبان نہیں رہ جاتی۔ بڑی زبانوں کے اثرات اس کی گفتگو سے اپنی زبان کی مٹھاس چھین لیتے ہیں۔

شنا کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اول تو اسے بولنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ اس پہ مستزاد جو بولتے ہیں، وہ انگلش اور اردو ملا کے بولتے ہیں، ٹھیٹھ شنا نہیں۔

اس طرح شنا کا سمعی میڈیم (بولنا اور سننا) تو کسی نہ کسی شکل میں فعال رہتا ہے۔ مگر اس کا بصری

میڈیم (تحریری شکل) اہلِ قلم اور ماہرینِ لسانیات کی عدم توجہی پہ نوحہ کناں ہے۔ اور مستقبل کا مورخ، سرکاری اداروں کی بے حسی، بے دانشی اور بے ذوقی کو بھی لازماً بیان کرے گا۔

اس وقت شنا کے فروغ میں سب سے پہلی رکاوٹ اس کے حروفِ تہجی ہیں۔ یہ کیسا عجز خطہ ہے صدیوں سے بولی جانے والی اس زبان میں ایسے ماہرینِ لسانیات پیدا نہیں ہوئے ہیں جو اسے زندہ زبان کی شکل دے سکیں۔ نہ ہی کسی سرکاری ادارے کو توفیق ہوئی ک اسے زندہ زبانوں میں شامل کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ شنا حروفِ تہجی ترتیب دے کر اسے محض صوتی اور سمعی اظہار سے اٹھا کر بصری میڈیم کا بھی مقام دلاوے۔ یوں اس زبان میں بھی تخلیق ہونے والا ادب (نثر، نظم) کتابی شکل میں زندہ جاوید بن جائے۔

امین ضیا صاحب، عبدالخالق تاج صاحب اور شکیل احمد شکیل صاحب نے اگرچہ اپنی بساط کے مطابق حروفِ تہجی سے متعلق کام کیا ہے۔ مگر ان کا دائرہ محدود ہے۔ صوتی لسانیات کے کئی پہلوؤں پر ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ صوتی اظہار کے لیے مخصوص حروف تو انھوں نے تشکیل دیے ہیں لیکن ایک دوسرے سے جدا جدا۔۔۔ اس کی وجہ سے متفقہ اور معقول حروفِ تہجی موجود نہیں۔

شنا صوتیات میں بہت سی آوازیں ایسی ہیں جن کا اظہار اردو، عربی اور فارسی حروفِ تہجی سے ممکن نہیں۔ لفظ شنا پر ہی غور کر لیں۔ پہلے حرف ”ش“ سے جو آواز نکلتی ہے اصل تلفظ سے مختلف ہے۔ اسی طرح گدھا، بھائی، بارش، آبشار، انڈا جیسے الفاظ کے لیے شنا میں جو لفظ استعمال ہوتے ہیں، انھیں بول تو سکتے ہیں، مگر لکھتے ہوئے اردو سے حروف مستعار لیتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے ایسی صوتی علامات کو ایک قابلِ قبول شکل نہیں دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے شنا میں تحریری مواد موجود نہیں۔

جیسا ک اوپر ذکر ہوا، کہنے کی حد تک کئی اہلِ قلم اور لسانی باریکیوں کو سمجھنے والوں نے اسے مشقِ ستم بنایا ہے، مگر سب کا کام ادھورا ہے۔ سب کا کام محدود ہے۔ سب انا پرستی اور ’ہم چو ما دیگرے نیست‘ کی بند گلی میں بھٹک رہے ہیں۔ اس خرابی میں سرکاری حلقے بھی برابر کے شریک ہیں۔ دکھ اس بات کا ہے ادب کی، ثقافت کی اور تہذیبی قدروں کی بات سبھی کرتے ہیں۔ جب عمل کی بات آئے تو ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ بیانات، نشستن برخاستن اور کمیٹیوں سے بات آگے نہیں بڑھتی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا ک شنا لسانیات پر کام کرنے والوں کی خدمات اور کوششوں کو حکومت own کر لیتی۔ انھیں اپنی سرپرستی میں آسانیاں فراہم کرتی۔ ایک منظم، موثر، اور بروقت کام کی تکمیل کو یقینی بنا لیتی۔ مگر حکومتوں کی اپنی دلچسپیاں اور ترجیحات رہی ہیں۔ اس طرف ان کی نظرِ خاص کبھی نہ رہی۔

یہ علم کا، تحقیق اور سائنٹیفک اپروچ کا دور ہے۔ دانشمند قومیں اپنی تہذیب، ثقافت اور زبانوں کو

میڈیا اور گلوبلائزیشن کی دست بُرد سے بچا کر، انھیں زندہ رکھتی ہیں۔ ایک ہم ہیں، اپنی مادری زبان اور ثقافت کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ محض ناچ اور گانے کو ثقافت اور زبان کے فروغ کا ذریعہ سمجھ کر خود فریبی کا شکار ہیں۔ محض اس وجہ سے شنا ادب (نثر، نظم) کو پڑھنے، لکھنے سے محروم ہیں کہ کہے ہوئے الفاظ، لکھنے سے قاصر ہیں۔ شنا میں اول تو کتابی شکل میں نثر یا نظم لکھی نہیں جاتی۔ کبھی کوئی شوق وجنوں کا مارا ایسی جسارت کرتا ہے تو مدتوں اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔

اسلام آباد میں گلگت کے ایک دوست ہیں۔ محمد لطیف نلتر بیجو۔ انھوں نے اپنی شنا شاعری کی کتاب ”پوموکی حیون“ دکھا کے حیران کر دیا۔ دو سو سے زیادہ صفحات کی شنا نظموں اور غزلوں پہ مشتمل ایسی شاندار اور جاندار کتاب تھی کہ میری ادبی زندگی میں کم از کم گیارہ سو وات کا جھٹکا تھی۔ محمد لطیف نلتر بیجو صاحب سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی فنی صلاحیتوں سے بھی واقف نہیں تھا۔ چلو مان لیا یہ میری کم علمی سہی، مگر شنا شاعری کی ایسی ضخیم اور خوبصورت کتاب، بلاشبہ حیرت افزا تھی۔ میں یقین سے کہتا ہوں آپ میں سے اکثر، میری طرح ان کے نام اور کام سے یکسر نابلد ہوں گے۔ ظفر تاج اور ملنگی کو تو صلاح الدین حسرت، جابر خان اور سلمان پارس کی آوازوں نے مقبول بنا دیا۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سب تک پہنچا دیا۔ محمد لطیف نلتر بیجو جیسے شاعر محض اس وجہ سے گمنامی اور ناقدری کا شکار رہیں کہ ان کا فن موسیقی میں نہیں، کتابوں میں ہے۔

ستم ظریفی سے کتاب پڑھنے والے کم یاب ہو گئے ہیں۔ ستم بالائے ستم، شنا تحریر شناسی الگ قیامت بنی ہوئی ہے۔ آپ اس قیامت کا اندازہ ایسے بھی کر لیں کہ اسلام آباد میں ان دنوں تاج صاحب اور دکھی صاحب بھی تھے۔ یہ دونوں شنا کے معتبر شاعر ہیں۔ ایک رات رائٹرز ہاؤس کے ایک کمرے میں ان دونوں کی شبنمی صحبت میں بیٹھا ہوا تھا۔ لطیف نلتر بیجو صاحب کی ”پوموکی حیون“ ان کے لیے بھی نظر افروز تھی۔ اس کتاب میں شامل شنا نظموں اور غزلوں کو بہ نظرِ استحسان دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ دونوں اکابر شعرا بعض الفاظ کی معنویت، اور درست تلفظ اور صحت سے پڑھنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے۔ ایسے میں سوچیے! لاکھوں عام پڑھے لکھے لوگ کیوں کر سمجھ سکیں گے؟ کیسے انھیں علم ہوگا کہ شنا ایک تہذیبی ورثے کی امین زبان ہے۔ اس کا دامن گل رنگ ثقافتوں اور قدروں سے گل زار بنا ہوا ہے۔؟

چند دن قبل جی بی کے سارے ہی ادبی حلقوں کے اہلِ قلم کی حفیظ الرحمان صاحب سے ایک نشست ہوئی تھی۔ وہاں بہت ساری باتیں ہوئی تھیں۔ مادری زبانوں سے متعلق بھی گفتگو ہوئی تھی۔ اہل قلم نے تجاویز بھی دی تھیں۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے دوٹوک انداز میں یقین بھی دلایا تھا۔ ایک کمیٹی فوری طور پہ تشکیل دینے کی بات کی تھی۔ اب روایت کیا رہی ہے کہ اس کے لیے کمیٹی بن جاتی ہے۔ تجاویز مرتب ہوتی

ہیں ۔ پھر یہ فائل کی شکل میں سیکریٹریز کے حضور پیش کی جاتی ہے ۔ وہاں مخصوص پہلوؤں سے انھیں چھانٹ پھٹک کر آگے سرکا دیا جاتا ہے ۔ ۔ پھر ہفتوں، مہینوں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے، سالوں تک اس فائل کا سفر ختم نہیں ہوتا ۔

امید ہے وزیر اعلیٰ صاحب، کمیٹیوں کی روایتی عدم فعالیت کے بجائے، ان کی بروقت اور موثر کارکردگی کو یقینی بنانے میں خصوصی دل چسپی لیں گے ۔ یہ کمیٹیاں ماضی میں بھی متعدد بنائی گئی ہیں ۔ اہلِ قلم میں سے چند کو بلا کے چائے پلانے، ایک آدھ گھنٹہ ان سے میٹنگ کرنے اور پھر بڑی بڑی باتیں کرنے کے بعد بھول جاتے ہیں ۔ امید ہے وزیر اعلیٰ صاحب نہیں بھولیں گے، انھوں نے گلگت بلتستان کے عالی دماغ شاعروں اور ادیبوں کے سامنے اس خطے میں قومی اور مقامی زبانوں کے ادب کی ترقی و ترویج کا یقین دلایا ہے ۔

امید ہے اہلِ قلم بھی ایک شعوری جذبے کے ساتھ سرکاری اداروں کی معاونت کریں گے ۔ مقامی اور قومی (اردو) ادب کے فروغ کے لیے حفیظ الرحمان صاحب نے جن اقدامات کی بات کی ہے، انھیں عملی شکل دلائیں گے ۔

☆☆☆☆

منیر احمد بادینی
بلوچی سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

عجیب ترین سوال

ندی کے کنارے جھاؤ کے درختوں کے بیچ ہم دونوں چاشت سے لے کر ظہر تک تیتروں کے شکار کے لیے سرگرداں رہے لیکن ہمیں چندا کا دکا چھوٹے پرندوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ تیتروں کا کہیں دور تک بھی سراغ نہیں مل رہا تھا، جب کہ میرے دوست دشتیاری کا خیال تھا کہ یہ جگہ تیتروں کا ٹھکانہ ہے لیکن آج یہاں ہُو کا عالم تھا۔

دشتیاری شکار کے لیے یہاں دو ماہ پہلے آیا تھا لیکن آج صورتحال یہ تھی کہ ہمیں یہاں کچھ بھی دستیاب نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم ہم بل کھاتی ندی کے کنارے کے ساتھ برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور اب آگے ندی کی چوڑائی بھی کم ہوتی جا رہی تھی اور اس کے کنارے اُگے ہوئے جھاؤ کے درختوں میں بھی کمی آ رہی تھی اور آگے تھوڑے فاصلے پر چاروں طرف پھیلا ہوا وسیع میدان ریت کے چھپروں سے ہم آغوش نظر آتا تھا۔

ہمارے بائیں جانب تا حدِ نگاہ ایک ریگستان پھیلا ہوا تھا یہ بہت دور جا کر مشرقی جانب اُفق سے ملتا ہوا دکھائی دیتا تھا جب کہ دائیں جانب وسیع میدان، ریت کے ٹیلوں سے ایک طرف ہو کر شمالی جانب پھیلتا نظر آتا تھا۔ دشت اور ریگستان کے ٹیلوں کی یہ ہم آغوشی اور یکجائی اور پھر ایک دوسرے سے دوری اور علیحدگی میں مجھے فطرت کی ایک عجیب خوبصورتی نظر آئی کہ فطرت میں دو انتہا کبھی باہم ملتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ کیوں کہ فطرت میں ہر انتہا کا اپنا ایک مقام اور کیفیت ہوتی ہے۔ اگر ایک انتہا بہت ہی طاقت کی حامل ہو تو وہ دوسری انتہا کے لیے جگہ خالی کر لیتی ہے۔

اب جب کہ میدان بڑا کشادہ اور وسیع تھا تو ریت کے ٹیلے اپنی جگہ پر دور کھڑے تھے لیکن جہاں ریگستان کی یورش اور یلغار زیادہ تھی تو میدان نے اپنا رخ شمالی جانب موڑ رکھا تھا۔ میں فطرت کے اس پراسرار کھیل پر ششدر و حیران تھا۔

میں اور دشتیاری جب تیتروں کے شکار سے مایوس ہونے لگے تو مجھے خیال آیا کہ کچھ دیر کے لیے ریت کے چھپروں پر جا کر سستا لیں۔ جہاں وسیع ریگستان کا دامن تنگ ہو کر چھوٹے چھوٹے چھپروں کی صورت میں سمندر کی لہروں کے مانند پھیلے نظر آتے تھے۔ جیسے کہ اب یہ سمندر کی لہروں کے مانند آگے جا سکتے

تھے اور نہ ہی پیچھے پلٹ سکتے تھے اور اب یہ دشت پر چٹائی کے ٹکڑوں کی طرح لگتے تھے اور ہمارے اوپر نیلگوں آسماں سایہ فگن تھا۔

اگر چہ موسم سرد تھا لیکن سورج کی تمازت کے باعث ہوا میں تندی نہیں تھی بلکہ ہوا ٹھہری ہوئی تھی اور اسی باعث دور سرمئی پہاڑیوں کے دامن میں فضا غبار آلود نظر آتی تھی اور پھیلی ہوئی وسیع اور کشادہ زمین پر ہر چیز ایک پراسرار ریت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔

ہم کافی تھک چکے تھے اور تھوڑا ستانا چاہتے تھے۔ ریت کے چھپروں پر بیٹھ کر وسیع اور کشادہ میدان کا نظارہ کرنے سے بھلا اور کیا چیز پر لطف ہو سکتی تھی؟ اسی لیے ہم ندی کے بائیں کنارے سے ہوتے ہوئے ریت کے اس قالین پر آ کر بیٹھ گئے۔

دِشتیاری بڑے انہماک سے محو نظارہ تھے، میں بھی فطرت کے اس خوبصورت نظارے سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے اور یوں لگتا تھا کہ فطرت کی اس رنگینی نے ہم سے قوت گویائی چھین لی تھی۔ کچھ دیر کے بعد دِشتیاری مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

حمل! جانتے ہو کہ یہ دنیا کسی ہنر مند ہاتھ کا ایک ایسا بے مثال اور شاندار شاہکار ہے جو انتہائی خوبصورت اور دلکش ہے۔ ہم جہاں بیٹھے ہوئے ہیں اگر چہ یہ ایک بے آب و گیاہ میدان ہے اور اس کے پہلو میں ایک وسیع ریگستان بچھا ہوا ہے لیکن دیکھو اس میں کیسا ربط وضبط اور رنگ و آہنگ موجود ہے جو اپنی جگہ پر خوبصورت اور بے مثال ہے۔

میں خاموشی سے دِشتیاری کی گفتگو سنتا رہا اور میں ان کی مذہبی صورتحال سے واقف تھا، کیوں کہ خدا اور مذہب کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ عام لوگوں سے مختلف تھا اور بعض اوقات میں ان کے خیالات سے خوفزدہ ہوتا تھا۔

کیوں کہ ان کی باتوں میں ایک طرح کی بدعقیدگی شامل ہوتی تھی جب کہ میں اپنے یقین و ایمان پر کاربند رہتے ہوئے بھی ان کی باتوں کو سنتا رہتا تھا۔ دِشتیاری اپنی بداعتقادی کے باوجود بھی اس دنیا کے ربط و تعلق کو نہ صرف اہم اور خوبصورت قرار دیتا تھا بلکہ اسے ایک ہنر مند ہاتھ کا شاہکار تصور کرتا تھا جو میرے نزدیک خدا تھا جب کہ دِشتیاری اسے گرینڈ ڈیزائنر کے نام سے یاد کرتا تھا۔

ہم دونوں نیلگوں آسماں کے تلے اپنے اپنے انداز میں اس پھیلے ہوئے دشت کو دیکھ رہے تھے۔ میں کائنات کی تمام چیزوں کا خالق خدا کی ذات کو سمجھتا تھا جب کہ دِشتیاری مجھ سے تھوڑے سے فرق و اختلاف کے ساتھ اسے کسی گرینڈ ڈیزائنر کا شاہکار قرار دیتا تھا۔ غالباً میری اور ان کی سوچ میں اتنا بڑا فرق و اختلاف نہیں تھا۔

میں نے دشتیاری سے پوچھا۔ تیرا خیال کیا ہے کہ یہ کائنات اور یہ وسیع دنیا جو کہ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے کیا یہ کوئی روح بھی رکھتی ہے؟ اگرچہ دیکھنے میں یہ نیلگوں آسماں، یہ ریگستان یہ نباتات خاموش اور بے معنی لگتے ہیں لیکن ان کے پیچھے کوئی روح موجود ہے یا ان میں کوئی بھید و اسرار پوشیدہ ہے؟ دشتیاری نے آرام سے اپنی دوربین اور بندوق ریت کے فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔

''حمل جانتے ہو کہ خدا کے بارے میں میرے خیالات جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، تاہم میرے لیے یہ دنیا ہی سب سے عجیب ترین سوال کوئی اور ہے۔ اگر آپ پوچھنا چاہیں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ وہ سب سے عجیب ترین سوال کیا ہے؟''

دشتیاری کی اس بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ میں نے ریت کے نرم و نازک فرش پر اپنی کہنی ٹیکتے اور ہتھیلی پر اپنا سر رکھتے ہوئے خود کو دراز کیا اور ان کی باتوں کو سننے لگا۔ میں اور وہ یہاں تن تنہا سورج کی ہلکی تمازت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس دنیا کے رموز و اسرار پر گفتگو میں مگن تھے، جیسے کہ ہم خود اس بھید کا ایک ناگزیر حصہ تھے۔ میں نے ان سے سوال کرتے ہوئے کہا کہ تیری نظر میں اس دنیا کا عجیب ترین سوال کیا ہے؟

جب وہ اس کا جواب دینے لگا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان کا وجود یک دم میری نظروں سے اوپر اڑان بھر کر اس بے پایاں دشت کا حصہ بن گیا ہو اور میں اس وقت انھیں ہوا کا ایک جھونکا خیال کرنے لگا تھا اور جیسے کہ میں انھیں دیکھ نہیں پا رہا تھا بلکہ میں تو محض ان کی باتوں کو سننے میں مگن تھا اور ان کا عجیب سوال مجھ میں ایسی لگن کا باعث بن رہا تھا کہ آخر ان کی زندگی کا سب سے بڑا عجیب سوال کیا ہو سکتا ہے؟

دشتیاری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، حمل! خدا، کائنات، دنیا اور روح کے بارے میں میرے سوالات جو بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، لیکن کیا تم جانتے ہو کہ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے کسی کو میرے حالات کا علم ہے، کوئی میری کمزوریوں سے واقف ہے، میرے اچھے کاموں کو سراہتا ہے یا اگر میں کوئی غلط کام کر بیٹھوں تو وہ انھیں مناسب اور اچھا نہیں سمجھتا۔ اگرچہ میں نے خدا کے بارے میں یہ کبھی نہیں سوچا کہ خدا ہے یا نہیں ہے، لیکن نا جانے کیوں مجھے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میری اچھائیوں اور برائیوں پر اس کی نظر ہے۔۔۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ میں اپنی زندگی کو ایک نامکمل زندگی خیال کرتا ہوں۔ کیوں کہ اپنے اچھے اعمال کے باوجود بھی شاید ان کی نظروں میں میرے تمام اعمال برے اور نامناسب ہوں۔ مجھے غلط کاموں کو چھوڑ کر اچھے عمل کرنا چاہئیں۔ کیوں کہ کوئی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے یا یہ کہ میں کسی کے فہم و ادراک میں موجود ہوں، کسی کے احاطہ فکر کی دسترس میں ہوں۔ اگرچہ خدا کے حوالے سے میرے اور آپ کے نقطۂ نگاہ میں فرق ہے۔ تم صدقِ دل سے خدا کی ذات پر کامل یقین رکھتے ہو۔ تم خدا کو اس

کائنات کا خالق سمجھتے ہو اور تمھیں مرنے کے بعد خدا کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ تمھیں اپنے گناہ و ثواب کا جواب دینا ہے لیکن میں خدا کو کسی اور حوالے سے جانتا ہوں۔ میں انھیں ایک ہنرمند ہاتھ سمجھتا ہوں، لیکن میرا عجیب ترین سوال یہ ہے کہ آخر مجھے یہ احساس کیوں دامن گیر رہتا ہے کہ مجھے کوئی ہستی دیکھ رہی ہے۔

دشتیاری کی باتوں اور ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ چیز بخوبی عیاں تھی کہ وہ پورے یقین کے ساتھ یہ استفسار کر رہا تھا اور شاید اب تک انھیں اس سوال کا کوئی تسلی بخش اور شافعی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اب وہ فطرت کے اس وسیع اور پھیلے ہوئے نظارے میں مجھ سے یہ استفسار کر رہا تھا اور میرا کہنا یہ تھا کہ یہ خدا ہے۔ یہ احساس کہ تجھے کوئی دیکھ رہا ہے، خدا ہے۔ اگر بنی نوع انسان کے دل میں یہ سوال جاگزیں ہو جائے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو وہ خدا ہے۔ یہ سن کر دشتیاری خاموش ہوا اور پھر نظر اٹھا کر اوپر نیلگوں آسمان کو دیکھنے لگا جہاں اس کی وسعتوں میں ایک عقاب محو پرواز تھا۔

تھوڑی دیر کے توقف کے بعد دشتیاری کہنے لگا۔

حمل! میری سوچ و ادراک ہر دو خدا کو جدا جدا دیکھ رہے ہیں۔ میرے فکر میں یہ ایک گرینڈ ڈیزائنر ہیں جو دنیا کو تخلیق کر کے اب اس سے جدا ہو چکے ہیں۔ لیکن میرے دل میں میرا احساس مجھے یہ تحریک دیتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو مجھے دیکھ رہی ہے۔ میرے پہلے فکر و نظر میں خدا کو میرے احساسات کی کوئی پرواہ نہیں ہے جب کہ میرے دوسرے احساس میں مجھے ایسے لگتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ ان کے ڈیزائن اور ہنرمندی میں میرا ہونا یا نہ ہونا یا وجود پذیر ہو کر پھر فنا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن میرے دوسرے احساس میں مجھے ایسے لگتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اگر چہ میرے اس ادراک کی کوئی عقلی اساس نہیں ہے۔ یہ تو محض ایک ادراک ہے ایک احساس ہے۔ تاہم حمل مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جیسے کہ یہ غیر عقلی احساس، میرے عقلی احساس و حواس سے کہیں زیادہ طاقت ور اور توانا ہے۔ اس لیے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ خدا موجود ہے یا کہ نہیں ہے، تاہم میرا یہ احساس کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا میں کسی کے دائرہ ادراک میں ہوں، کسی کے عقل کا حصہ ہوں، تب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میں اپنی عقل کو اپنے احساس کے ساتھ کیسے یکجا رکھوں۔ میرے خیال میں میرے لیے اس دنیا میں سب سے عجیب ترین سوال یہی ہے اور نہ جانے مجھے کیوں یہ خیال آتا ہے کہ مجھ پر کسی کی نظر ہے جب کہ عقلی صورت میں خدا میرے لیے ایک ہنرمند اور معروضی قوت ہے۔ تاہم میرے دل میں جنم لینے والا سوال اگر چہ غیر عقلی ہے لیکن اس میں ایک زبردست طاقت اور قوت موجود ہے کہ جس کے سامنے میری عقل محدود و مجبور ہے۔ اب تک میری تمام زندگی اسی احساس میں گذری ہے کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ اس لیے میرا کوئی بھی عمل مجھے مکمل نہیں لگتا۔ جیسے کہ دیکھنے والی

ہستی کے حضور میرے تمام اعمال اور حرکت بے معنی ہوں۔

دشتیاری یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں ان کو کیا کہوں، کیوں کہ میرے نزدیک خدا ایک ایسی سچائی ہے جو کہ موجود ہے اور آسمانوں پر جلوہ فگن ہے اور میں نیچے زمین کا باسی ہوں اور ان کے سامنے جواب دہ ہوں۔ جب کہ میرا دوست اپنے دل میں جاگزیں اس احساس کے تحت خدا کو جاننا چاہتا تھا کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لیے میں نے دشتیاری سے پوچھا۔ تم اپنے احساسات کو کیا مفہوم دینا چاہتے ہو؟

”میں نہیں چاہتا کہ نامکمل ہونے کا یہ احساس مجھے بے چین اور مضطرب رکھے اور میں محض عقل کے گھوڑے پر سوار ہو کر خود کو اس فریب میں مبتلا رکھوں کہ مجھ پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں ہے، اور یہ صرف میرا وہم و وسوسہ ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی مجھے اپنے کردار کے نامکمل ہونے کا احساس ہوتا ہے، نہ جانے کیوں؟ شاید اس لیے کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ اگر مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے تو پھر مجھے اپنے نامکمل ہونے کا احساس کیوں بے چین رکھتا ہے، مجھے مرنے سے کیوں خوف آتا ہے؟ مجھے اپنی ذات پر بھروسہ اور یقین کیوں نہیں ہے؟“

شاید تیرے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے؟

میں نہیں جانتا، لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد وہ گویا ہوئے ”شاید۔“۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے یہ احساس آخر کیوں بے چین رکھتا ہے کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے؟

تو پھر تم خدا کو تلاش کرو اور شاید تم اپنے دل میں خدا کے بہت قریب ہو کہ تمھیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے کہ تجھے دیکھ رہی ہے اور پھر یہ کہ تم اپنے کاموں سے مطمئن نہیں ہو تو پھر تم خدا کی ذات پر یقین رکھو۔

یہ سن کر دشتیاری کہنے لگے۔ میری عقل کی رسائی اور پہنچ مختصر ہے۔۔۔ شاید میرے احساسات کی حدت بہت تیز تر ہے اور میرے خیال میں احساس کی اس حدت میں ہی انسان خدا کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن حمل میرے لیے اس دنیا میں عجیب ترین سوال یہی ہے۔ مجھے یہ علم نہیں ہے کہ کیوں مجھے یہ احساس دامن گیر رہتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے جیسے کہ کسی کے پاس ہمارے سوالوں کا جواب نہ ہو۔۔۔ ایک بار پھر ہم دونوں اٹھ کر ندی کے نشیب کی طرف چل پڑے۔ شاید کہ ہمیں کوئی تیتر یا شکار کا کوئی پرندہ ہاتھ آ سکے۔

☆☆☆☆

زاہدہ رئیس راجی

بلوچی سے ترجمہ: وحید عامر

Hunm......

”جان! ۔۔۔۔ مجھے تو تم بچپن سے پسند ہو۔۔۔۔“

”مجھے بھی ۔۔۔ اسی طرح۔“

”میری زندگی کی پہلی و آخری چاہت تم رہے ہو۔“

”میری اب بھی تم ہو۔“

”جان! آپ کی یادیں ۔۔۔۔ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتیں۔“

”آپ کی یادوں کے سوا ۔۔۔ کوئی اور چیز ہی نہیں جو مجھے چین دے۔“

”میری زندگی کا ۔۔۔ پہلا پہلا مقصد ۔۔۔ صرف تم رہے ہو۔“

”اور میری ۔۔۔ میری تو پہلی و آخری خواہش تم ہو۔۔۔۔“

”میں دنیا کی خوبصورت ترین حُوروں کے درمیان رہ چکا ہوں۔ لیکن جانی! ۔۔۔۔ ہر وقت میری باطنی نگاہیں صرف تمھاری تلاش میں رہی ہیں۔“

”میری ظاہری و باطنی نگاہیں ۔۔۔ تمھارے سوا کسی کو دیکھنے کے لیے کبھی نہیں اُٹھتی ہیں۔“

”میں نے بہت سی لڑکیوں کی محبت دیکھی ہے ۔۔۔ لیکن تمھاری ۔۔۔ قسم سے تمھاری محبت کا ثانی کہیں نہیں ملتا۔“

”تمھاری محبت کے ساتھ ۔۔۔ میں نے کبھی بھی کسی کو شریک نہیں کیا (مسکراتی ہوئی)“

”تم بھی جانتی ہو کہ میری چاہنے والی بہت زیادہ ہیں لیکن میں تمھارے سوا کسی اور کو نہیں چنوں گا۔“

”تمھاری چاہت کے لیے ۔۔۔ میں نے کسی کی بھی چاہت کی ۔۔۔ پرواہ نہیں کی ہے۔“

”خدا جانتا ہے کہ میں کافی حسیناؤں کی ۔۔۔ باہنوں میں رہ چکا ہوں لیکن ۔۔۔ لیکن میرے ذہن و دل ہمیشہ تمھاری طرف کھنچتے رہے ہیں۔“

”میری گواہی میرا اللہ دے گا کہ آج تک میں نے کسی کو اجازت نہیں دی ہے ۔۔۔ کہ وہ میرے

بدن کو چھو بھی سکے۔‘‘

’’میں دنیا کے تمام مردوں اور عورتوں کی فطری طلب سے واقف ہوں جان! کہ بہت دیر تک اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پا سکتا۔۔۔ بالآخر شیطان ہر طرح سے برتری لے جاتا ہے۔‘‘

’’میرے دل نے کبھی نہیں مانا کہ میں اپنی پاک محبت کی علامت کو شیطانی ہوس کے ہاتھوں میں تھما دوں۔‘‘

’’میں جانتا ہوں! تم کسی اور دنیا کی مخلوق سے ہو۔۔۔ اس دنیا میں تم جیسے لوگ نہیں۔ مجھے۔۔۔ ۔ مجھے تم پر فخر ہے۔۔۔ لیکن قسم سے اب میں تمھیں تمھاری تمام خوبی و خامیوں سمیت اپنانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’تمھاری بات ٹھیک ہے، لیکن جان! میری آنکھوں میں وہ بینائی موجود ہی نہیں جو تمھاری خامیوں کو دیکھ سکے۔‘‘

’’میں تمھارے لیے اپنی ماضی کی زندگی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’لیکن میں نے! ۔۔۔ تمھارے لیے اپنے ماضی و حال سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔‘‘

’’میں روزانہ دس دفعہ تمھاری تصویر جیب سے نکال کر اپنی آنکھوں کا آئینہ بنا دیتا ہوں لیکن پھر بھی دل ہے کہ بھرتا نہیں۔۔۔ تم نہیں جانتی کہ تمھارے لیے کتنا تڑپتا ہوں۔‘‘

’’میرے تخیل کے پردے سے، تمھاری تصویر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹائی گئی۔۔۔ اس لیے مجھے تمھاری ظاہری تصویروں کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔۔۔‘‘

’’جانتی ہو! (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد)۔۔۔ تمھاری سوتن نے آج پھر سے مجھے دعوت دی ہے۔‘‘

’’میری سوتن؟ ۔۔۔ اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ یعنی تم اپنے اُسی دوست کا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’ہاں! ۔۔۔ وہ میرے انتظار میں بیٹھی ہے۔‘‘

’’اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے اگر تمھارے دل میں اب بھی اُس کے لیے جگہ ہے اور تم اُسے اپنانا چاہتے ہو۔۔۔ تو میں کبھی بھی تم لوگوں کے رستے کی دیوار نہیں بنوں گی۔۔۔ تمھاری خوشی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔‘‘

’’نہیں یار نہیں۔۔۔ کیوں! میں پاگل ہوں جو اُس سے شادی کرلوں؟ (قہقہے لگانے کے بعد) لیکن جان! تم اگر ان کی ظاہری خوب صورتی دیکھ لو تو دنگ رہ جاؤ اور ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں نہیں ہٹا سکو گی۔ آدمی کا دل انھیں دیکھنے سے نہیں بھرتا۔۔۔ لیکن یہ کم بخت بہت بدبودار ہیں ان سے ایک ناگواری

بو آتی ہے۔”

“اچھا۔۔۔لیکن پھر بھی۔۔۔تم نے ایسے بدبُو داروں کے لیے میری محبت سے خیانت کی ہے۔”

“پاگل ہو چکا تھا۔۔۔حواس کھو بیٹھا تھا (اپنے ساتھ بات کرتے ہوئے)۔۔۔اب بہت پشیمان ہوں۔”

“کتنے سال ہوئے کہ تم اُس سے نزدیک ہو؟”

“کافی عرصے سے۔۔۔پتہ نہیں کیوں مجبور رہا ہوں۔۔۔اپنے ساتھ بھی ظلم کرتے آیا ہوں (آہ بھرتے ہوئے) لیکن اب۔۔۔اب بہت تھک چکا ہوں اس گندی زندگی سے۔۔۔اب اپنے آپ کو مکمل طور پر آزاد کرنا چاہتا ہوں۔”

“انسان کو جس وقت اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو وہاں سے ہی اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے۔

“ٹھیک کہہ رہی ہو جان! میں جانتا ہوں۔۔۔تم میری ہو۔”

“اس میں کوئی شک نہیں! میں تمھاری تھی، تمھاری ہوں اور جب تک آخری سانس ہے تمھاری ہی رہوں گی۔ (تھوڑی خاموشی کے بعد)۔۔۔ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟”

“ایک نہیں جان! سینکڑوں سوال پوچھ سکتی ہو۔”

“اگر میں بھی تمھاری طرح کرتی۔۔۔تو تب بھی تم مجھے قبول کرتے؟۔۔۔”

“Hunm.....”

☆☆☆☆

پشتو تخلیق و ترجمہ: فاروق سرور

مجرم

''تم تو کہتے تھے کہ آج کے دن میں کسی پرندے کی طرح اپنے پروں کو کھول کر اڑنے لگوں گا، لیکن میرے پر تو آج بھی بندھے نکلے، ارے جھوٹے، مکار، فریبی! جھوٹ بولا تھا مجھ سے، دھوکا دیا تھا مجھ کو تم سورج نہیں ہو، بلکہ دوزخ ہو، آگ برساتا ہوا، رقص کرتا ہوا، جھومتا اور لہراتا ہوا، انسانوں کو جلانے والا، ان کا سخت دشمن، بلکہ جانی دشمن، ارے ازلی دشمن، ایک بہت ہی بڑی برائی ہو تم، ہاں ہاں، کسی خوفناک بلا سے کم نہیں، میں نے کہا، میری بات کان کھول کر سن رہے ہو نا۔''

کمال ہے آج وہ سورج کو بھی کوس رہا تھا، اپنے پرانے دوست کو۔ جس سے وہ گھنٹوں پیار و محبت کی باتیں کیا کرتا تھا۔

یہ سچ مچ کی ایک عجیب سی صورتحال تھی جو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ بہت سخت انداز میں جھگڑ رہا تھا، وہ بھی ہر بے گناہ اور بے قصور شخص سے اور دوسری طرف وہ سورج کو بھی برا بھلا کہہ رہا تھا۔ ایک ہی وقت میں دو فریق سے لڑائی، جو کسی عام شخص کا کام نہیں، بس ایک عجیب سا کھیل، ناٹک اور تماشا تھا، جو اس وقت یہاں جاری تھا۔

اسے، سورج کے طلوع صبح کے وقت ہی سے اچھے نہیں لگے، جو ان کے اچھے تعلقات اور دوستی کے برخلاف بات تھی، واقعی ان کا مثالی پیار ہر ایک کی زبان پر ہوتا، ہر جگہ اس کا چرچا ہوتا، بلکہ جوان لوگ اس کی اس حرکت پر ہنسا بھی کرتے، اسے، اس کے پاگل پن سے تعبیر کرتے، ہر صبح کا سورج اسے مسکراتا ہوا ملتا، وہ اسے خوش آمدید کہتا اور جواب میں خود بھی مسکراتا، پھر جب درختوں پر پیارے پرندے حسین گیت گاتے، ان کے غول ایک جگہ سے اڑتے اور پھر قریب کے دوسرے درختوں میں چھپ جاتے تو اسے سورج کی اس مسکراہٹ میں شدت اور پیار بڑھ کر نظر آتا۔ یہی سورج ہر صبح اسے صبر کی تلقین بھی کرتا اور کہتا کہ بہت جلد تمھارے خوش نصیبی کے دن آ رہے ہیں، جب تم بھی درختوں کے ان پرندوں کی طرح اڑنے لگو گے، اونچی اڑان، میرے یاران سے بھی زیادہ۔ اسے ہر وقت یقین ہوتا کہ وہ سورج کے ان اشاروں اور تاثرات کو خوب سمجھا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خوشی کا لمحہ ہوتا کہ وہ سورج کی زبان جانتا ہے، لیکن آج جب اس کی اڑان کا

دن تھا، تو حیران کن انداز میں سورج کا رویہ بدلا ہوا تھا، اس کا منہ چڑا رہا تھا اور اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہا تھا اس کی کوئی نیت نہیں تھی کہ آج اسے تسلی دے، اس کے بہت ہی پرانے زخمات پر مرہم لگائے، اس کے کچھ دیر بعد اڑ جانے پر مبارکباد دے، بلکہ وہ تو الٹا کسی خوفناک دشمن کی طرح مسلسل طنزیہ انداز میں مسکرائے چلا جا رہا تھا۔ سورج کا یہ بدلا ہوا رویہ مسلسل حیران کن تھا۔

اب وہ پھر ایک پاگل کی طرح سورج کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ارے میں ایک بار پھر لعنت بھیجتا ہوں تمھاری دوستی پر، ایک تو صبح کے وقت ہی سے، ایک ہی جگہ پر کھڑے کے کھڑے ہو اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ رہے، لگتا ہے کہ جیسے اپنی جگہ پر جم گئے ہو، برف ہو گئے ہو، حالاں کہ تم بدبخت کو پہاڑ کے پیچھے سے نکلے، پورے پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں، مجال ہے کہ ایک قدم بھی تم نے ہل جل کی ہو، اور پھر میری اس مجبوری، لاچارگی اور کمزوری پر مجھ پر مسکرا بھی رہے ہو، دغاباز کہیں کے، یہی ہے تمھارا پرانا یارانہ، شرم آنی چاہیے تمھیں، ایک بار پھر لعنت بھیجتا ہوں اس یارانے پر تمھارے۔“

اس کے ان ناختم ہونے والے اشاروں اور باؤلے پن پر، ایک بار پھر، وہاں موجود تمام لوگ چھپ چھپ کر ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیسے سمجھایا جائے، راہِ راست پر لایا جائے اور لڑنے اور منہ زوری سے روکا جائے۔

اب اچانک ایک نوجوان وارڈن اس مجمع کے درمیان سے نکلتا ہوا آگے بڑھا اور اسے ایک طرف لے جا کر سمجھانے لگا۔

”بابا جی! جیل کے اپنے قواعد ہوتے ہیں اور شام کو گنتی کے بعد ہی رہا ہونے والوں کو جیل سے چھوڑا جاتا ہے۔“

”تو اس لیے مجھے نہیں چھوڑا جا رہا۔“ وہ اس پر بھی چیخا لیکن وارڈن ہوشیار تھا۔

”بالکل، شام کو معمول کی گنتی ہوگی، تم کو چھوڑ دیں گے، اس میں فکر کی کون سی بات ہے، کیوں ناحق لڑ رہے ہو اور جیل کے ماحول کو خراب کر رہے ہو؟“

”اچھا تو یہ بات ہے، اب میں سمجھا، ارے میں تو یہاں جیلر کا بھی پیارا تھا، میرے ساتھ عام قیدیوں جیسا سلوک، چاہتے ہو کہ تم لوگوں سے بھی لڑوں، کمال ہے، چلو، درست ہے، مان لیتے ہیں، سرِ تسلیم خم کہ تمھارے اصول درست ہیں، چلتا ہے سب کچھ، ٹھیک ہے، اب میں جھگڑا نہیں کروں گا، لیکن اپنے اس دشمن سورج کو بخشوں گا بھی نہیں، ارے تو بخشنے کے قابل ہے، بول کیوں نہیں بول رہا؟“

ایک بار پھر سورج کی طرف اس کا اشارہ اور ایک بار پھر قیدیوں کی ہنسی۔ ایک عجیب سی صورتحال

تھی۔ جس پر وارڈن بھی پریشان ہوا، لیکن وہ سمجھدار تھا۔

”بابا! ان غیر ضروری باتوں میں اپنا وقت ضائع مت کرو بلکہ آج تمھاری رخصتی کا دن ہے اس لیے مختلف وارڈوں میں جاؤ اور قیدیوں سے اجازت لو، ان کا حق بخشواؤ اور اپنا حق بخشواؤ، کیوں موقعے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے ہو۔“

شہر سے بہت دور ایک پہاڑی علاقے میں اگرچہ غریبوں کے مٹی سے بنے ہوئے بہت سارے کچے سے گھر تھے، گاؤں نما، چھوٹا سا شہر تھا اور بھوک ہر وقت روتی ہوئی وہاں ملتی اور بیماریاں بھی چیختی چلاتی اس کا ساتھ دیتی ہوئی محسوس ہوتیں، لیکن کئی ایکڑ پر پھیلی ایک عمارت بھی وہاں موجود تھی، پکی سی عمارت، بہت بڑی عمارت، جسم میں سنسنی پیدا کر دینے والی بلکہ روح کو لرزا دینے والی عمارت، جو اس علاقے کی سب سے خوف ناک جیل کے نام سے مشہور تھی، اس جیل میں اس نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال گزارے تھے، اسے سزا سنائی گئی اور اس نے کاٹی بھی، لیکن وہ اتنا سادہ تھا کہ اسے آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ اس کا جرم کیا تھا اور نہ ہی اس نے اس کا کبھی کسی سے پوچھا کہ کیوں، کیا قصور کیا تھا اس نے اور کون سی برائی اس کے حصے میں شامل تھی، اس کی یہی سادگی جیل کے ہر جیلر کو پسند آتی، وہ اسے سادہ گل کہتا، اب وہ اپنا نام بھی بھول گیا تھا اور سادہ گل کے نام سے مشہور تھا، وہ جب جوان تھا تو سادہ گل پہلوان کے نام سے پکارا جاتا، وہ وہاں جیلر کا ہر حکم مانتا، اس کے کہنے پر پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھروں کو بھی توڑتا، اسی لیے لاڈلا سمجھا جاتا، ہر ایک سے پیار اور خندہ پیشانی سے پیش آتا اور اس کی جیل میں، عام قیدیوں کے برعکس، ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ میں جانے پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی، اس سے کبھی بھی جیل والوں کی طرف سے برا اور سخت سلوک بھی نہیں کیا جاتا۔ اس کی اگر نہیں بنتی تھی تو جیل کے وجود سے، اس کی تمام لمبی دیواریں اسے بڑے بڑے پھن پھیلائے ہوئے ناگ نظر آتے، سب اسے خوف ناک طریقے سے گھور رہے ہوتے، اس پر کئی سروں والے اژدھے کی طرح آگ برساتے، اب اس بڑھاپے کے دنوں میں تو تمام دن وہ جیل کی ان دیواروں کے پاس کھڑا ان کو برا بھلا بھی کہتا، ان کی طرف غصے سے اشارے کرتا اور سارا دن یہی اس کا معمول ہوتا، اسے زندگی اور آزادی کی خون چوسنے والی خوفناک بلا کہتا، جوانی اور زندگی کا قاتل بھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ سورج اس کا دوست بن گیا تھا، کیوں کہ وہ ہمدرد تھا اور سنجیدہ بھی، قیدیوں کی طرح غیر سنجیدہ نہیں، جن کی آنکھوں کا طنز اسے برا لگتا اور ان سے دل کی بات کرنے میں اسے کوفت اور ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی، جبکہ سورج اس طرح نہیں تھا، وہ تو اس کا واقعی اس کا دلدار تھا، اس کی ہر بات کو غور سے سنا کرتا اور اسے تسلی دیتا تو سورج کی خاص خاصیت اور خوبی تھی۔

اب منظر کچھ مختلف تھا، وہ خوش خوش سا مختلف وارڈوں میں وہاں کے قیدیوں سے رخصت لے رہا

تھا، جیل کا ہر قیدی سادہ گل چاچا کا عاشق تھا، ہر وقت اس پر مرمٹنے کو تیار رہتا، وہ اپنی اونچی آواز میں ہر وقت ان کو لوک گیت بھی سنایا کرتا اور دیس دیس کے شہزادوں کی کہانیوں کا بھی وہ ماہر تھا، اس لیے وہ سب اس کی ہمیشہ کی جدائی پر رونے لگتے اور ان کے آنسو برق رفتاری سے گرنے لگتے، لیکن بوڑھا بہت ہوشیار تھا اور اس کی کوشش ہوتی کہ ان کو رونے نہ دے اور خوب ہنسائے۔ کیوں کہ اس طرح کے دن، یہ سب کچھ عجیب سا تھا۔

''ارے کم بختو، میرے پیارو! آج تو آنسو بہانے کا دن نہیں، یہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، کس ظالم جادوگر نے تم پر تعویذ کیا ہوا ہے، آج تو خوشی کا دن ہے، شادمانی کا دن ہے، چہچہانے کا دن ہے، میری رہائی کا دن ہے، اس لیے آؤ کہ آج ہم سب چہچہائیں، رنگین پرندوں کی طرح، ننھے ننھے، پیارے، پیارے اور خوبصورت بلبلوں کی طرح، کیا، گیت گائیں، ہاں، ہاں، چلو تم لوگوں کو تکلیف نہیں دیتا ہوں، بلکہ اس موقع پر میں خود ناچتا ہوں، ارے صرف ناچوں گا نہیں، بلکہ موسیقی بھی بجاؤں گا، کیسے، پوچھو، پوچھو، اپنے منہ سے، اب تم لوگ دوبارہ پوچھو گے کہ ساری زندگی تو میں جیل میں سڑتا رہا، موسیقی میں نے کہاں سے سیکھی، ہاں، ہاں، یہ بوڑھا کھوسٹ کیسے اس قابل ہوا، تو جگو استاد سے، کس سے سیکھی، جگو سے، کیا بات تھی جگو کی، واہ، کمبخت نامراد، جیل میں بھی خوبصورت ہارمونیم بجایا کرتا اور میں مٹکے کی مدد سے طبلہ، جانتے ہو کہ جگو کو کیوں سزا ہوئی تھی، بیوی اسکی میم صاحب کی لاڈلی خادمہ تھی، اسی لیے نک چڑی تھی، ہنسو مت کم بختو، نک چڑی ہنسنے والا لفظ نہیں، تو کبھی بھی اس سے صحیح منہ، بات بھی نہیں کرتی تھی، ہاں ہاں، سنو، گورے لارڈ صاحب کی بھی اس پر نظر تھی، میری پیاری گڑیا پر، بڑی مٹک مٹک کر چلتی تھی، لارڈ صاحب اس ناگن سی چیز پر دیوانہ ہوئے جاتا، مت ہنسو، مت ہنسو، بے ہودا قسم کے لوگوں، دوبارہ دانت دکھانے لگے، کیا کہا میں نے، مت ہنسو، تو بات دل کی تھی، وہ تو سمندر کی ایک اکلوتی لہر تھی، جو مستی کرتی ہوئی، تیز اور ہوش اڑا دینے والے انداز میں، آگے بڑھتی، اسی لیے تنہائی میں لارڈ صاحب اسے اپنے پیار سے بھی نوازتا، کس کو، اپنی لاڈلی خادمہ کو، لارڈ صاحب کی طرف سے، سرکار کی طرف سے، یہ پیار اس کا حق تھا، لیکن سنا ہے کہ وہ اسے بھی نخرے دکھایا کرتی، اسی لیے تو سرخ سے لارڈ صاحب کو مزید گدگدی ہوتی، ارے ارے نہیں سناؤں گا، نہیں سناؤں گا، کیوں کہ تم لوگ ہنس رہے ہو، سنجیدہ نہیں ہو، چلو، اگر نہیں ہنسو گے تو پھر اپنی بات کو جاری رکھتا ہوں، ہائے بے چارا جگو، جگو بے چارا سب کچھ جانتا تھا، پیاری سی بیوی کی بے وفائی پر راتوں کو رویا کرتا، سنو سنو کمبخت، اپنے سر کو کسی طبلے کی مانند پیٹا کرتا، کوٹا کرتا، تھپڑوں کی بارش کر دیتا، میں نے کہا کہ آج اس کا سر پھٹا آج، لیکن وہ ایک مضبوط قسم کا کدو تھا، جو پھٹنا جانتا ہی نہیں تھا۔ پھر ہنس رہے ہو، ہائے میرا بھائی، پھر وہ غم میں ہارمونیم پر غمزدہ گیت سناتا، رات کے اندھیرے میں ارمان سے بھرے ہوئے گیت، رات کے اندھیرے میں دُکھوں کی بارات بلکہ بارش اور

میں اس کا طبلچی بن جاتا، ساری رات ہم دونوں اپنے کمرے میں جاگا کرتے غم میں ڈوبے رہتے اور روشنی کا بلب کبھی بھی وہاں نہیں بجھا کرتا، اس کو بھی جگو سے ہمدردی ہوتی اور لگتا کہ جیسے وہ بھی آنسو بہا رہا ہو، پھر اسی بیوفائی نے اسے اپنی بیوی کا قاتل بنایا اور جیل بھجوایا، خیر، گولی مارو جگو کو، خوشی کے اس موقع پر کمبخت کہاں سے آ گیا، مردود کہیں کا، ارے پریشان مت ہو جاؤ، اب وہ واپس جا چکا ہے اور ہارمونیم بجا رہا ہے۔ سنو موسیقی۔"

اب وہ اپنے پپولے منہ سے موسیقی سنانے لگا اور تمام قیدی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے، کیوں کہ اب وہ ناچ رہا تھا۔ اچانک ناچتے ناچتے وہ رک گیا۔

"خوشی کے دن، ڈانس بھی ہونا چاہیے، انگریزی ڈانس، ارے سنو سنو، سادہ گل چاچا، اپنا اتن، اپنا علاقائی رقص بھی جانتا ہے، اس کا بھی وہ مظاہرہ کرے گا، یہ ایک رنگین رقص ہوگا، دیکھو دیکھو خبردار، اب ہنسنے کی بات بھی زیادہ سامنے آئے گی، جب میں تم پر یہ راز افشا کروں گا کہ میں نے ڈانس کہاں سے سکھا، وعدہ کرو کہ تم لوگوں نے بالکل ہنسنا نہیں، وعدہ، وعدہ، تو چلو، سب سے پہلے ڈانس، ہاں ہاں گورے میاں کا، آقا کا، انگریزی ڈانس۔"

اب تمام قیدی ایک بار پھر زور زور سے ہنس رہے تھے اور بوڑھا پاگلوں کی طرح انگریزی ڈانس پیش کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کلاسیکی بھی، جو اس کے مطابق رنگین رقص تھا۔ ایک عجیب سی صورتحال تھی، بس بیچ بیچ رقص کے رنگ تھے کہ بدلتے جا رہے تھے۔ ایک آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

تک تک دن دا

تک تک دن دا

سا رے گا ما پا نی رے سا

سا رے گا ما پا نی رے سا

وے سا

وے سا

وے۔۔۔۔سا۔۔۔۔۔

او مائی ڈارلنگ

ڈارلنگ

ڈار۔۔۔۔لنگ۔۔۔۔لنگ۔۔۔۔کم آن، آئی لو یو۔

لگ رہا تھا کہ کوئی پاگل رقص پیش کر رہا ہو، اسی لیے بھی قیدی ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے، پھر وہ

اچانک رکا۔

”بیوقوفو! یہ تو پوچھو کہ یہ ڈانس میں نے سیکھا کہاں سے، ارے یہ باپ تو رہ گیا، تو موجو استاد سے، لیکن موجو نے یہ سیکھا کہاں سے، یہ بھی تو سوال ہے، ارے کم عقلو کبھی سوچا بھی کرو، سوچنے والی بات ہے، ایک خوبصورت اور نازک سی میم صاحب سے، ارے میم بھی بیوفا ہوتی ہے، کیسے، او نامرادوں سوال کرنا تمھارا حق ہے کہ گوری کیسے بے وفا ہوگئی، یہ بعد میں بتاتا ہوں، مت ہنسو، مت ہنسو، پہلے میرا ڈانس غور سے دیکھو، پھر اسے علاقائی رقص میں بدلتا دیکھو، اور یہ بتاؤ کہ میں کیسا ناچ رہا ہوں۔ میرے پاوں، ہاتھوں اور جسم کا کمال بھی دیکھتے جاؤ کہ کیسے اور کس طرح کسی سانپ کی طرح، بلکہ مست سی ناگن کی طرح بل کھاتے ہیں، لہراتے ہیں۔“

ارے اس رنگین سے رقص میں پشتو زبان کا ایک ٹپہ بھی سنتے جاؤ۔ بالکل، وہ بھی خوشی کے اس مبارک دن رقص میں شامل کرتا ہوں۔

او میری جاں
مجھے ہاتھ نہ لگا
میں تو پھول کی نازک سی کلی
بکھر جاؤں گی
بکھر جاؤں گی

او بدذوق، نامراد، ناہنجار نہ لگا، اپنے ہاتھ مجھے۔ کس کے، اپنے، اپنے - - -

پرے - - - پرے - - - اب وہ پھر ناچنے اور گھومنے لگا۔

ایک عجیب سی صورتحال تھی وہاں، اس کے اردگرد جمع ایک بڑے سے سرسبز لان میں، تمام قیدی اب تالیاں بھی بجا رہے تھے اور زور زور سے ہنس بھی رہے تھے، بلکہ کچھ تو اپنے کھانے کے برتن بھی اپنے کمروں سے نکال کر بجا رہے تھے۔ ارے او مسخرو مت ہنسو، وہ رقص بھی کرتا جا رہا تھا اور زور زور سے چلا بھی رہا تھا کہ اب بلکہ ابھی، دوبارہ موجو ڈارلنگ کی طرف آتے ہیں کہ اس نے میم سے ڈانس کیسے سیکھا۔ ذرا سا مجھے خود ڈانس کرنے دو۔ دل نہیں بھرا ہے میرا، کیوں کہ خوشی کا دن ہے اور دل ہے کم بخت کہ مان نہیں رہا۔ دیکھو میرے پاؤں رکنے میں نہیں آ رہے۔ لگتا ہے کہ جیسے ان پر جادو ہوا ہو۔ اگر کوئی روک سکتا ہے تو روکے۔ روکے۔

ڈارلنگ

ڈارلنگ

اچانک بوڑھے نے ڈانس کرنا بند کر دیا اور کچھ لمحے کے لیے خاموشی سی چھا گئی۔ کمال ہے اس بڑھاپے کے باوجود اس کی سانس نہیں چڑھی ہوئی تھی اور مزے سے اس مجمعے کے درمیان بیٹھ گیا۔ بس کبھی وہ ایک کی طرف ہنس کر دیکھتا اور کبھی دوسرے کی طرف، کسی شرارتی اور معصوم سے بچے کی طرح اور پھر اس کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں، واقعی اس وقت بڑے جوش میں اس کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ سرخ تھا اور محفل اب بھی قہقہوں سے لالا زار ہو رہی تھی۔

”تو اب میں ڈارلنگ کی طرف آتا ہوں، میم ڈارلنگ کی طرف، سنو گے یہ کہانی، لیکن ٹھہرو، پہلے مجھے اس کمبخت سورج سے دو دو ہاتھ کرنے دو، ارے او بدمعاش تم کیوں آگے کی طرف نہیں بڑھتے، ارے ظالم کیوں مجھے تڑسا تڑسا کر مار رہے ہو، کیا ملے گا اس بوڑھے کو قتل کر کے تم کو، دن ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا۔“

اب وہ اچانک اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا، لیکن قیدیوں اور جیل کے نیک دل وارڈن نے اسے سمجھایا کہ سورج آگے کی طرف بڑھ رہا ہے، صرف تم کو محسوس نہیں ہو رہا، کیوں کہ تم اپنی خوشی میں غرق ہو۔

”قصہ مختصر، بات یہ ہے کہ موجو ذرا خوبصورت سا نوکر تھا، کس طرح کا نوکر، راج دلارا نوکر، اور میم کا شوہر، بوڑھا شوہر، جب شوہر بوڑھا اور بیوی جوان تو ہوتا ہے گڑبڑ، سو ہو گئی گڑبڑ۔ میم موجو کو مختلف بہانوں سے ڈانس سکھاتی، کم آن ڈارلنگ اور دل دے بیٹھتی۔ ارے بیوقوفو! روزانہ ہی دل دے بیٹھتی، ایک دن وہ دل ہار رہی تھی کہ اس خطرناک موقع پر لارڈ صاحب پہنچ گئے، کہاں اپنے گھر، پیارے گھر، کسی کام سے، بس پھر بڑا گڑبڑ، مت ہنسو، مت ہنسو کسی بندر کی طرح، دانت دکھائے جا رہے ہو، شرم نہیں آتی، ہائے ہائے تو کیا ہونا تھا کہ بیچارا موجو پہنچ گیا جیل، او میرے ساتھی، وہ بن گیا میرا ساتھی، بدبخت روتا بھی، میں اس کا غم گسار اور اسی نے سکھائی، مجھے ڈانس، ارے کمبخت میم کی طرح میری کمر میں ہاتھ ڈالتا، بوڑھے کو میم سمجھتا، کم آن ڈارلنگ، کم آن ڈارلنگ، ڈارلنگ، ڈار۔۔۔۔لنگ۔۔۔۔“

اب بوڑھا دوبارہ ناچنے لگا اور سارے قیدی اپنے پیٹ پکڑ کر دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگے۔

اچانک کسی قیدی نے ایک نیا موضوع چھیڑا۔

”سادہ گل چاچا! بہت ہو گیا مذاق، اب یہ بتاؤ کہ گھر میں سارا دن بستر میں سو گے، اناج کے دشمن بنو گے یا کوئی کام کاج بھی کرو گے؟“

یہ سخت سا سوال اس موقع کے لیے نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے لیے تیار تھا، اسی لیے اس نے ماتھے پر بل لا کر قیدی کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا، لیکن پھر جب تمام قیدی اس بات پر اصرار کرنے لگے تو اس

نے ماتھے کو مزید بل دیے، اب جب اصرار ضد میں بدلا تو اس نے کسی فلاسفر کی طرح آنکھیں بند کر کے معاملے کی نزاکت کو سمجھا۔ اب اس نے دوبارہ ایک آنکھ کھولی، کسی پہنچے ہوئے شخص کی طرح حاضرین کی طرف دیکھا، جائزہ لیا، کنکھارا، ایک دو بار کھانسا اور اپنے گلے کو صاف کر کے بہت شاہانہ انداز میں آہستہ آہستہ بلکہ رک رک کر بولنے لگا۔

"مجھے سوالات اچھے لگتے ہیں، اور میں ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں، جن کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوتے ہوں، اسی لیے سورج بھی مجھے پسند تھا۔"

سورج کا نام آتے ہی وہ ایک بار پھر آپے سے باہر ہو گیا اور کسی بے قابو شخص کی طرح اپنی جگہ کھڑا ہو کر ایک بار پھر سورج سے لڑنے لگا۔

"ارے او بے وفا، او جانی دشمن، اب تو ان بوڑھی ہڈیوں پر رحم کر، اب تو ان میں کچھ بھی نہیں رہا، سوکھی لکڑیاں ہیں، کسی جنگل کی طرح سوکھی لکڑیاں، آگے چل اور دشمنی نہ کر، ورنہ یہ سارے قیدی تمھارے دشمن بن جائیں گے، ارے بد بخت، جب دشمن زیادہ ہو جاتے ہیں، تو تمھاری جگہ تارے لے لیتے ہیں، مت کر دشمنی مجھ سے، ورنہ ۔۔۔۔"

جب وہ سورج سے لڑنے کے لیے آگے کی طرف بڑھا تو بہت سارے قیدی تیزی سے اٹھے، انہوں نے ہنستے ہوئے اسے روکا اور سمجھانے لگے۔

"بابا جی! بد مزگی مت پیدا کرو، دیکھو تو آدھا دن گزر گیا، اب دوپہر کے کھانے کا وقت قریب ہے، سورج کو تم سے کوئی خار نہیں، آج تمھارے بری ہونے کی وجہ سے جیلر صاحب نے بھی قیدیوں کو چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ کوئی کام نہ کرے، بلکہ سادہ گل بابا کا جی بہلائے۔ بس جلد ہی دن کا وقت ختم ہو جائے گا۔ بتا دو ہمیں کہ اب مستقبل کے لیے تمھارے کیا ارادے ہیں۔"

اب بوڑھا دوبارہ مجمعے کے درمیان بیٹھ کر پاگلوں کی طرح زور زور سے ہنسنے لگا۔

"نوجوان عموماً بے وقوف ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ نا تجربہ کار ہوتے ہیں، اسی لیے تم لوگ ارادوں کی بات کر رہے ہو۔ ارے بے مغز لوگو! ارادے بعد میں آتے ہیں، پہلے خواب آتے ہیں، کیا آتے ہیں، خواب اور خواب ہی سے ارادے بنتے ہیں۔ تو میرے بے شمار خواب ہیں، سنو گے وہ خواب؟"

"ہاں ہاں سادہ گل بولو کیا ہیں تمھارے خواب، بتا دو نا۔" اس وقت وہاں بیٹھے بڑی عمر کے لوگوں نے بھی اصرار کرنا شروع کر دیا۔

اب بوڑھے نے دوبارہ اپنی آنکھوں کو بند کر دیا اور زور زور سے کھنکارنے لگا۔

”تو اللہ پاک تم لوگوں کو خیر دے، تمھیں تو پتہ ہے کہ ایک پورا گاؤں میرے نام پر ہے اور وہ تمام کی تمام جائیداد میری ہے۔ پتہ نہیں، کیوں مجھے جیل بھیجا گیا، حالاں کہ سرکار تو امیر لوگوں کو جیل نہیں بھیجتی، بہرحال سرکار جانے، اس کا کام جانے۔ یہ سرکار کا بھی عجیب دماغ ہے۔ سب سے پہلے میں اپنے گاؤں میں افیم کے کھیتوں کو آگ لگا دوں گا، کیوں کہ جب بھی دشمن کسی قوم کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے نوجوانوں کو نشے کا عادی بناتا ہے، کیوں کہ نشے میں ڈوبے ہوئے نوجوانوں کے ذہن میں سوالات پیدا نہیں ہوتے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں ارادہ بھی نہیں آتا، کام بھی نہیں ہوتا اور وہ قوم ترقی بھی نہیں کرتی۔ عورتوں کو ہم نے باندھی بنایا ہوا ہوتا ہے اور میں ان کو مردوں کے برابر حیثیت دوں گا تاکہ وہ تعلیم حاصل کریں اور اپنے بچوں کو اچھے خواب دکھائیں۔ اپنے گاؤں میں ڈھول، باجا اور رباب بجانے والوں کی تنخواہ مقرر کر دوں گا، کیوں کہ گاؤں والے اور علاقے کے لوگ سب کے سب دکھی اور بدامنی کا شکار ہیں اور موسیقی ہے امن کا دوسرا نام تو جب موسیقی اور کام ہوگا تو وہاں امن بھی ہوگا۔ تمام بندوقیں، پستولوں اور چھریوں کو جلا دوں گا، تاکہ وہاں کوئی جیل نہ ہو اور قیدی نہ ہو۔ وہاں مردہ جرگے کو زندہ کر کے دشمنیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں گا، کیوں کہ اس خبیث نفرت کی وجہ سے کوئی بھی اچھی اور شاعری والی نرم بات نہیں سوچتا، کیوں کہ وہ آگ ہوتا ہے اور آگ کو شاعری سے نفرت ہے۔۔۔۔“

گو کہ اس وقت وہ اپنے خواب انھیں اپنی آنکھیں بند کر کے سنا رہا تھا، لیکن قیدی تھے کہ اس کے خوابوں کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے، بلکہ وہ سب تو روئے جا رہے تھے، دکھ کا ایک پہاڑ تھا کہ ان پر گر رہا تھا، اس وقت دنیا کا سب سے حسین انسان ان سے چھینا جا رہا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اب انھیں گیت کون سنائے گا، کہانیاں کون اور اس دکھ کے ماحول میں ان کو ہر وقت ہنسانے والا کون ہوگا، امید دینے والا کون ہوگا، کون اس گھٹن کی فضا میں ان کے روزانہ کے تازہ زخموں پر مرہم رکھے گا۔ بس سوالات تھے کہ قیدیوں کے سامنے ناچ رہے تھے کہ اب فطرت بھی اس ماتم میں شریک ہوئی، نامعلوم کہاں سے بادل کا ایک کالا سا ٹکڑا آیا اور وہیں پر رک کر طوفان کی صورت اختیار کر گیا۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، قیدی بھی صحن سے نہیں ہٹ رہے تھے، بابا بھی اور آنسو تھے کہ بہے جا رہے تھے۔ بس ایک سیلاب تھا کہ جس میں آنسو اور پانی کی بوندوں کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ سورج بھی ایسا غائب ہو گیا تھا کہ لگ رہا تھا کہ ان بادلوں کے پیچھے جیسے اس نے اپنے چلنے کی رفتار بہت تیز کر دی ہو۔

شام کے اندھیرے میں جب وہ رخصت ہو رہا تھا تو دوبارہ ایک ایک بیرک میں جا رہا تھا، سلاخوں کے پیچھے بند قیدی اس کو دیکھ کر آخری بار ہاتھ ہلا رہے تھے، ان سب کے چہروں پر اب خوشی کھیل رہی

تھی اور وہ سب اب ہنس ہنس کر اسے رخصت کر رہے تھے۔ وہ بھی خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا، اس کے سر پر نئی پگڑی اور جسم پر نئے کپڑے تھے، جو قیدیوں نے اپنے پیار میں زبردستی اسے پہننے کو کہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنے کپڑوں کی پوٹلی تھی اور وہ کالے گیٹ کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اب اس کا سارا گاؤں چیختا ہوا اس کا استقبال کرے گا۔

جب گیٹ کھلا تو وہ تیزی سے باہر نکل آیا کہ اب اس کے لوگ اسے گود میں اٹھا لیں گے، لیکن یہ کیا وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بلکہ اس اندھیرے میں ایک کالی سی خوفناک گاڑی کھڑی تھی، بالکل جیل کی گاڑی کی طرح، جب وہ اپنے مقدمے پر جایا کرتا تھا۔

اچانک پولیس کی وردی میں ایک سرخ وسفید اور نیلی آنکھوں والا آفیسر اس اندھیرے سے نکلتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اسے ایک کاغذ کا ٹکڑا تھمایا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بابا جی یہ تمھارے خلاف نئی ایف آئی آر ہے۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے، میں تو تیس سال یہاں سلاخوں کے پیچھے بند رہا۔" وہ زور سے چیخا۔

"تمھارا جرم یہ ہے کہ تم خواب دیکھتے ہو، جب کہ تمھیں پتہ ہونا چاہیے کہ اس دیس میں خواب دیکھنا جرم ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس طاقتور پولیس آفیسر نے اسے، اس کی پوٹلی سمیت اس کالی سی گاڑی کے اندر پھینکا، جس میں موجود جنگلے کا دروازہ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

نصیر احمد

پنجابی سے ترجمہ: اعظم ملک

آہ۔۔۔میرے معانی

”عزیزانِ گرامی! انسان اپنی فطرت ہی میں ظالم ہے۔ ظلم و زیادتی اس کی رگوں میں خون بن کے دوڑتی ہے۔۔۔“

لائبریری کے مین ہال میں لفظوں کا ایک سمندر ٹھوک رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے یہ الفاظ لائبریری میں موجود لغات، فرہنگ، انسائیکلوپیڈیا اور تھیسارس وغیرہ چھوڑ کر مین ہال میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہر لفظ اپنی شناخت اُتار کر، بُک شیلفوں میں قرینے سے رکھی چمڑے کی جلدوں ہیں چھوڑ آیا تھا۔ جہاں اب صرف معانی رہ گئے تھے۔۔۔ بغیر لفظوں کے معانی۔۔۔ جن کی اب کوئی شناخت نہیں تھی۔

یہ سب الفاظ اپنے معنوں سے باغی ہو چکے تھے۔ کسی لفظ نے سبز چوغا پھونک ڈالا تو کسی نے ٹوپی اور تسبیح زمین پر دے ماری۔ کوئی لفظ لٹیں کٹوا نے چل دیا تو کسی نے صحیفہ بند کر کے کوئی فحش سے نظم چھیڑ لی۔

’تمدّن‘ کا لفظ ایک مدت سے بیمار تھا۔ دو الفاظ سہارا دیے ہوئے نیم بے ہوشی کی حالت میں اُسے لائے اور لائبریری ہال کے وسط میں رکھے ایک بڑے میز پر اسے لٹا دیا، جہاں ہر تھوڑی بعد دورہ پڑنے کے سبب وہ چیخیں مارتا، ایڑیاں رگڑتا اور بے ہوش ہو جاتا۔

لائبریری ہال میں بڑھ رہی افراتفری کی پیشِ نظر کچھ لفظوں نے باہمی مشاورت سے ’سربراہ‘ کے لفظ کی منت سماجت کی کہ ”تمھارا تجربہ ہے، تم ہماری سربراہی کرو۔“ پہلے تو وہ نہ مانا کہ ”میں تو خود متروک ہو جانا چاہتا ہوں۔“

لیکن تھوڑ زور ڈالنے پر مان گیا کہ وہ رات بھر کے لیے اس بھیڑ کی سربراہی کرے گا اور صبح ہوتے ہی کسی اور کو منتخب کر لیا جائے اور اب وہ ایک میز پر چڑھا دھواں دھار تقریر کر رہا تھا۔

”۔۔۔اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان نے ہمیں اپنی مرضی کے معنوں سے باندھ رکھا ہے۔۔۔ یہ حق اس کو کس نے دیا۔۔۔؟ ہم اس کی غلامی کرتے ہیں اور ہماری غلام کے بل بوتے پر یہ دُنیا پر حکومت کرتا ہے۔ ہمارے سبب یہ بولتا، لکھتا اور پڑھتا ہے۔۔۔ لیکن اب ہم اس کے غلام نہیں رہیں گے۔“

''نہیں رہیں گے۔۔۔نہیں رہیں گے۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ گونج اُٹھیں۔

ایک لفظ جس نے دوسرے لفظ کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا، ایک تپائی پر چڑھا اور پورے زور سے گلا پھاڑتے ہوئے نعرہ لگایا۔

''حیوان ناطق۔۔۔۔۔۔مردہ آباد۔''

تقریر لمحہ بھر کو رکی اور نعرے کے بعد پھر شروع ہو گئی۔ ''الفاظِ گرامی قدر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کی رات دھرتی کے کسی فرد کو کوئی خواب نہیں آیا ہوگا۔۔۔۔''

''اور اگر آیا بھی ہوا تو، ہمارے جیسا ہی آیا ہوگا۔'' بلیک بورڈ کا لفظ، اندھیرے کے لفظ کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنسا۔ بلیک بورڈ کا لفظ گیلے ڈسٹر سے پونچھے ہوئے بلیک بورڈ کی طرح چمک رہا تھا جیسے ابھی ابھی کینچلی اُتار کے آیا ہو۔

ہال میں اب امن تو نہیں پر ایک نظم سا ضرور نظر آرہا تھا۔ ایک کونے میں لگے ہوئے سوئی، دھاگہ اور ہونٹ کے لفظ، ہر تھوڑی دیر بعد کسی بات پر قہقہہ لگاتے۔ 'گوڑے' کا لفظ 'عطر' کے لفظ کے کندھے پر سر رکھے رو رہا تھا۔ 'چاند' کا لفظ لائبریری ہال کی کھڑکی سے لگا آسمان پر چمکتی ہوئی ٹکیا کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ابھی نگل جائے گا۔

بات صرف معانی تلک ہی محدود نہیں تھی بلکہ 'دھرتی' کا لفظ اپنے دائرے سے عاجز تھا۔ 'سپاہی' کے لفظ کو اعتراض تھا کہ اسے مؤنث کیوں نہیں لکھا جا سکتا؟

قریب ہی 'راکھ' کا لفظ 'بارش' کے لفظ کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔

'درویش' کے لفظ کو 'دُنیا' کے لفظ کی بانہوں میں بانہیں ڈال ناچتے ہوئے دیکھ کر 'افسوس' کا لفظ صدیوں بعد مسکرایا تھا۔

'سربراہ' کا لفظ ابھی تک تقریر کیے جا رہا تھا لیکن اس کا گلا خشک ہوا نہ ماتھے پر پسینہ آیا کیوں کہ یہ سربراہ نہیں بلکہ سربراہ کا لفظ تھا'' ۔۔۔۔دوستو! ہم آج سے انسان کے دیے ہوئے معانی قبول نہیں کریں گے۔۔۔۔یہ اپنے معانی اپنے پاس رکھے۔۔۔۔آج سے ہم بغاوت کا اعلان کرتے ہیں۔۔۔۔''

ہال میں شور مچ گیا۔ نعرے بازی نے لفظوں کو مزید گرما دیا۔ وہی لفظ جس نے دوسرے لفظ کو کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا، ایک بار پھر تپائی پر جا چڑھا۔ ابھی تک کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ ''تم نے اپنے کاندھوں پر دُوسرا لفظ کیوں اٹھا رہا ہے؟'' اور نہ ہی کسے نے اوپر والے لفظ سے پوچھا تھا کہ ''میاں! اسی لفظ کے کاندھوں پر کیوں سوار ہو۔''

اب ایک لفظ تپائی پر اور دوسرا اس کے کاندھوں پر سوار تھا۔ ایک بار پھر اس نے پورے زور سے نعرہ لگایا۔

''حیوانِ نا۔۔۔۔'' اس سے پہلے کہ نعرہ مکمل ہوتا دونوں لفظ دھڑام سے زمین پر آن گرے اور ''اُردو' کی 'اُر'۔۔ 'دُو' سے دور جا گری اور 'پنجابی' کا 'پنجا' بھی 'بی' سے الگ ہوگیا۔

یہ حادثہ دیکھ کر 'تہذیب' کا لفظ سنبھالنے کو دوڑا۔ 'تمدن' کے لفظ کا سانس حلق میں آ گیا، اس نے ایک بار پھر پالش ہوئی ساگوان پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے دردناک چیخ ماری اور غش کھا گیا۔

ایک لامبی سفید داڑھی والا لفظ اٹھا اور جھریوں والے ہاتھ کی انگلی بھرپور انداز میں جائے حادثہ کی طرف اٹھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اگر پنجابی کا پاؤں پھسلا تو۔۔۔۔''

''کیا تکلیف ہے تمھیں۔۔۔۔؟'' جھریوں والے ہاتھ کی بات بیچ ہی میں رہ گئی۔ لامبی سفید داڑھی والے چہرے نے نظر گھما کر دیکھا جہاں 'مرید' کا لفظ 'مرشد' کے لفظ سے اُلجھا ہوا تھا۔

''میں نے کیا کہا ہے؟''

''تو پھر گھور کیوں رہے ہو۔''

''میں کیوں گھوروں گا؟۔۔۔۔ میں تو دیکھ رہا۔۔۔۔''

''کیا دیکھ رہے ہو؟۔۔۔۔۔ اور کیوں دیکھ رہے ہو؟'' مرید کے لفظ کا غصہ آسمان سے جا لگا۔

''اوئے تم۔۔''

''ہاں میں۔۔۔۔ مجھ سے نہیں ہوتی اب تیری غلامی۔۔۔۔۔ اور نہ ہی اب تمھارے پاؤں دھو دھو کر پیے جاتے ہیں۔'' مرید کا لفظ آپے سے باہر ہوگیا۔

''تیری اوقات ای۔۔۔۔'' مرشد لفظ کا جملہ ابھی درمیان ہی میں تھا مرید نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور ہوتا 'تلوار' کے لفظ نے صلح کروا دی۔

اسی لڑائی کے دوران ہی رات بھی دم توڑ چکی تھی اور اس کی خبر تب ہوئی جب اچانک اذان نے سب کو چپ کروا دیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ 'سربراہ' کے لفظ نے معاملہ سنبھالا'' حاضرین! اذان وتلاوت جیسے الفاظ خدا کے الفاظ ہیں اور ہماری لڑائی انسان کے ساتھ ہے۔''

''ہاں۔۔۔۔'' اطمینان میں ڈوبی کئی آوازیں اُبھریں لیکن کچھ لفظوں کو یہ بیان سیاسی سا لگا اور انھیں محسوس ہوا کہ 'سربراہ' کا لفظ اپنے معانی سے دوبارہ جڑنے کی چالاکی کر رہا ہے۔

دھیرے دھیرے دن نکل آیا لیکن آج اس دن کا کوئی نام، کوئی تاریخ، کوئی حوالہ نہیں تھا۔ آج اُفق پر جو سُرخی پھوٹی تھی اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ لائبریری ہال کے روشن دان کی درز سے آتی ہوئی کوئی شے میز پر دراز ’تمدن‘ کے لفظ کے چہرے پر پڑ رہی تھی لیکن اس کا کوئی نام نہیں تھا۔

کچھ لفظ ہال کی کھڑکی سے لگے انسان کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے اسکول تھا اور ننھے منے حیوان ناطق ہنستے کھیلتے جا رہے تھے۔ اسکول کے باہر چہچہاہٹ تو تھی لیکن کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی اور کھڑکی سے لگے الفاظ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ بول رہے ہیں یا بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کھڑکی کے عین نیچے اسکول کے راستے میں ایک ٹھیلے والا بچوں کی من پسند چیزیں لگائے بیٹھا تھا۔ دو بچے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے، گزرتے ہوئے اچانک ٹھہر گئے۔ ایک بچے نے کچھ سکے نکالے اور ٹھیلے والے کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے ایک لفافے کی طرف اشارہ کیا۔ اُدھر لفظ کھڑکی میں کان لگائے منتظر تھے لیکن بچوں اور ٹھیلے والوں میں سے کوئی ابھی تک بولا نہیں تھا۔ ٹھیلے والے نے بچے کے اشارہ کردہ لفافے میں سے مٹھائی سی نکالی اور اخبار کے کاغذ میں لپیٹ دی۔

’’مجھے بھی کھلاؤ بھائی۔‘‘

بچے کا مکالمہ سن کر کھڑکی سے لگے ہوئے لفظوں کا رنگ اُڑ گیا۔ حیوانِ ناطق بول رہا تھا۔ سارے ہال کو سانپ سونگھ گیا۔ ’’تمدن‘‘ کے لفظ کو بھی ہوش آ گیا تو اس نے کہنیوں کے بل اپنا نحیف جسم ذرا سا اٹھایا اور ہال میں نظر دوڑائی۔ دُور تک لفظ ہی لفظ تھے جو اپنے معانی چھوڑ آئے تھے۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے پپڑی جمے ہونٹوں پر مسکان طلوع ہوئی، اسے ساری بات سمجھ آ گئی۔ لفظوں کے اس سمندر میں کچھ لفظ شامل ہی نہیں ہوئے تھے مطلب کہ عشق، پریت اور ممتا جیسے لفظوں نے ابھی اپنے معانی نہیں چھوڑے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆

ملک مہر علی

پنجابی سے ترجمہ: **قمر الزمان**

ڈھیریاں

کچھ بھی نہیں بچا، سب کچھ بہہ گیا ہے۔ یارو! بڑے سچ ہی کہتے ہیں کہ سیلابی ریلے کو چیر کر راستہ بنانا زندگی کی فرات کو عبور کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

یہ بات خشکی پر پہنچنے کے بعد اپنی چادر نچوڑتے ہوئے اس نوجوان کے منہ سے نکلی، جو زیرِ آب آئے گھروں کا پتہ کرنے گیا تھا۔ یہ سن کر وہاں انتظار میں کھڑے لوگوں میں کچھ اور پوچھنے کا جیسے حوصلہ ہی نہ رہا۔

پت جھڑ میں اس نے درختوں کو جھڑتے ہوئے تو کئی بار دیکھا تھا مگر لوگوں کو یوں اجڑتے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

اسے یوں لگا جیسے انسانوں اور پیڑوں کی ایک ہی جون ہے، دونوں آدرشوں میں پروان چڑھتے ہیں، مگر جب آدرش نہ رہیں انسان ہو یا پیڑ دونوں ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔

پانی میں تیرتے گھروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ پیڑوں کے جھڑنے کا تو پھر بھی کوئی موسم ہوتا ہے، مگر انسانوں کے لیے تو اس کی بھی قید نہیں، جانے کب پت جھڑ شروع ہو جائے۔

ٹیلے پر کھڑے خزاں گزیدہ لوگوں میں سے ایک گویا ہوا:

”اس پانی نے تو انسانوں کی تباہ کر دیا ہے۔ بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ آگ کا علاج پانی ہے مگر پانی کا علاج ۔۔۔۔۔؟“

دوسرا بولا:

”طغیانی دریا کی ہو یا آنکھ کی، جب بھی آتی ہے بربادی ہی ساتھ لاتی ہے۔ ویسے بھی ایسی طغیانیوں کا موسموں سے کیا سمبندھ۔“

امسال یوں تو سیلاب نے دریا کے اردگرد کے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا لیکن وہ بستی، جس کے وہ باسی تھے، مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تھی۔

اگرچہ دریا ہر سال پانی کناروں سے باہر اچھالتا، جس سے تھوڑا بہت نقصان تو ہوتا، مگر وہ زرخیزی بھی ساتھ لاتا۔ تاہم ان لوگوں کے گھر اونچی جگہوں پر ہونے کے باعث بچ جاتے۔ گھر کیا تھے مٹی کی دیواریں

اور گھاس پھوس۔ وہ انھی میں ہنسی خوشی رہتے۔ یوں جیسے انھیں اس بات کا یقین ہو کہ انھوں نے یہاں ہمیشہ نہیں رہنا۔

سیلابی پانی سے باہر آنے والا جوان دوبارہ گویا ہوا:

”طغیانی تو ہر سال آتی ہے مگر ایسی تباہی پہلی بار دیکھی ہے، بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ لگتا ہے اس بار قحط ضرور پڑے گا۔“

یہ سن کر دوسرا نوجوان کہنے لگا:

”اگر خوشحالی نہیں رہی تو قحط بھی نہیں رہے گا۔ رب کی طرف سے آزمائش ہے، اسی کے بھروسے پہ جھیل لیں گے۔“

اسی بستی کی ایک بوڑھی، جو، ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی، اپنے ہاتھوں سے زمین کا سہارا لیتے ہوئے اٹھی اور ان کے قریب آ کر زیرِ آب آنے والے گھروں کا پتہ لینے والے نوجوان سے مخاطب ہوئی:

”بیٹا قبروں کا کیا بنا؟“

نوجوان بولا:

”اماں وہ بھی گئیں، چلو! جب گھر بنیں گے تو وہ بھی بن۔۔۔۔۔“

نوجوان ابھی اپنا جملہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ بوڑھی عجلت میں بول اٹھی:

”خدا خیر کرے۔ نہ بیٹا نہ یوں تو نہ کہو! قبریں اتنی آسانی سے نہیں بنتیں ان کے لیے تو مرنا پڑتا ہے۔“

☆☆☆☆

پوٹھوہاری تخلیق وترجمہ: شیراز طاہر

فالج زدہ لفظوں کی کہانی

کہانی اور افسانہ اپنے اندر کے مضمون سے قاری کو متاثر نہ کرسکیں تو وقتی طور پر اپنا حق پورا ادا نہیں کرتے۔ کہانی کار کا اپنا ایک کمال ہوتا ہے۔ وہ کہانی کو لچھے دار بنا کر سامع یا قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ جبکہ افسانہ نگار ایک بھرپور تاثر کے ساتھ ایک ہی نقطے پر کہانی کو مرکوز کر کے آخر تک قاری پر سحر طاری کیے رکھتا ہے۔

ان دونوں میں واضح فرق کو میری بیوی خوب سمجھ جاتی ہے۔ یوں تو وہ بھی پوری فیملی کے ساتھ ڈرامہ یا کوئی فیملی کھیل دیکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ مگر جب کبھی اُسے کوئی کہانی یا افسانہ پڑھ کر سنایا جائے تو وہ ایک بار سننے کے بعد دونوں میں تفریق کا اچھا خاصا پہلو نکال کر رکھ دیتی ہے۔

میرے افسانے سننے کے بعد اُسے کئی بار بیزارگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ جب بھی ایسا کرتی تو مجھے محسوس ہو جاتا کہ افسانے میں کہیں جھول ضرور ہے۔ یا کوئی فنی نقص یا پھر تسلسل میں ہم آہنگی نہیں رہی۔ اکثر افسانے جو اچھے افسانے شمار ہوتے۔ وہ اُسی کے ہی مرہونِ منت ہوتے۔ افسانے جو اپنے تئیں ایک بھرپور تاثر چھوڑ کر ختم ہو جاتے ہیں اُسے یاد رہتے ہیں اور بہت مزہ دیتے ہیں۔ اُس کی روح تک سرشار ہو جاتی ہے۔

ویسے کہانیوں میں اُسے منشا یاد کی کہانیاں بہت پسند ہیں۔۔۔ یا کہانی لکھنے والوں میں منشا یاد۔

آج بھی وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی کہنے لگی: ”آپ نے افسانہ لکھا تھا، سنایا نہیں۔“

”ہاں لکھا تھا۔ ابھی مکمل نہیں ہوا۔“ میں نے یوں ہی بہانہ بنا کر ٹالنے کی کوشش کی۔ میں بھی ڈرامے کا ایک سین دیکھنے میں گم تھا۔

”کچھ تو لکھا ہوگا۔“ اُس نے ریموٹ سے آواز کم کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں لکھا ہے پر کلائمکس پر جا کر اٹک گیا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کرداروں کے حوالے سے جو انجام سامنے آتا ہے اُس پر کہانی کو ختم کر دوں۔ یا کرداروں کے لحاظ سے افسانے کا بھٹکتا ہُوا کلائمکس قارئین پر چھوڑ دوں۔

کہنے لگی: ”کردار کیا کہتے ہیں۔۔۔؟“

کرداروں سے میں سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے چہرے پر نظریں جمائے، بغیر جواب دیے چپ ہو گیا۔ وہ بھی سوچوں میں گم ہو گئی ٹی وی پر سے کچھ دیر کے لیے ہم دونوں کا دھیان ہٹ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے پر پھیلتے اور سمٹتے تاثرات کو غور سے دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد میں نے اُس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور اُٹھ کر اُس کے قریب چلا گیا۔ بچہ اُس کی گود میں سو چکا تھا میں نے سوئے ہوئے بچے کے رخساروں پر پیار کیا اور کہا۔

"کرداروں میں سے کسی بھی کردار کو زیادہ ابھارنے یا اُس کے نظریات اور احساس کو جگانے کی کوشش کی تو باقی کرداروں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"تو کہانی کے اندر اپنے ہی کردار کو ابھارنے کی کوشش کر لو۔"

"یہ اور بھی زیادتی ہوگی۔ اپنے کردار کو ابھار کر پیش کرنا۔ باقی کرداروں کے ساتھ بے انصافی بھی ہو سکتی ہے۔ میں انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ کہانی کا عنوان بھی پھیلا ہے۔ کہ ایک کردار کو ہائی لائٹ کرتا ہوں تو دوسرے کردار احتجاج کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی کردار مفلوج ہو سکتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں کہانی کا رخ بدلنا چاہا۔ مگر اسی لمحے میرا اپنا ہاتھ مفلوج ہونا شروع ہو گیا۔ بائیں ٹانگ میں رعشہ سا طاری ہونے لگا میں نے ملتجی نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی ڈرامے میں کسی منظر پر نظریں جمائے ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھی۔

اُٹھ کھڑی ہوئی جیسے اُس نے مجھے کہانی کا رخ موڑتے دیکھ لیا تھا۔ اتنی جلدی کہانی کا رُخ کیوں بدل لیا ہے ابھی تو کہانی کو اپنے تاثر کو اُبھارنے میں تھوڑی دیر اور آگے جانا چاہیے تھا۔ بیوی نے بجائے مجھے سہارا دینے کے بے زارگی کا اظہار کیا۔

"کیا کروں جب اپنے ہی کردار کو سولی پر لٹکانا ہے تو پھر کس بات کی دیر ــــــ" میں نے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ میں سہارتے ہوئے کہا۔"

"یہ افسانہ ہے۔ ڈرامہ نہیں جس کا سین آپ اچانک بدلیں گے تو فوراً بدل جائے گا۔ بھرپور تاثر کے بعد فالج کا اٹیک تو اور بھی موثر ہوتا۔ قاری کو آپ سے ہمدردی ہونے لگتی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ چند لمحوں کے لیے وہ عینک اُتار کر اپنی اشک بار آنکھوں کو نرم کپڑے سے صاف کرتا۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتا۔ کچھ دیر افسانے سے نظریں ہٹا کر کرداروں کو تصور میں لاتا۔"

"کیا کروں۔ کرداروں پر رعشہ طاری کرنا مشکل تھا۔ خود پر آسان ــــ واہ۔ واہ ــــ کیا خوب؟ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

کیا مطلب؟

''کیا کہانی اسی طرح فالج زدہ رہے گی۔'' یہ کہنے کے بعد وہ بیزاری ہوگئی اُس کے چہرے پر مایوسی بڑھنے لگی۔

''ہاں کہانی لفظوں سے بنتی ہے۔ لفظ کہانی بناتے ہیں۔ میرے لفظوں میں کج آگیا ہے۔ خم کھائے اور فالج زدہ لفظوں سے کہانی کیسے بنے گی۔'' وہ بڑی مایوسی سے اُٹھی اور لفظوں کو سیڑھی پر رکھے گملے میں کھلے گلِ داؤدی کے پھولوں کے ساتھ لگی خشک ٹہنیوں کے سہاروں سے باندھ کر کھڑا کرنے لگی۔

''پاگل! پھول پودے اور لفظ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پودے اور پھول گری ہوئی شاخوں پر بھی کھلتے اور خوشبو دیتے ہیں۔ جبکہ بے سہارا لفظ کہانی نہیں بُن سکتے۔ لفظوں کو کہانی کے اندر توانا رہنے کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں چُپ ہوگیا۔ اُس کو میری چپ چبھنے لگی۔

''چپ کیوں ہو'' بولتے کیوں نہیں۔ آخر اُس نے ٹی وی آف کرتے ہوئے پوچھا۔

''محسوس ہوتا ہے کہ فالج زدہ لفظوں کے ساتھ میں خود بھی مفلوج ہوگیا ہوں''۔ بیوی اُٹھی اور اُس نے اپنا تمازت بھرا ہاتھ میرے یخ بستہ ہاتھ پر رکھ دیا۔ اُس کے ہاتھ کی تمازت میرے وجود کو سہلاتی رہی۔۔۔۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ میں اپنی کھلی آنکھوں اور بے جان جسم کے ساتھ ٹی وی پر نظریں جمائے لیٹا تھا۔ جسے میری بیوی نے دوبارہ میرے دھیان کیلئے آن کر دیا تھا۔

ایک چیلاہٹ سی اُس کے سارے وجود پر پھیل گئی۔ میں سوچ میں گم ہوگیا۔ مجھے کہانی میں نقص کا بھرپور احساس ہونے لگا۔۔۔ میری کہانی میں لفظ اپنی توانائی کھو چکے تھے۔ یا پھر میرے اور اُس کے وجود کے درمیان ملاپ کا ناطہ ختم ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

حفیظ گیلانی
سرائیکی سے ترجمہ: نین الٰہی میمن

ابرہہ

نہ برکھا نہ بادل پھر اس جھلسا دینے والی دوپہر میں سانولی رات جیسا اندھیرا؟۔ اس نے جلدی سے لاحول پڑھ کر آسمان کی طرف دیکھا، سورج کو گہن لگا ہوا تھا۔ جون کا سورج واقعی سزا کا مستحق تھا، اس کے اجلے جسم پر سیاہی کا لیپ آہستہ آہستہ آندھی میں تبدیل ہونے لگا۔ یہ بہت ڈراؤنا منظر تھا، آس پاس کے درخت ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرنے لگے تو وہ اپنا منہ سر لپیٹ کر تنہائی کے گہرے غار میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

ہر طرف گہری خاموشی کا قبرستان وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے کانوں نے آنکھوں کے پیچھے چھپ کر دور دور تک سماعت کی چادر بچھا رکھی تھی مگر سناٹے کی ڈائن کسی مچھر کی جھنجھناہٹ جتنی کنکری بھی مٹھی سے گرنے نہیں دیتی تھی۔ آخر کار قبرستان میں دفن مردوں کے کان آواز کی کھوج میں آنکھوں کی کھڑکیوں میں جا بیٹھے، جون کا یہ دن لمبا تھا۔ جب اس نے خاموشی کے گہرے کنوئیں میں آواز کا پہلا کنکر پھینکا تو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھونچال آ گیا ہو۔

”یعنی کالی رات کا سفر اب شروع ہونے جا رہا ہے۔“

جب ہر طرف کے واویلے نے دل دہلایا تو اماوس کی رات کے درندے کے منہ سے حبس کا موسم ٹپک پڑا۔ اس کے لیے یہ منظر پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ غار کے اندھیرے میں سفید پاکیزہ چادریں اوڑھے نئی نویلی دعائیں زبان کی چوکھٹ پر ایڑیاں رگڑنے لگتیں تو اس کا جسم لرز جاتا تھا۔ بدن پسینے سے شرابور اور سانس جلتی لکڑی کی آتش کو بڑھا کر فرعونی احکام کے پیروں میں بیٹھ جاتی تھی۔

اس نے جس آس کا دامن تھام رکھا تھا۔ جب اس میں ہریالی اتری تو حبس کی رات کھمبیوں کی طرح جگنو جننے لگی۔ بخیل اندھیرا آنچل میں جگنو چھپانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس چھین چھپائی میں جگنو چوکھٹ پر پاؤں دھرتا تو لفظ ہوا بن کر مفہوم کا چولا پہن لیتے۔ آخر کار اندھیرے کو گھونٹ گھونٹ پینے کی رت بیت گئی تو اس زبان پر جمی ساری دعاؤں نے لفظوں کے مفہوم سے سورج کا پیکر تراشا، جس کی روشنی سے قبرستان میں نئی زندگی جنم لینے لگی۔ آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ اور ساون کی قوس قزح نے ساتوں رنگ بکھیر دیے۔

موسم بہار کی دوسری پھوار کے ساتھ صدیوں کی گندگی سے بدبو کے ایسے بھبکے اُٹھے جنھوں نے لوگوں کے دماغوں سے پہچان کے موتی نوچ کر بکھیر دیے۔

”کون ہو تم۔“

”میں ۔۔۔۔؟ میں تو اس کا مطمحِ نظر، ایک مسافر ہوں۔“

وہ خود تو زمین کے اندر جذب گیا۔ لیکن اس کا مطمحِ نظر زمین کے ساتھ ختم تو نہیں ہو گیا تھا؟

دستاویزات لکھنے والے طغرا نویس نے ایک دم گھبرا کر مسافر کی طرف دیکھا ”پہچان کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے۔“

تنگ گلیوں کی تاریکی میں مسافر اپنی پہچان کی تلاش میں آگے بڑھا تو پگڈنڈی پر کیچڑ کی تازہ تازہ لپائی کی ہوئی تھی۔ اس نے جب کیچڑ میں پاؤں دھرا تو آسمان پر چکر لگاتی چیل اتنے خوفناک انداز سے چلائی کہ اسے جھرجھری آ گئی۔ وہ خوف کی انگلی تھام کر آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ ایک پرانی جھونپڑی میں کچھ بھکاری دن کے اجالے میں چراغ جلائے بیٹھے تھے۔ اس نے لرزتی آواز میں ایک سوال پوچھنے کی کوشش کی تو اسے یوں محسوس ہوا گویا ایک دم ہی اس کے حلق میں درختوں کا کوئی جنگل وجود میں آ گیا ہو۔ پھر اس نے دوسری جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا تو سارے درویش توبہ توبہ کرتے ہوئے سجدے میں گر پڑے اور جھونپڑی کا دیا سرگوشیاں کرنے لگا۔

”خوف تو تم لوگوں کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔“

الزام، تہمت اور بہتان کے جھکڑ میں تمام لوگ مسافر پر ٹوٹ پڑے۔ اس کا اسباب سفر لوٹ لیا گیا لیکن ہوا کی چیخ وقت کی (جگنی) میں بددعا بن کر اٹک گئی تھی۔ خستہ حال جگنی سے آہستہ آہستہ شیطان کے سینگ ظاہر ہونے لگے تو سرمئی داڑھی والے کو نئے سرے سے پہچان کا دیا جلانا پڑا۔ اس لیے کہ تیسری رت کی بارش بہت زہریلی تھی۔ اتنی زہریلی کہ جس سے مسجد کی دیواریں نیلی جھلک دینے لگیں محراب، منبر اور مصلیٰ میں گویا زہر سرایت کر گیا تھا۔

اچانک لمبی لمبی سونڈوں والے ہاتھی لشکر در لشکر خانہ کعبہ کے آس پاس اودھم مچانے لگے۔ ہیہات! ہیہات! گھونسلے تباہ و برباد ہو گئے اور فاختائیں پریشان حال۔ سرمئی داڑھی والا خوفزدہ ہو کر گلیوں میں دوڑنے لگا۔ نہ آدم نہ آدم زاد، اچانک ایک چٹان سے ابابیل اڑنے لگے۔ اس نے بے ترتیب سانسوں سے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور مزید حالات معلوم کرنے کے لیے ٹیلی ویژن کا بٹن دبایا۔ بازاروں میں لوگوں کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔ ہر طرف رش، افراتفری نہ برکھا نہ بادل، اچانک آسمان سے خوفناک گرجدار آواز ابھری بغیر گرج چمک اور بوندا باندی کے نیلا آسمان کڑکنے لگا تو نصف صدی کا دودھ پی کر پلنے والے اثرم دیو نے آخری چیخ ماری۔ خوفناک اور ڈراؤنی چیخ۔ اس کے لاشعور نے خوفزدہ ہو کر جلدی سے چینل بدل دیا۔ ایک معصوم بچی ہر غم سے بے نیاز الم ترا کیف فعل ربک باصحاب الفیل کی تلاوت کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں تھی۔

انور ابڑو

سندھی سے ترجمہ: ننگر چنا

ضمیر فروخت کے لیے حاضر ہے!

"خدارا! مجھ سے میرا یہ ضمیر لے لو نہیں تو میں مر جاؤں گا، میرے بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ ہسپتال میں داخل میرا باپ ایسا بھائی بچ نہیں پائے گا۔ ہم جی نہیں پائیں گے۔ مجھے یہ میرا ضمیر جینے نہیں دے رہا۔۔۔ یہ ضمیر میرے دل پر پہاڑ بن کر گرا ہے۔ لے لو، مجھ سے میرا یہ ضمیر۔ میں بے ضمیر بن کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔۔ یہ مجھے نہیں چاہیے۔۔۔ ایمان داری کا پتلا" روشن رات کے وقت چند گھڑیوں کے لیے اپنے بچوں سے ملنے اور رقم کا بندوست کرنے کے لیے ہسپتال سے نکلا اور گھر جاتے ہوئے راستے میں، دل ہی دل میں، چیخ چیخ کر دنیا والوں سے کہہ رہا تھا۔

"یہ میرا ضمیر، مجھے ہر وہ کام نہیں کرنے دیتا جو آج کے دور میں نہ کرنے سے آدمی زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر زندہ رہا بھی تو عزت کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔" اس نے پھر دل ہی دل میں چیخ کر اپنے آپ سے کہا۔

روشن کئی برسوں سے اسی طرح پریشان ہے۔ وہ جب بھی ملکی حالات پر نظر دوڑاتا ہے تو زندگی اسے کتے کے منہ میں پڑی دکھائی دیتی ہے۔ اسے ہر آنکھ بادلوں سے بھری نظر آتی ہے، ہر ہسپتال، تھانے اور عدالت میں انسانیت گھسٹتی اور تڑپتی دکھائی دیتی ہے۔ ہر جگہ تباہی اور ویرانی نظر آتی ہے، گولیاں پاگل ہوئی نظر آتی ہیں، غریبوں کی عزت لیر و لیر نظر آتی ہے۔ ہر شخص اجنبی اجنبی نظر آتا ہے۔ ہر بستی سے آہ و بکا کا دھواں اٹھتے نظر آتا ہے۔ ہر ہاتھ نے اپنا دل تھاما ہوا ہے۔ ہر مسافر، وہ بس میں ہو یا ریل گاڑی میں، ذلیل ہوتے دکھائی دیتا ہے۔ لاوارث لاشوں کی تعداد بڑھتی نظر آتی ہے، قبرستان بھرتے اور گھر خالی ہوتے نظر آتے ہیں۔ خودکشیاں لوگوں کو بہلاتی نظر آتی ہیں۔ ہر جگہ "جس کی لاٹھی، اس کی بھینس" کا اصول دکھائی دیتا ہے اور اسے کوئی ایسی چھاؤں نظر نہیں آتی جہاں وہ چند گھڑیاں بیٹھ جائے اور اپنی جنموں جنموں کی تھکن اتار سکے۔ اکثر و بیشتر ان تمام معاملات پر سوچتے اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے، سر تپنے لگتا ہے اور غصہ کے مارے اس کا بدن کانپنے لگتا ہے۔ لیکن یہ بیرونی مظاہر ابھی تک اس کی برداشت سے باہر نہیں ہوئے، کیوں کہ یہ اس کی روح کو زخمی تو کرتے ہیں لیکن اس کی ذاتی زندگی کو اتنا متاثر نہیں کرتے۔

لیکن ضمیر اب اس لیے بھی اس پر بوجھ بن چکا ہے کہ وہ اس کی گردن اور پیٹ پر پاؤں دے کر

کھڑا ہوگیا ہے اور اسے کہتا ہے کہ: 'تمھارے ساتھ میں چل سکوں گا یا پھر تمھارے خاندان والوں کا پیٹ اور ان کی صحت چل سکے گی۔'

اسے محسوس ہوتا ہے کہ روشن یعنی وہ خود اس دور کا باشندہ ہی نہیں ہے، بلکہ پانچ آٹھ صدیاں پہلے کا انسان ہے، جو اب پیدا ہوگیا ہے یا پھر پانچ آٹھ صدیاں بعد کا آدمی ہے، جب اس کائنات میں ہر کام زبان سے ایک لفظ کے ادا کرنے یا انگلی کے اشارے (Touch) سے ہو جائے گا اور ایسی مخلوق پیدا ہوگی جو کرپٹ نہیں ہوگی، جہاں ذاتی ملکیت نہیں ہوگی، جہاں مشترکہ نظام اور اجتماعی دسترخوان ہوگا۔

وہ جہاں کہیں بھی ملازمت کرتا ہے، وہاں اعلیٰ افسران سے جھگڑا مول لیتا ہے۔ اس سے ہر وہ بات برداشت نہیں ہو پاتی، جو غلط ہوتی ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ کرپشن کرتے ہیں، اداروں کے وسائل کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اپنے ماتحت عملہ میں شامل مرد و خواتین کو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں، تب یہ سب اس سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ اور پھر وہ ان سب کے خلاف بہ بانگ دہل بولنے لگتا ہے۔

اب صرف 'دیواروں کے کان نہیں ہیں'، بلکہ اب تو ہر آدمی کے کئی کان ہیں۔ دفاتر میں رکھی ہر چیز کے کئی کان ہیں، کمپیوٹروں کے کان ہیں، ٹیلی فون کے کان ہیں اور جو بھی اس سے ملتا ہے، اس کے کان افسرانِ اعلیٰ سے بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کی ہر 'گفتگو' "اوپر" پہنچ جاتی ہے اور اس کے بعد اسے کبھی شوکاز نوٹس ملتے ہیں، کبھی تنخواہ منہا ہو جاتی ہے، کبھی ڈانٹ پلائی جاتی ہے تو کبھی اسے معطل کر دیا جاتا ہے۔

وہ ایسے حالات میں رہتے ہوئے بھی اپنی اس بری عادت سے باز نہیں آتا اور وہ ہر وقت بقول دوسروں کے 'بکواس' کرتا رہتا ہے کہ "فلاں افسر اتنے پیسے کھا گیا، اس نے ادارے کا صفایا کر دیا، اُس نے ملازموں کے ساتھ ناانصافی کی ہے، وہ افسر ادارے کے وسائل کا ناجائز استعمال کر رہا ہے۔۔۔" لیکن اس کی یہ 'بکواس' تو اس سے اس کا ضمیر کرواتا ہے۔ اس کے اندر والا کرواتا ہے۔ اس کے نام نہاد اصول کرواتے ہیں۔ وہ خود تو کچھ نہیں کرتا، اس کے ہاتھ خاموش ہیں، اس کے پیر خاموش ہیں۔

وہ منہ پھٹ ہونے کے باعث ادارے میں کوئی ترقی نہیں کر سکا ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہوتا ہے کہ اُس کی ملازمت کب ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ یا اس کے بعد جو اُسی گریڈ میں بھرتی ہوئے تھے، وہ سب بالا گریڈوں میں ترقی پا گئے، گاڑیاں خرید لیں، گھر لے لیے، دیگر سہولتیں حاصل کر لیں، انھیں سب کچھ ملا، لیکن اس کی حالت آج بھی وہی ہے کہ اکثر مہینہ کے اواخر میں دوستوں سے ادھار لینا پڑتا ہے۔ اس کے گھر میں اکثر جھگڑا رہتا ہے، اکثر اس کی بیوی اس سے ناراض رہتی ہے اور اکثر اس کے چھوٹے بچوں کی ضروری اشیا پوری نہیں ہوتیں۔

اِدھر وہ اپنی ملازمت والی جگہ پر جیسے کوئی چوہڑا چمار ہو، اکثر افسران اس پر غصہ رہتے ہیں۔ کچھ تو اس سے بات تک نہیں کرتے اور کچھ اسے پاگل کہتے ہیں۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس نے بڑی کوشش کی ہے کہ وہ اپنا رویہ تبدیل کرے، ہر ایک کے کام کی تعریف کرے، کوئی بھی آدمی جتنی بھی رشوت لے، اسے ایمان دار کہے۔ کوئی بھی اگر ادارے میں خورد برد کرے تو اس کے ایسے کام کو قومی خدمت قرار دے۔ جو کوئی بھی ناجائز طریقے اختیار کر کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے، اس کے اس عمل کو اس کی صلاحیت اور قابلیت تسلیم کرے اور جو کوئی بھی اپنی نوکری اور عہدہ بچانے کے لیے بالا حکام کو اپنے محکمہ کے بجٹ سے حصہ ادا کرے، اسے آج کے دور کی کامیاب حکمت عملی قرار دے۔۔۔ لیکن اس کا ضمیر یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ہر ایسی بات سن کر، ہر ایسا واقعہ دیکھ کر غصہ میں لال پیلا ہو جاتا ہے۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے اور اس کا دل کرتا ہے کہ ''بندوق اٹھا کر سیدھا ایسے لوگوں کے دفتر میں گھس جاؤں اور۔۔۔''

وہ جب اپنے اردگرد دیکھتا ہے تو اسے ایک جیسا ماحول نظر آتا ہے۔۔۔ ہر ایک غلط اور غیر قانونی کام کرنے میں مصروف نظر آتا ہے، ہر ایک ایسا کام کرتے ہوئے خوش ہے، ہر ایک اس کوشش میں مصروف ہے کہ غلط طریقہ سے زیادہ سے زیادہ پیسہ بنا لے، زیادہ سے زیادہ زمین خریدے، زیادہ سے زیادہ پلاٹ لے لے، زیادہ سے زیادہ گھر بنوا لے اور زیادہ سے زیادہ رقم کاروبار میں لگائے۔۔۔ اور وہ یہ سب کچھ دیکھ کر اپنے آپ کو اجنبی مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔

جب دو سال قبل اس کے والد نے دوائی نہ ہونے کے سبب وفات پائی، تب اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اب اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ دے گا، اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تبھی اس کے باقی گھر والے زندہ رہ پائیں گے۔ لیکن جب اس نے ایک افسر کو ایک غریب سے رشوت لیتے دیکھا، تب وہ پھر سے اکھڑ گیا تھا۔ اور پھر وہی بات۔۔۔ سب کو ایک صف میں کھڑا کر کے جوزف سٹالن کی طرح صرف ایک ہی کارتوس ضائع کیا جائے۔۔۔ انارکسٹ بن جانے والی بات۔۔۔ پھر بالا افسران کے خلاف وہی گفتگو۔۔۔ پھر غصہ کا وہی اظہار، پھر ان کی کرپشن اور غلط کاموں کے قصے بیان کرنا۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صرف وہی کیوں شریف ہے؟ صرف وہی کیوں کسی کے دروازے پر تڑپتا ہے؟ دوسروں کے آنسو دیکھ کر صرف اس کی آنکھیں ہی کیوں بھر آتی ہیں اور صرف وہ ہی کیوں سماج کو بدلنے کے لیے سوچتا ہے؟ وہ بھی اوروں کی طرح کیوں نہیں ہو جاتا؟ وہ بھی کیوں ترقی نہیں کرتا؟ گھر میں گاڑیاں رکھتا، دفتر میں عیاشی کرتا، دیس پردیس کے سفر کرتا، دوست احباب کی دعوتیں کرتا، بیمار ہونے پر باہر

سے علاج کرواتا اور اپنے بچوں کو سکھی رکھتا۔ لیکن اس کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی اس کا یہ ضمیر خریدنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی اس طرح کے سماج میں ایسے ضمیر کے ساتھ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کے لیے ایک ہی راستہ بچا ہے کہ وہ خود کشی کرے یا پھر اپنے ضمیر کا گلا گھونٹ کر اسے مار دے لیکن اس کا ضمیر بچپن سے ہی اتنا طاقت ور ہوتا چلا آیا ہے کہ وہ اب اس کے ہلاک کرنے سے ہلاک نہیں ہو سکتا

لیکن آج جب اس کا انتہائی عزیز بھائی گذشتہ تین دنوں سے برین ہیمرج کے باعث آئی یوسی میں داخل ہے اور اس کے پاس علاج کے لیے زیادہ رقم نہیں بچی، تب وہ راستہ میں بڑبڑاتا جا رہا ہے، کاش! کوئی مجھ سے میرا ضمیر خرید لے --- میں اور میرا ضمیر ایک ساتھ نہیں چل سکتے --- میں اس سے تنگ آ چکا ہوں --- یہ میرے پورے خاندان کو تڑپا تڑپا کر مروائے گا۔

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے گھر جا رہا ہے --- وہ سوچ رہا ہے: ''بھیا میری ماں کا بھی لاڈلا ہے، اسے ہر حال میں زندہ رہنا چاہیے --- اگر ایسا نہیں ہوا تو ماں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گی --- اس لیے اگر کوئی پاگل خریدار مجھ سے میرا یہ ضمیر خریدنا چاہے گا تو میں اسے بہت سستے داموں دوں گا۔''

☆☆☆☆

قمر شہباز

سندھی سے ترجمہ: جہانگیر عباسی

کب تک کالی رات

رات اپنے پہلے پہر کے چنگل سے آزاد ہو کر اگلے سفر پر نکل پڑی تھی اور زمین سے آسمان تک پھیلے ہوئے چہار سو تاریک اندھیرے میں ہر ایک چیز پہ قبرستان جیسی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماحول میں ٹھٹھرتی سردی اس حد تک سرگرداں دکھائی دے رہی تھی کہ کسی بلی کے چیخنے یا کتے کے بھونکنے کی آواز تک دب کر رہ گئی تھی۔ سرد رات کے ایسے عالم میں رئیس باقر خان اب تک جاگا ہوا تھا جو رہ رہ کر اپنی بائیں کلائی میں لٹکتی چمکتی راڈو گھڑی کے ٹک ٹک کرتے گردش والے کانٹوں کو جیسے جیسے نہارے جاتا ویسے ویسے خود کو نا امیدی کی دلدل میں دھکیلتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا پھر شاندار بیٹھک کے سجے ہوئے حسین مہمان خانے کی کھڑکی کا پٹ کھول کر جب اس نے باہر جھانکا دور تک پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ اگلے پل سرد ہوا کے جھونکے سپاہیوں کی طرح یلغار کرتے کھڑکی سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر رئیس کے وجود کو بجلی کا جھٹکا سا لگا جن سے خود کو بچاتے وہ یک لخت طاق کا پٹ زور سے بند کر کے واپس صوفے پہ آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

رئیس کو اپنے وفادار اور رازدار نوکر جانو پہ شروع سے اندھا اعتماد تھا جس کے فولادی جسم، عقابی آنکھوں، رعب دار حشمتی چہرے اور کولہے میں لٹکتی دونالی بندوق پہ وہ اس قدر ناز کیا کرتا تھا کہ وہ جانو کے خالی ہاتھ لوٹ آنے کا خیال اپنے ذہن میں بھول کر بھی نہیں لا سکتا تھا۔ جانو جنگل کے شیر کی مانند وہ بہادر شخص تھا جس کی دیدہ دلیری اور بہادری سے علاقے کے چھوٹے بڑے سب ہی زمیندار ڈر کر رہا کرتے۔ جانو کی جواں مردی کی تازہ عبرتناک مثال سب کی آنکھوں کے سامنے سیٹھ کرم داس کا بھیانک انجام تھا جس نے رئیس کے خلاف الیکشن لڑنے کے لیے فارم بھرا تو اس گستاخی کی سزا میں سیٹھ کو سب کے سامنے ننگا کر کے پیپل درخت کے ساتھ باندھ کر پانی چھوڑتے ہی چیونٹیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے پہلے رئیس کے داولے کارندے کرمو کو مولوی خدا بخش نے بیٹی کا رشتہ دینے سے صاف انکار کیا تو اسی جانو نے رئیس کے حکم پر مولوی کی بیٹی کو دن دھاڑے گھر سے اٹھا کر کرمو سے نکاح کروا دیا تھا۔ کالج طالب علم نے رئیس کی زیادتیوں کے خلاف گاؤں والوں میں ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی تب بھی اسی جانو کے بل بوتے پر رئیس نے اس یورش کو دبانے کے لیے طالب علم کے گھر کو جلا کر بھسم کر ڈالا تھا پر آج یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ جانو نے رئیس کا حکم بجا لانے

میں تاخیر کر رکھی تھی جس وجہ سے رئیس تذبذب کے جال میں کسی پھنسے ہوئے پرندے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

آج کی رات رئیس کے لیے زندگی کی سب سے کڑی آزمائش اپنے ساتھ لے آئی تھی اور رئیس کو اسی امتحان میں فتح یاب ہو کر اپنے نام کی طاقت اور اثر کی دھاک عام وخواص میں مزید بڑھانے کے ساتھ سرخرو ہونا تھا۔ جانو کو گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زائد کا عرصہ بیت چکا تھا اب مزید گزرتے وقت کے ہر لمحے کے ساتھ رئیس کے دل میں پھپھولے گھٹنے بڑھنے لگے وہ بے قراری کے عالم میں نظریں اٹھائے کبھی بیٹھک کے صدر دروازے کی جانب تو کبھی صوفے پہ پڑے ہوئے نشے میں دھت صوبیدار صاحب کو تکے جا رہا تھا جس کے بوٹ کی چمک کمرے میں پھیلی مدھم روشنی میں عجیب سی نظر آ رہی تھی۔ صوبیدار کے ایک ہاتھ میں فاؤلین کی آدھی خالی بوتل تو دوسرے میں جلا ہوا سگریٹ کب کا انگلیوں کے بیچ ایسے پھنسا دکھائی دے رہا تھا جیسے پھولوں پہ پرواز کرتے ہوئے پوپٹ خاردار کانٹوں کے بیچ پھنس جاتا ہے۔ یہ سب دیکھ کر رئیس دل میں جانے کیا سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور نہایت احتیاط کرتے صوبیدار کی لٹکتی ٹانگ کو سیدھی ٹانگ کے برابر سیدھا کیا۔ آدھے جلے سگریٹ کو انگلیوں سے آزاد کرتے پاس پڑی ایش ٹرے میں پھینک کر پھر دبے پاؤں اسٹول کو دھکیلتے دیوار کے ساتھ اس انداز سے جا ملایا کہ صوبیدار کے آرام میں خلل پیدا نہ ہو پائے جس پر ایک خالی بوتل کے ساتھ دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر خود کو قدرے سے مطمئن محسوس کرتے ہوئے اب صوبیدار کے عین قریب ہو کر پہلی بار سنجیدگی سے اس کے وجود کا جائزہ لینے لگا جو پہلے کی طرح حسین وجوان ہرگز بھی نہ رہا تھا اس کا صحت مند پرکشش چھاتی والا جسم بھرے ہوئے غبارے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ گول چہرے، گھنے بالوں والے سر کے بیچ والا حصہ بالوں کے اگنے والی فصل سے محروم دکھائی دے رہا تھا۔ رئیس کی نظریں یکایک سامنے دیوار پہ لگے ہوئے بڑے سے آئینے پہ پڑ جاتی ہے تو وہ صوبیدار سے بے پرواہ بن کر اپنے وجود کا جائزہ لینے لگتا ہے اپنی صاف نکھری رنگت کے باعث خود کو تر وتازہ محسوس کرتے صوبیدار سے موازنہ کر کے زیر لب کہنے لگتا ہے۔ ”صاحب کے بالوں کی سفیدی صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ اب بوڑھا ہو چکا ہے۔“

رئیس کی آنکھوں میں دس سال پہلے والے صاحب کا حلیا ابھر آتا ہے جب وہ چھوٹا صوبیدار بن کر اس کے علاقے میں تعینات ہوا تھا۔ رئیس نے اس کے اعزاز میں ایسی شاندار دعوت کا اہتمام کر ڈالا جس کے اختتام ہونے پر خاص طور پہ شراب وشباب کا الگ سے بندوبست کیا گیا تھا جس کے مزے لوٹ کر جب چھوٹا صوبیدار جانے لگا تب رئیس نے اپنی شان وشوکت کو مزید برقرار رکھتے ہوئے لعل نوٹوں کی گڈی سے مٹھی الگ سے گرم کر کے روانہ کیا تھا۔ یہ سب کرنا رئیس کے روایتی رئیسانی دستور کا لازم حصہ تھا اور اس روایت میں آج

تک علاقے کا کوئی اور چھوٹا بڑا زمیندار رئیس کے ہم پلہ نہ ہو پایا تھا۔ بس پھر کیا تھا کہنے کو تو چھوٹا صوبیدار سرکاری ملازم تھا پر ہر کام میں جی حضوری دکھاتے ایک طرح رئیس کا کمدار بن کر رہ گیا جس کے ہر حکم کے آگے سر جھکائے رہتا۔ ویسے بھی رئیس کوئی معمولی زمیندار نہ تھا بہت بڑا اور خاندانی زمیندار ہونے کے ساتھ دبنگ قسم کا چالاک انسان تھا جس کی رسائی دور دور تک تھی اس وجہ سے بھی چھوٹا صوبیدار رئیس کے اثر میں ڈھل کر ایسے ایسے کام کر گیا جو کسی بھی لحاظ سے نہ قانون کے دائرے میں آتے اور نہ ہی کسی طرح جائز تھے۔ چھوٹے صوبیدار کو ابھی چھ مہینے بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ اس کا تبادلہ ہو گیا وہ جاتے ہوئے بھی رئیس کو خون کے ایک ایسے پیچیدہ مقدمے سے بری کر گیا جس میں رئیس ہرگز بھی پھانسی کے پھندے سے بچ نہ پاتا۔ دس سال گزرنے کے باوجود صوبیدار کی مہربانیوں کی مہریں آج بھی رئیس کے دل پہ نقش تھیں جو ایکبار پھر رئیس کے علاقے کا بڑا صوبیدار بن کر لوٹ آیا تھا اور آج رئیس کے پاس اس انداز سے آنکلا تھا جیسے اپنی تمام تر سابقہ مہربانیوں کا بدلہ لینے آیا ہو۔ رئیس اس بات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو چکا تھا اس لیے اس نے جانو کو سخت لہجے میں یہ حکم دیا تھا۔

”جانو! عملدار آتے جاتے رہتے ہیں مگر اس بہادر کی بات ہی اور ہے۔ جس نے ڈنکے کی چوٹ پہ ہر آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا تھا اور آج ان سب مہربانیوں کا قرض اتارنے کا موقعہ آیا ہے۔ اس لیے کچھ بھی ہو جائے مگر خالی ہاتھ ہرگز نہیں آنا“

”رئیس سائیں! آپ بالکل بھی فکر نہ کریں“ کولہے میں لٹکتی بندوق کو زور سے تھامتے جانو نے بات مکمل کی ”اپنی جان پہ کھیل جاؤں گا مگر سرکار کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔“

دس برسوں کے بعد صوبیدار رئیس کے علاقے کا اعلیٰ عملدار بن کر آنے سے رئیس کے جیسے سوئے ہوئے بھاگ پھر جاگ اٹھے تھے۔ پھر سے عام و خواص کے ساتھ چھوٹے بڑے زمینداروں پہ بھی اثر بڑھنے لگا دعوت پہ دعوتیں ہونے لگی ہر محفل حسین الہڑ جوانیوں کے تھرکتے ناچ گانے کے بعد تاریک اندھیرے میں جام پہ جام بھرتے شباب کے مزے لوٹتے اختتام پذیر ہوتی جس کے عوض رئیس اپنے وہ سب کام نکلوانے لگا جو نہ صرف مشکل تھے پر قانون کی کتابوں میں ناممکن بھی تھے۔ چھوٹا صوبیدار جنگل کے شیر کی طرح مکمل طور پہ خودمختیار ہو کر بھی وہی شیر رئیس کے قدموں میں گیدڑ کی طرح دم ہلاتے آ بیٹھا جس کے دم سے رئیس کے نام کا ڈنکا اور زیادہ بجا تھا۔ مگر آج صوبیدار جس انداز سے چل کر رئیس کے پاس آ پہنچا تھا رئیس کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس کا محسن یقیناً کسی بڑی آفت میں مبتلا ہو کر بے بس بن چکا ہے ادھر ادھر کی باتوں کے دوران ہی رئیس مایوس لہجے سے سمجھ چکا کہ معاملے کی نوعیت سنگین قسم کی ہے ورنہ لوہے جیسے فولادی وجود میں

پہاڑ جیسا مضبوط دل رکھنے والا صوبیدار یوں ٹڈی دل ہرگز بھی نہ بنتا۔ رئیس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ صوبیدار کے احسانوں کا بدلہ چکانے کا یہی مناسب وقت ہے اسی ارادے سے وہ صوبیدار سے کہنے لگا۔ ”صاحب! آپ کے حکم کی دیر ہے پھر دیکھیے یہ خادم کس طرح سے خدمت گزاری سرانجام دیتا ہے۔“ صوبیدار پل بھر کے لیے رئیس کی بات سن کر مطمئن سا ہوگیا پھر اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں دے کر سر جھکاتے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور نظر اٹھا کر جب دیکھا تو رئیس اپنے ہاتھوں کو جوڑے اب تک اس انداز سے کھڑا تھا جیسے اس کے لوگ خود اس کے سامنے ہاتھ جوڑے رہتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں یہ خیال بھی کرتا رہا کہ آخر ایسا کیا معاملہ ہوا ہے کہ صوبیدار کچھ کہہ نہیں پاتا۔ ایک پیگ بنا کر صوبیدار کے سامنے رکھ دیا۔ دو گھونٹ بھرتے ہوئے صوبیدار نے جیسے حلق صاف کرتے اپنے من کی بات بتادی تو حیرت سے رئیس ششدر ہو کر رہ گیا۔

صوبیدار جس لڑکی پہ فدا ہو کر اسے پانے کے لیے ہارے ہوئے سپاہی کی طرح رئیس کے دروازے پہ آ جھکا اس کا نام زیبو تھا جو غریب کسان خاکو کی بیٹی تھی جس کو پھنسانے کے لیے صوبیدار نے زیبو کے باپ کو قتل کے جھوٹے مقدمے میں سلاخوں کے پیچھے ڈال کر ساتھ رشتہ داروں اور باقی گاؤں والوں کی بھی حاضریوں پہ حاضریاں رکھ کر دن رات انھیں اس طرح سے ستایا کہ ان پہ زمین تنگ ہو کر رہ گئی پھر بھی وہ زیبو کو حاصل نہ کر پایا جس کے حسین وجود کے سحر میں وہ ہر وقت قید تھا۔ زیبو کے پرانے تنگ کپڑوں سے نکلتی جوانی کے جلوؤں کی تاب میں تڑپا رہتا تھا اور زیبو یہ سب جانتے ہوئے بھی اپنی لاج کا سودا کرنے کو تیار نہ تھی۔ صوبیدار کی سخت عقوبتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ عورت چاہے تو پہاڑ بن کر طوفانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ زیبو کی دیدہ دلیری کے آگے صوبیدار کے سارے ہتھکنڈے بے اثر رہ گئے۔ با اختیار قانون دان ہو کر بھی وہ عام سی عورت سے ایسے ہار محسوس کرنے لگا تھا جیسے پورا قانونی محکمہ ہارنے لگا ہو پھر اس سے تھک ہار کر اپنی عزت کا بھرم رکھتے زیبو کے باپ کو نہ صرف رہا کیا ساتھ نوٹوں سے بھرا لفافہ تھماتے اس امید سے روانہ کیا کہ شاید غریبی سے شکست کھا کر زیبو پاس چلی آئے پھر ایسا ہی ہوا زیبو آئی اور نوٹ صوبیدار کے منہ پہ مارتے ہوئے ایسے لوٹ گئی کہ وہ اپنے سارے چھوٹے عملے کے آگے منہ کے بل کھا کر اپنی ہی نظروں میں گر پڑا تھا۔ جب انگلی ٹیڑھی کر کے بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوا تب وہ مایوس ہو کر رئیس کے پاس آ پہنچا تھا اور رئیس اب تک حیرانی میں جکڑا ہوا تھا کہ معمولی سی لڑکی کے لیے صوبیدار اس حال میں پہنچا ہے۔ ساتھ یہ بھی تعجب کھائے جا رہا تھا کہ آج کے دور میں بھی ایسی غیرت مند لڑکیاں موجود ہیں جو مارئی کی طرح اپنی آپ پہ ہر ظلم و سختی سہہ کر عزت پہ آنچ نہیں آنے دیتی ہیں اور وہ بھی اسی کی وڈیرا شاہی میں اس کی رعایا ہو کر یہ بہت بڑی جرأت کی تھی۔ زیبو کے عشق میں صوبیدار اپنے فرائض سے بھی اس حد تک غافل بن کر رہ گیا تھا جس وجہ

سے چوروں، ڈاکوؤں نے لوٹ مار کس بازار گرم کر ڈالا تھا۔ رئیس کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ صوبیدار اس سے مدد مانگ کر جیسے اپنی ہر مہربانی کا صلہ مانگنے آیا ہو۔

”رئیس! کچھ کرو ورنہ اس دو ٹکے کی لڑکی کے دیے ہوئے طعنے مجھے جیتے جی مار ڈالیں گے“

صوبیدار کی التجا پر رئیس خیالوں کی دنیا سے نکل آتا ہے۔

”صاحب! آپ اتنی سی بات کے لیے دلگیر ہوئے جا رہے تھے۔ اس لونڈی کو آج رات میں آپ کے قدموں میں پہنچا دیتا ہوں۔ اب آپ بے فکر ہو کر آرام سے بیٹھے رہیں“

زیبو وہی لڑکی تھی جو خاکو خشخیلی کی اکلوتی بیٹی تھی اور جو کچھ سال پہلے حویلی میں جھاڑو پوچے کے کام پر مامور ہوا کرتی تھی۔ زیبو کا باپ نسل در نسل سے رئیس کا غلام تھا اور بیٹی کے ساتھ خود بھی حویلی کی گائے بھینسوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا جس کی اپنی نہ کوئی سوچ تھی اور نہ زندگی۔ رئیس کو اس بات پہ بھی بہت غصہ آ رہا تھا کہ کس طرح سے زیبو اس کی نظر کرم سے بچ پائی ورنہ دوسری خادماؤں کی طرح کب کا زیبو کی الھڑ جوانی کا رس پی چکا ہوتا شاید اس وجہ سے کہ وہ رئیس کی لاڈلی بہن سکینہ کی خاص خادمہ تھی۔ سکینہ جو ذہنی طور پر بیمار تھی جسے آئے دن ہسٹریا کے دورے پڑتے رہتے اور اس شدید الجھن والی تکلیف کے دوران زیبو ہی واحد نوکرانی تھی جو بے خوف سکینہ کی دیکھ بھال کیا کرتی۔ اس لحاظ سے رئیسانی نے اسے سکینہ کی خاص خادمہ بنا ڈالا تھا دوسرا یہ کہ وہ دونوں ہم عمر بھی تھیں۔ زیبو سوجھ بوجھ رکھنے والی، ہر کام میں تیز تراری دکھانے والی ایک صاف ستھری خادمہ تھی جسے سکینہ بے حد پسند کیا کرتی اور اپنا دکھ سکھ سناتی۔ اپنے شرعی حق کی محرومی پہ رویا کرتی تو زیبو ہی اسے دلاسے دے کر صبر کی چھاؤں میں لے آیا کرتی۔ قدرت نے زیبو کو بھی سکینہ کی طرح بے حد حسین بنایا تھا جب مالکن کے اترے کپڑے پہن کر وہ سب کے سامنے آ جاتی تو ہر آنکھ حسرت زدہ رہ جایا کرتی کسی کو گمان نہ ہوتا کہ زیبو ایک خادمہ ہے وہ سکینہ کی جیسے جڑواں بہن لگا کرتی مگر مالک، مالک ہوتا ہے۔ مالک اور نوکر کتنا بھی آپس میں مل جائیں سماج نے جو فاصلہ بنا رکھا ہے وہ زمین سے آسمان تک کا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ رئیس کے ذہن پر جب زیبو کے خیالات کی چلتی ہوئی فلم پوری ہو چکی تب وہ زیر لب بڑبڑانے لگا تھا۔ ”کاش پتہ ہوتا کہ یہ چھوری بجلی بن کر جوانوں کے دلوں پہ گرے گی تو اسے ہرگز بھی حویلی کی دیواروں سے باہر کی دنیا دیکھنے نہ دیتا۔“

زیبو کی جگہ پھر رئیس کی نظروں کے سامنے سکینہ کا غم زدہ چہرہ شکوہ کرتے ابھرنے لگتا ہے تو رئیس پل بھر کے لیے سہم کر رہ جاتا ہے۔ ہاتھ میں تھامے گلاس سے آخری گھونٹ بھر کر گلاس ایک طرف پھینک دیتا ہے۔ سکینہ کا دکھ اس کے دل میں درد کا تیر بن کر چبھنے لگتا ہے جس کا رشتہ چچا زاد بیٹے کے ساتھ محض اس وجہ سے

توڑ ڈالا تھا کہ چچا نے مخالفوں سے مل کر اسے سخت مشکلوں میں ڈالنے کے ساتھ خون کے جھوٹے مقدمے میں بھی پھسانے کے لیے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ ان آڑے دنوں میں اسی صوبیدار نے ایسے بچا ڈالا تھا جیسے دودھ سے مکھی نکال کر آسانی سے پھینک دی جاتی ہے۔ بے چاری سکینہ اپنی باقی عمر کا روگ لیے چچا زاد بیٹے کے لیے روتی رہ گئی جو ہوش سنبھالنے کی عمر سے اس کو اپنا مجازی خدا مانتے ہوئے سپنے دیکھتے جوان ہوئی تھی۔ پھر یہی محرومی جب شدت پذیر ہوئی تو سکینہ کو ہسٹریا کے دورے پڑنا شروع ہو گئے سکینہ جان چکی تھی کہ باقی کی زندگی حویلی کی ان اونچی دیواروں کے اندر گھٹ گھٹ کے گزارنی ہے تب یہ زیبو ہی تھی جس کے ساتھ نے سکینہ کے وجود کو محرومی کے تاریک کنوے سے نکال کر زندگی کی روشن راہ پہ لے آیا اور اپنے خاندان کی اس محسنہ کو رئیس اب صوبیدار کے من میں بیٹھے ہوئے وحشی درندے کے آگے ہڈی کی مانند پھینک کر خود کو اس کے کیے ہوئے تمام تر احسانوں کے بوجھ سے بری کرنا چاہتا تھا۔ رئیس بخوبی جانتا تھا کہ وہ زیبو کے معصوم وجود کو تار تار کر کے ایسے نچوڑے گا جیسے گدھ سڑی ہوئی لاش کو نوچتے رہتے ہیں وہ یہ پھر بھی سب کرنے کے لیے تیار تھا اور جاتے ہوئے جانو کو سخت لہجے سے تاکید کی تھی وہ زیبو کو لائے بنا اسے اپنی شکل ہرگز بھی نہ دکھائے مگر اب تک جانو کی تاخیر رئیس کے وجود پہ بھاری پڑنا شروع ہو چکی تھی اور وہ تذبذب کا شکار ہو چلا تھا۔ ''میرے ہی کسان کی اک معمولی سے لڑکی کو اٹھا لانے میں اتنی دیر۔۔۔؟؟ صوبیدار صاحب کو ہوش آ گیا تو میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ میں یہ ذلت ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتا۔'' ایک بار پھر رئیس کھڑکی کا پٹ کھول کر جیسے باہر تاریک اندھیرے میں تاکنے لگا۔ دور سے ٹمٹماتی روشنی قریب ہوتے شور وغل مچلنے لگا جسے آتا دیکھ کر رئیس کا وجود احساس برتری سے اونچا ہونے لگا تھا پھر اسی پھرتی کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر بیٹھک کے صحن میں آ کھڑا ہو گیا تو جانو جیپ سے اتر کر رئیس کے سامنے آ جاتا ہے پر اسے خالی ہاتھ دیکھ کر رئیس کی آنکھوں میں چمکتی روشنی مدھم ہونا شروع ہو گئی وہ چلا کر کہنے لگا: ''جانو کیا ہوا۔۔۔؟؟ خالی ہاتھ کیوں آئے ہو؟''

''سرکار ہمیشہ کی طرح آج بھی فتح آپ کا مقدر ہے۔'' یہ سنتے ہی خوشی سے دیوانہ ہو کر دونوں بازوں پھیلائے رئیس آگے بڑھ کر جانو کو گلے لگا کر کہتا ہے۔ ''جانو تو سچ میں مرد کا بچہ ہے۔ شیر ہے شیر۔''

جیپ کی پچھلی نشتوں کے بیچ پڑی ہوئی زیبو کو باقی کارندے جیپ سے گھسیٹ کر نیچے اتارنے لگے تھے جس کی آنکھوں کے ساتھ ہاتھ بھی کپڑے سے باندھے ہوئے تھے مگر وجود میں سمندر کی طلاتم خیز موجوں کی ہلچل کے ساتھ وہ خود کو رسیوں سے آزاد کرنے کی لرزش میں زمین پہ ایسے تڑپنے لگی تھی جیسی بن پانی کے مچھلی تڑپتی نظر آیا کرتی ہے۔ زیبو کی بے بسی کو دیکھ کر رئیس اپنے وجود کی کھوئی ہوئی طاقت کو پانے لگا تھا۔

''جانو! تم نے آج پھر سے میری عزت رکھ لی ہے'' یہ کہتے ہوئے رئیس پھر اپنے کارندوں سے

مخاطب ہوتا ہے۔ ''حرام زادوں کھڑے تماشہ کیا دیکھ رہے ہو لڑکی کو اٹھا کر سب سے آخری کمرے میں لے جاؤ تب تک صوبیدار صاحب کو جگانے کے لیے میں خود جاتا ہوں وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ رئیس بھی کوئی کم چیز نہیں ہے۔''

جانو نے آخری نظر زیبو کے تڑپتے مچلتے وجود پہ ڈال کر پھر موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پر اعتماد قدموں سے حویلی کے مشرق جانب جانے چلنے لگا جس کی حیثیت خریدے ہوئے ایسے بدمعاش ڈکیت سے ہرگز زیادہ نہ تھی جو اپنی دہشت سے اوروں کو ڈراتا رہتا اور جسے رئیس جس طرح جب چاہتا اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرتا رہتا۔ جھکے ہوئے وجود کو لیے دھیرے سے چلتا ہوا حویلی کی اب پچھلی جانب کو مڑ جاتا ہے جہاں گھنے درختوں کے بیچ حویلی سے بہنے والے گندے پانی کا نالہ تھا اور کوئی بھول کر بھی ایسی گندگی والی جگہ پہ نہ جایا کرتا مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ جیسے درختوں کے بیچ آ پہنچا، پتوں میں لرزش تیز تر ہونے لگی۔ شک و یقین کے دوراہے پہ کھڑے ہوئے جانو نے خود کو خبردار کرتے ابھی ہاتھ کولہے میں لٹکتی بندوق کی جانب بڑھایا تھا کہ ایک نرم و گداز ہاتھ اس کے کولہے سے چقماق بن کر چپک گیا۔ ''میں پوچھتا ہوں کون ہے؟'' اس سے آگے کہ وہ مزید بول پاتا اسی نرم ہاتھ کی انگلیاں اس کے ہونٹوں بیچ اٹک کر رہ گئیں تب وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

''تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی کہ میں تو نراس ہو کر لوٹنے والی تھی؟!!'' اب سامنے والے وجود کا سایہ جانو کے وجود سے لپٹ کر ایک ہو گیا جسے اپنی بانہوں میں قابو سے کستے ہوئے جانو وضاحت کرنے لگا۔

''ہاں جان! آج تو رئیس کی عزت و غیرت کا سوال تھا اس لیے۔۔۔۔''

''کیا میری چاہت اور تڑپ سے بھی زیادہ اہم تھا؟!!۔۔'' شکوہ کرتے سائے نے خود کو جانو سے الگ کر دیا تو جانو نے اسی محبت سے پھر اپنی بانہوں میں بھرتے التجا کی۔ سکینہ! میری جان ہرگز بھی نہیں۔ آج سے وعدہ ہے پھر کبھی ایسا نہ ہو گا' اگلے پل میں دو تڑپتے ہوئے وجود ایک دوسرے کو چومتے ہوئے مست بن جاتے ہیں اور پھر جوانی کی دہکتی ہوئی آگ میں ایک ساتھ جلنے لگتے ہیں۔ رئیس نے رات کی تاریکی میں اپنی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے زیبو کی جس عزت کو بلی پہ چڑھایا تھا اسی کا ہرجانہ وہ اب سکینہ کی صورت میں بھگت رہا تھا۔ اور شاید قدرت کا بھی یہی انصاف تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆

کشمیری سے ترجمہ: غلام حسین بٹ

سپردخدا

یہ 1996 کا سال تھا جب ابا جان صورہ ہسپتال میں داخل تھے۔ میں ابا جی کے ہمراہ تقریباً ایک ہفتہ ہسپتال میں رہا۔ ابا جی کے بیڈ کے ساتھ ایک اور بیمار کا بیڈ تھا۔ یہ بزرگ نورانی چہرہ خاموش طبیعت مگر رنجیدگی کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں تھے۔ کبھی کبھار خود سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ”شمیم صاحب نہیں آئے؟“ بزرگ کے ساتھ ان کی اہلیہ تیمارداری کر رہی تھیں۔ جو اسے اٹھاتی، بٹھاتی، لٹاتی اور دوائی پلاتی رہتی۔ یہ بوڑھی اماں بااخلاق، دانش مند اور باہمت خاتون تھی۔ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے تھک جاتی لیکن احساس نہ ہونے دیتی۔ اس کی وفاداری اور تیمارداری بے مثال تھی۔ میرے دل میں اس باہمت اور عظیم المرتبت ماں کا احترام پیدا ہوا۔

ایک مرتبہ میں نے بوڑھی اماں سے پوچھا آپ کے گھر میں اور کون ہے؟ جواب دیا، صرف ایک خدا۔ میں نے دوبارہ پوچھا کیوں بچے کہاں ہیں؟ اس نے لمبی آہ بھری اور بولی ”وہ اللہ کے حوالے ہو گئے۔“ ایک تو بچپن میں ہی کنویں میں گر کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دوسرا بیٹا بہت فرماں بردار اور لائق تھا اس نے ایم اے کیا تھا۔ وہ روزانہ رات کو ہمارے پاؤں دھوتا، بازار سے سودا سلف لاتا اور ہمارے کپڑے بھی دھوتا تھا۔ باورچی خانے میں میری مدد کرتا، کھیت سے سبزی نکال کر لاتا۔ دن کو یا تو پڑھتا یا پھر گھر کے کام کاج میں مشغول رہتا۔ ایک دن رات کو ہی بیمار پڑ گیا، یہ 1990 کا سال تھا۔ سر میں درد بخار کی وجہ سے بہت لاغر ہو گیا تھا۔ صبح سویرے اعلان ہوا کہ محلے میں فوج کریک ڈاؤن کر رہی ہے سب گھروں سے باہر نکل جائیں۔ میں نے کہا ”شمیم صاحب اٹھو گھر سے نکلو۔“ اس نے جواب دیا کہ مجھ میں سکت نہیں۔ میں نے شمیم صاحب سے کہا ”صدقے جاؤں ابھی واپس آ جاؤ گے۔ ان (فوجیوں) پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ گھر سے باہر نکلا۔ چار بجے شام لوگوں کو گھر واپس آنے کی اجازت ملی۔ لیکن شمیم صاحب گھر واپس نہ آیا۔ فوجی دیگر لوگوں کے ہمراہ اسے بھی گرفتار کر کے کیمپ میں لے گئے تھے۔ میں بہت پریشان ہوئی اور ہر ایک سے پوچھنے لگی شمیم صاحب کہاں ہے؟ ہر ایک نے یہی کہا کہ اسے جلدی چھوڑ دیں گے۔ اس کے پاس تو اسلحہ وغیرہ کچھ نہیں۔ یوں دن گزرتے گئے، چوتھے روز اطلاع آئی کہ شمیم صاحب کی لاش تھانے میں ہے۔ ہماری تو دن میں رات

ہوگئی ۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ۔ سارا شہر اُمڈ آیا لوگوں نے کہا کہ اسے ”شہید مزار“ میں دفن کرتے ہیں ۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے ۔ اتنے میں ایس ایچ او صاحب میرے پاس آئے اور کہا جو آپ کہیں گی وہی کریں گے ۔ میں نے سوچا ”شہید مزار“ دور ہے ۔ اکثر دستگیرؒ صاحب کے مزار پر آتی جاتی رہتی ہوں ۔ فاتحہ خوانی کر لیا کروں گی ۔

شہید کو گھر لایا گیا ۔ چارپائی پر میت کو رکھا گیا ۔ چہرے سے کفن اٹھایا اور چہرہ دیکھا ۔ آواز دی، شمیم صاحب، اس نے آنکھ کھولی ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار لگ گئی ۔ میں نے کہا تو بھی خدا کے حوالے ہم بھی خدا کے سپرد ۔ ہماری فکر نہ کرنا ۔ پھر اسے دستگیرؒ صاحب کے ہمراہ دفن کیا گیا ۔

پہلا رمضان آیا، سحری کھا کر نماز پڑھی، شمیم صاحب یاد آ گئے ۔ وہ سحر و افطار کی تیاری خود ہی کرتا تھا ۔ کیسی سبز تازہ سبزی لاتا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ لگ گئی ۔ شمیم صاحب خواب میں آیا اور کہا:

”ممی آپ کیوں افسردہ ہیں میں ماہ صیام میں ادھر ہی آیا ہوں ۔“

دوپہر کے گیارہ بجے میری بھتیجی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اس نے بیگ میں سبزی لائی تھی ۔ گھر سے ہی صاف کر کے ۔ میں نے اس سے کہا کہ تم نے یہ زحمت کیوں کی ۔ کہنے لگی کہ شمیم صاحب خواب میں آئے اور کہنے لگے ”تم ممی کے لیے سبزی لے کر جاؤ وہ اکیلی ہے ۔“

اس بوڑھی اماں نے ایک اور واقعہ بھی سنایا کہتی ہیں کہ میرا میکہ قریب ہی ہے ۔ میں نے میاں سے کہا کہ میں والدین کے گھر چکر لگا آتی ہوں ۔ والدین کے ہاں پہنچی ۔ تقریباً ایک گھنٹہ گذر گیا کہ مجھے نیند آ گئی ۔ شمیم صاحب خواب میں آیا اور کہنے لگا:

”جلدی گھر واپس جائیں ڈیڈی اکیلے ہیں ۔“

میں گھر واپس آ گئی ۔ میرے میاں کو شمیم صاحب کا صدمہ اور دکھ اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا اور وہ بیمار پڑ گئے ۔ لیکن وہ اماں بار بار یہی کہتی ۔ اتنے میں ہسپتال کے وارڈ میں ڈاکٹر جلال صاحب آئے ان کے ساتھ دیگر جونیئر ڈاکٹر بھی تھے وہ اس بزرگ کا معائنہ کرنے لگے ۔ معائنے کے بعد بوڑھی اماں کو آہستہ سے کچھ کہا اور چلے گئے ۔ میں نے اماں سے کہا کہ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں ۔ جواب دیا، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ جلی ہوئی بتی ہے جسے ہم آہستہ آہستہ آگے چلا رہے ہیں یہ کسی بھی وقت اللہ کو پیارے ہو جائیں گے ۔ ان کی خدمت کریں ۔

اماں بولی کب وہ وقت آئے گا جب یہ بھی اللہ کے سپرد ہو جائیں گے ۔

☆☆☆☆

وحید زہیر

براہوئی ادب ترجمہ: عبدالمطلب

وہ کیا جانیں!

اے مرے مہرباں
ہجر اپنا مقدر سہی
لیکن......!
دور ہو کر تو میرے اور قریب آ گئی ہے
جیسے
پھول سے خوشبو
چاند سے چاندنی
گل لالہ سے اس کی رنگت
تیری میری سنگت!!
تو
میرے نشے کا خمار ہو
جرگے کے فیصلے میں بخشی گئی
خیموں کی قوس قزح ہو
میں تیرا محافظ
اے مرے مہرباں!
ہم دلوں، موسموں اور زمانوں سے
بالاتر
محبت کے لامتناہی سلسلے کی کڑی ہیں
زندگی مختصر سہی
ہاں......ہم کچھ نہیں بدل سکتے
ہاں......ہم مر سکتے ہیں......!
لیکن یہ تاریخ کی جنگ ہے
اے مرے مہرباں
وہ کیا جانیں محبت کیا ہے
محبت کی چاہ کیا ہے!
لطف کیا ہے!!
وہ کیا جانیں
محبت مسئلہ نہیں
محبت حل ہے!

☆☆☆☆

منیر مومن

بلوچی سے ترجمہ: رضوان فاخر

نظم

اس پنجرے میں بند جنگل میں
خاموشی کی یہ گٹھڑی
جو اس نے اپنی چونچ سے تھامی ہوئی ہے
اس میں تمھارا بھی حصہ ہے
وہی انگوٹھی
جو تمھیں اک دن راستے میں پڑی ملی
اس میں اُس انتظار کی آنکھیں جاگتی ہیں
جو ایک رات چاند نے مجھ سے طلب کیا تھا
مجھے اندھیرے نے اپنی پناہ میں لے لیا
پھر تمھاری خواہش مجھے ڈھونڈتے ہوئے
میرے قریب سے گزر گئی
اور کل تک اسی خواہش کی چھاپ
میری روح میں جاگتی تھی
تو اسے میں نے ایک پنجرہ بنا دیا
اور پنجرے نے ایک جنگل تخلیق کیا
پھر جب جنگل نے بات کرنا چاہی
تب تک میں خاموشیوں کی گٹھڑی بن چکا تھا

اسد ملک

پنجابی سے ترجمہ: **محمد مشتاق آثم**

الماری میں

الماری میں
کپڑے، کھونٹیاں، کوٹ، ضروری کاغذ
اور
کتابیں، پیسہ دھیلا، بابوں کی تصویریں،
جوتے، چیری بلاسم، گندے انڈرویئر
ننگی جنسی شاعری کے
اک دو مجموعے
ہوتے ہیں

نچلے خانے کی پچھلی نکڑ میں
اک دو پھٹے پرانے
خوابوں کے ہمراہ
میں خود پایا جاتا ہوں

☆☆☆☆

اسد اشلوک

سرائیکی سے ترجمہ **محمد عتیق احمد**

سفید کوا

جب کوئی میرا خیال نہیں رکھتا
تو میں بھی
کسی کو خاطر میں نہیں لاتا
مجھے کسی کی ضرورت ہے بھی نہیں
کیوں کہ میں ایک سفید کوا ہوں
جب میں کسی کے کام نہیں آ سکتا
تو کسی سے کوئی امید کیوں رکھوں

☆☆☆☆

شیخ ایاز

سندھی سے ترجمہ: **انور ندیم علوی**

کیوں دل کو چھوٹا کرتا ہے، دن رات بدل بھی جائیں گے
مت چھوڑ میاں اس تیشے کو، ہم جوئے شیر بہائیں گے

سُن! بات مری، مت دیکھ اُدھر، اب کشتی اور نہ آئے گی
آنا ہے تو آ اے بنجارے، ہم منزل پر پہنچائیں گے

دریا میں عجب اک دہشت ہے، کس وقت قیامت آ جائے
تُو میں تو فقط اس سندھو میں، کوئی لہر اٹھا کر جائیں گے

یہ جگمگ جگمگ جگنو کی یہ ٹم ٹم ٹم ٹم تارے کی
گھنگھور گھٹا کے گھیروں سے ہم لوگ نہ یوں گھبرائیں گے

یہ موت حقیقت برحق ہے، ہر ایک نے آخر مرنا ہے
ہم آگ اُجالا کر کے ہی کچھ روشنیاں پھیلائیں گے

یہ قید و بند اور تعزیریں، گِر جائیں گی اُونچی دیواریں
ہم توڑ کے سب زنجیروں کو، ہر زنداں کوٹ گرائیں گے

تُو کر لے جو بھی کرنا ہے، یہ دور ایآز گزرنا ہے
چھٹ جائیں گے بادل غم کے بھی بن باس بھی کاٹ ہی جائیں گے

☆☆☆☆

ہندکو تخلیق و ترجمہ: امتیاز الحق امتیاز

وارننگ

لکھنے والا
کسی سے
کوئی ایسی بات بھی
لکھ سکتا ہے
جس سے دنیا
اوپر نیچے ہو سکتی ہے

☆☆☆☆

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad

January to March 2019

ISSN: 2077-0642

سہ ماہی ادبیات کے چند خصوصی شمارے

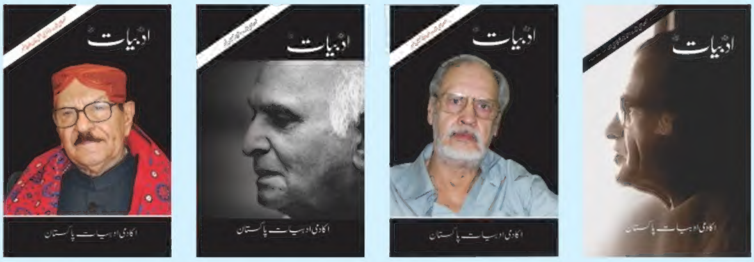

اکادمی ادبیات کے دارالترجمہ کی مطبوعات

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: ar.saleemipal@gmail.com